روحِ انیس

یعنی

فردوسیِ ہند میر انیسؔ کے بہترین مرثیوں، سلاموں اور رباعیوں کا مجموعہ

جو

متعدد قلمی نسخوں کے باہمی مقابلے کے بعد مقدموں اور حاشیوں کے ساتھ

مرتّب کیا گیا

مُرتّبہٗ

سیّد مسعود حسن رضوی ادیبؔ

کتاب نگر۔ دین دیال روڈ۔ لکھنؤ

طبع اول	انڈین پریس، الہ آباد	۱۹۳۱ء
طبع دوم	کتاب نگر، لکھنؤ	۱۹۵۷ء
طبع سوم	کتاب نگر، لکھنؤ	۱۹۶۴ء
طبع چہارم	کتاب نگر، لکھنؤ	۱۹۶۵ء
طبع پنجم	کتاب نگر، لکھنؤ	[illegible]

قیمت ——

مطبوعہ ... نظامی پریس ... لکھنؤ
... سید علی احمد زیدی

ناشر

کتاب نگر دین دیال روڈ لکھنؤ

فہرست مضامین

رباعیاں

دیباچۂ طبع پنجم

میر انیس کے منتخب کلام کا یہ مجموعہ چار مرتبہ شائع ہو کر قبول عام کی سند پا چکا ہے۔ اب اس کا یہ پانچواں ایڈیشن حسب معمول انیس فہمی کے تمام لوازم کے ساتھ نذر ناظرین کیا جا رہا ہے۔

یہ مجموعہ مرتب کرنے کی غرض سے انیس کے دفتر دفتر کلام کا گہری نظر سے کئی بار مطالعہ کیا گیا ہے اور اس کو کلام انیس کی روح کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ لیکن یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ان جواہرات کے نکل جانے سے انیس کا خزانہ خالی ہو گیا۔ ان کے بلند پایہ کلام کے ایسے ہی دو تین مجموعے اور مرتب کیے جا سکتے ہیں۔

انتخاب کلام کی مشکل منزل طے کرنے کے بعد اس سے زیادہ دشوار گزار منزل یہ تھی کہ مرثیوں کے قدیم اور مستند نسخے فراہم کر کے ان کے باہمی مقابلے سے کلام کی تصحیح کی جائے۔ اس سلسلے میں کس کس کی ناز برداری کرنا پڑی، کن کن دروازوں پر بار بار حاضری دینا پڑی اور کتنی کتنی مرتبہ ایک مرثیے کا دوسرے نسخوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ ان زحمتوں کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس نے خود کبھی اس کام میں ہاتھ ڈالا ہو۔ مگر اس تمام دوادوش، تلاش و تجسس، دماغ سوزی اور دیدہ ریزی کے بعد بھی وہ نتیجہ نہ نکلا جو مرتب کا مقصود تھا۔ مرثیوں کے ایسے نسخے دستیاب نہ ہوئے اور نہ شاید کسی کو دستیاب ہو سکتے ہیں جن کے متعلق یہ یقین کیا جا سکے کہ ان کا حرف حرف صحیح ہے اور وہ ان مرثیوں کی آخری صورتیں ہیں، جن کے بعد مصنف نے کوئی ترمیم یا اضافہ نہیں کیا۔ ایسی حالت میں تصحیح کی صرف یہی تدبیر ممکن تھی کہ جہاں مختلف نسخوں میں کوئی اختلاف نظر آئے وہاں جو صورت سب سے بہتر ہو وہ اختیار کر لی جائے۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ جس صورت کو مرتب کا ذوق

سب سے بہتر قرار دے، وہ حقیقت میں بھی ایسی ہو اور نہ یہ ضروری ہے کہ جو صورت سب سے بہتر ہو وہی انیس نے اختیار کی ہو، لیکن تصحیح کا کوئی دوسرا طریقہ ممکن ہی نہ تھا۔ انتخاب اور تصحیح کے بعد ترتیب کا مرحلہ تھا جو خوبی کے ساتھ طے ہو گیا۔ مرثیوں کی جو ترتیب قرار دی گئی ہے اس سے ایک طرف ان واقعات کی مسلمہ ترتیب سے مطابقت ہوتی ہے جو ان مرثیوں کے موضوع ہیں، دوسری طرف ایک کے بعد دوسرے مرثیے میں کلام کا زور بڑھتا اور شاعر کا کمال ابھرتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح پڑھنے والوں کی دلچسپی شروع سے آخر تک صرف قائم ہی نہ رہے گی بلکہ بڑھتی جائے گی۔

انیس کے کلام کو بخوبی سمجھنے کے لیے کربلا کے خونیں واقعے کے تفصیلات، اشخاص مرثیہ کے حالات، شاعر کے معتقدات و مسلمات، جو لوگ اس کے براہ راست مخاطب تھے ان کے خیالات و جذبات، اور مرثیے کے لوازم و خصوصیات سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اس غرض سے چند مقدمے کتاب میں شامل کیے جا رہے ہیں۔ یہ مختصر مقدمے تمام ضروری معلومات تو بہم نہیں پہنچا سکتے لیکن ان کا بغور مطالعہ کرنے سے وہ ذہنی پس منظر کسی حد تک ضرور پیدا ہو سکتا ہے جس کے بغیر مرثیے کی شاعری سے پورا لطف اٹھانا ممکن نہیں۔ مقدموں میں پہلے واقعۂ کربلا کا مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے کہ وہی مرثیوں کا اصل موضوع ہے۔ اس کے بعد مرثیے کی تعریف اور اس کے اجزائے ترکیبی بتائے گئے ہیں۔ پھر ان لوگوں کے ضروری حالات نہایت اختصار کے ساتھ لکھے گئے ہیں جن کا ذکر مرثیوں میں اکثر آتا ہے۔ اس کے بعد میر انیس کے حالات زندگی مختصراً بیان کر کے ان کی شاعری پر اجمالی تبصرہ کیا گیا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ فارسی اور عربی ادب کی تحصیل کے بغیر کسی کا پڑھے لکھوں میں شمار نہیں ہو سکتا تھا۔ اب مدت سے ہمارا تعلیمی نظام ایسا ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی اکثریت ان زبانوں سے بالکل نابلد ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے کلاسیکی ادب میں جو چیزیں پہلے ہر شخص آسانی سے سمجھ لیتا تھا آج بہتوں کے لیے ان کا سمجھنا

مشکل ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو راقم نے دیکھی یا سنی ہیں یا
اگلے وقتوں کے لوگوں سے معلوم کی ہیں، لیکن نئی نسل ان سے ناواقف ہے۔ اس صورت کو
مدِ نظر رکھ کر جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوئی وہاں لفظوں اور محاوروں کے معنی اور فقروں
اور جملوں کے مطلب ذیلی حاشیوں میں لکھ دیئے گئے ہیں۔ کہیں کہیں کلام کی کسی خاص
خوبی یا کسی صنعت کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کثیر التعداد حاشیے
انھیں کے لیے ہیں جن کو ان کی ضرورت ہے۔ وہ ذی علم حضرات جو ان حاشیوں سے
بے نیاز ہیں وہ ان کو نظر انداز کر کے صرف کتاب کا متن ملاحظہ فرمائیں اور ایک عظیم
شاعر کے بلند پایہ کلام سے اخلاقی نعمتیں اور روحانی مسرتیں حاصل کریں۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب
ادبستان۔ دین دیال روڈ۔ لکھنؤ
۲۱ را کتوبر ۱۹۷۱ء

مقدمہ



واقعۂ کربلا اور اس کے اسباب و نتائج

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را　　گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

عرب میں قریش کا قبیلہ نسبی شرافت کے اعتبار سے نہایت ممتاز تھا۔ کعبہ جو اسلام سے مدتوں پہلے بھی عرب کا سب سے بڑا عبادت خانہ اور مذہبیت اور تقدس کا سب سے بڑا مرکز تھا اس کی مجاوری کا فخر بھی اسی قبیلے کو حاصل تھا۔ اپنی مخصوص فضیلتوں کی بدولت یہ قبیلہ ایک مدت تک عزت کی قلمرو پر فرماں روائی کرتا رہا۔ آخر زمانے کی نظر لگ گئی اور حسد نے پھوٹ کا بیج بو دیا۔ جب حضرت ہاشم کعبے کے مجاور ہوئے اور ان کی خدمتوں نے ان کو تمام عرب کا مخدوم بنا دیا تو ان کا عروج و وقار ان کے بھتیجے امیہ کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا۔ اہل حسد کی اس زمانے میں بھی کمی نہ تھی۔ امیہ نے انھیں کی مدد سے کوشش کی کہ عزت و سرداری کا تاج حضرت ہاشم کے سر سے اتار لے۔ مگر ناکامیوں نے مخالفت کے شعلوں کو ٹھنڈا کر دیا۔ تاہم دلوں میں یہ آگ سلگتی رہی۔

ہاشم کے بعد ان کے بیٹے عبدالمطلب اور پوتے ابوطالب خانۂ کعبہ کے مجاور ہوئے۔ ہاشم کے عادات و اطوار ان کو ورثے میں ملے تھے۔ انھوں نے بھی اس خدمت سے عظمت حاصل کی۔ امیہ اور اس کے بیٹے حرب نے ان دونوں کو بھی عزت کی مسند سے اتارنا چاہا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ البتہ حسد اور عداوت کی جڑیں اور مضبوط ہو گئیں۔

جب ہاشم کے پوتے حضرت محمدؐ نے اپنی پیغمبری کا اعلان کر کے بت پرستی کی مخالفت اور وحدانیت کی تلقین شروع کی تو بنی امیہ کو بڑا اندیشہ ہوا کہ اگر کہیں لوگوں نے حضرت

محمدؐ کو خدا کا رسول اور ان کے دین کو مذہب حق تسلیم کر لیا تو بنی ہاشم کے مذہبی اقتدار کے سامنے بنی امیہ کا چراغ ہی گل ہو جائے گا۔ امیہ کے پوتے ابو سفیان نے محمدی تعلیم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ عرب کے متعصب بت پرست اس علم کے نیچے جمع ہو گئے اور حضرت محمدؐ کو ستانے اور تبلیغ اسلام میں رکاوٹیں ڈالنے لگے۔ یہاں تک کہ آپ مجبور ہو کر اپنے وطن مکّے سے ہجرت کر کے مدینے میں جا بسے۔

دشمنوں نے مدینے میں بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ آخر کار تنگ آ کر جنگ کے لیے تیار ہونا پڑا۔ کئی بار لڑائیاں ہوئیں جن میں شکست ہمیشہ ابو سفیان ہی کو ہوتی۔ حضرت محمدؐ کے پیرؤوں کی تعداد اور ان کی طاقت برابر بڑھ رہی تھی۔ آخر مکّے میں ایک ایسی فیصلہ کن جنگ ہوئی جس نے بنی امیہ کی طاقت بالکل توڑ دی۔ اب اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے انھوں نے بھی قبول اسلام کی نقاب ڈال لی۔ لیکن بنی ہاشم کی در پردہ مخالفت سے باز نہ آئے۔

اس شکست کے بعد ایک مدت تک بنی امیہ سر نہ اٹھا سکے۔ حضرت محمدؐ کے دوسرے خلیفہ حضرت عمرؓ نے اپنی حکومت کے زمانے میں ابو سفیان کے بڑے بیٹے یزید کو اور یزید کی وفات کے بعد اس کے بھائی معاویہ کو امیر شام مقرر کیا۔ امیر معاویہ کی تدبیروں سے بنی امیہ کا زوال عروج سے بدلنے لگا اور رفتہ رفتہ دولت اور حکومت پھر ان کے قبضے میں آ گئی۔ رسول عربی کے تیسرے خلیفہ حضرت عثمان خود بنی امیہ میں سے تھے۔ ان کے عہد حکومت میں بنی امیہ کو خوب عروج ہوا۔

جب علی ابن ابی طالب رسولؐ کے چوتھے خلیفہ ہوئے تو ہوا کا رخ بدل گیا۔ آپ شاہانہ اقتدار کے باوجود فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ضرورت کے وقت یہودیوں کے باغوں میں پانی دے کر اپنی روزی پیدا کرتے تھے۔ مگر قومی خزانے میں ہاتھ نہ لگاتے تھے۔ اب یہ کہاں ممکن تھا کہ کوئی فرد یا کوئی جماعت بیت المال سے بے استحقاق متمتع ہو سکے۔ چنانچہ سردارانِ عرب کو جو وظیفے بیکار مل رہے تھے وہ سب آپ نے بند کر دیے۔

حضرت علیؑ حضرت ہاشم کے پرپوتے اور پیغمبر عرب حضرت محمدؐ کے چچازاد بھائی تھے۔

اولادِ ہاشم کی حکومت یوں ہی بنی امیہ کے لیے قابلِ برداشت نہ تھی، اس پر حضرت علیؓ کی سخت گیری نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفت کی چنگاریاں دہکتے دہکتے جنگ کی آگ بھڑک اٹھی اور بنی امیہ نے حاکمِ شام امیر معاویہ کی سرکردگی میں حضرت علیؓ سے کئی لڑائیاں لڑیں۔ حضرت علیؓ اسلام کے سب سے بڑے سپاہی اور فنونِ جنگ کے سب سے بڑے ماہر تھے۔ میدان ہمیشہ انھیں کے ہاتھ رہا۔ جب تیر و شمشیر سے مقصد حاصل نہ ہوا تو عیاری اور مکاری کے حربے استعمال ہونے لگے۔ آخر کار رمضان سنہ ۴۰ھ میں حضرت علیؓ مسجدِ کوفہ میں نمازِ صبح کے وقت اپنے معبود کے سجدے میں شہید کر دیے گئے۔

حضرت علیؓ کی شہادت سے بنی امیہ کا راستہ کسی قدر صاف ہو گیا۔ لیکن بنی ہاشم تقدس، روحانیت، علم اور اخلاق میں بنی امیہ سے کہیں افضل تھے اور رسولؐ کی قرابت کا شرف صرف انھیں کو حاصل تھا۔ اس لیے روحانی سیادت کا بنی ہاشم سے بنی امیہ میں منتقل ہو جانا اب بھی مشکل تھا۔ چنانچہ حضرت علیؓ کے بعد ان کے بڑے بیٹے حضرت حسنؓ خلیفۂ رسول تسلیم کر لیے گئے۔

امیر معاویہ کا آبائی اور ذاتی تجربہ بتا چکا تھا کہ بنی ہاشم کے مقابلے میں تلوار اٹھانا بے سود ہے۔ اس لیے انھوں نے امام حسنؓ کے پاس صلح کا پیغام بھیجا۔ یہ پیغام کچھ ایسا تھا کہ اگر آپ منظور نہ کرتے تو حبِ جاہ کی تہمت اور خونریزی کے الزام سے بچنا مشکل تھا۔ شرائطِ صلح بھی بڑے نہ تھے۔ بہرحال مصلحتِ وقت سمجھ کر امام حسنؓ نے صلح کر لی۔ امیر معاویہ نے اس صلح کے ذریعے سے امام حسنؓ کو حکومتِ ظاہری سے بے دخل کر کے شرائطِ صلح کی صریح خلاف ورزی شروع کر دی۔ آخر صفر سنہ ۴۹ھ یا سنہ ۵۰ھ میں امام حسنؓ بھی زہر سے شہید کر دیے گئے۔

اب امیر معاویہ نے صلح نامے کے خلاف اپنے بد اطوار بیٹے یزید کو اپنا ولی عہد اور مسلمانوں کا دینی پیشوا قرار دے کر اس کے لیے بیعت لینا شروع کر دیا۔ امام حسنؓ کے چھوٹے بھائی حسینؓ سے بھی بیعت کی خواہش کی گئی۔ مگر تقدس اور معصومیت کا سر فسق و فجور کے سامنے کیونکر جھکتا۔ امام حسینؓ معاملہ فہمی، پیش بینی اور ایثارِ نفس میں فردِ فرید تھے۔ وہ ماضی اور حال کے آئینے میں مستقبل

کی صورت دیکھ رہے تھے۔ ان کو یقین ہو گیا کہ اب تحفظ اسلام کا صرف ایک ہی ذریعہ رہ گیا ہے یعنی اپنی جان اور جان سے زیادہ عزیز ہستیوں کی قربانی۔ وہ اس قربانی کے لیے تیار ہو گئے اور وقت کے منتظر رہنے لگے۔ امام حسنؑ کی زندگی ہی میں کہا کرتے تھے کہ میں عنقریب حق کی حمایت میں قتل کیا جاؤں گا، مگر باطل کا ساتھ نہ دوں گا۔ اس قول میں قربانی پر آمادگی کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

امیر معاویہ کے انتقال کے بعد ان کا بیٹا یزید تخت پر بیٹھا۔ وہ اپنی زندگی ہی میں بہت سے لوگوں سے یزید کی بیعت لے چکے تھے۔ اسی برتے پر اس کو دنیوی حکومت کے ساتھ روحانی سیادت کا بھی دعویٰ تھا۔ مگر بے دینی میں اس کی جسارت اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ مذہبی پیشوائی کی مسند پر بیٹھ کر اپنی بدکرداریوں پر نمائشی دینداری کا پردہ بھی نہ ڈالا۔ احکام اسلام کی صریح خلاف ورزی کرنے لگا اور شراب و کباب، غنا و زنا میں علانیہ مشغول رہنے لگا۔

اہل کوفہ نے معاویہ کی زندگی ہی میں امام حسینؑ کو اپنی ہدایت کے لیے بلانا شروع کر دیا تھا۔ یزید کے زمانے میں تو ان کے خطوں کے انبار لگ گئے۔ یزید جانتا تھا کہ لوگوں کے دل امام حسین کی طرف کھنچ رہے ہیں۔ اس نے اپنے جلوس کے پہلے ہی سال حاکم مدینہ کے نام فرمان بھیجا کہ جس طرح ممکن ہو امام حسینؑ سے بیعت لی جائے۔ اور اگر وہ بیعت پر آمادہ نہ ہوں تو ان کو قتل کر دیا جائے۔ یزید کا یہ فرمان امام حسین کو سنایا گیا۔ اب اپنی جان و آبرو کو خطرے میں دیکھ کر امام حسین مدینے سے مکے چلے گئے۔ کوفے والوں کے خطوط کا سلسلہ یہاں بھی جاری رہا۔ ان کے شدید اور پیہم اصرار پر آخر آپ نے کوفے کے سفر کا تہیہ کر لیا۔ مگر گزشتہ تلخ تجربوں کی وجہ سے کوفیوں پر اعتماد کرنا مشکل تھا۔ اس لیے آپ نے اپنے چچا زاد بھائی مسلم کو بھیجا کہ ان کے دل ٹٹولیں اور حقیقت حال سے اطلاع دیں۔

ابھی کوئی اطلاع نہ ملی تھی کہ مکے میں اپنے قتل کا سامان دیکھ کر امام حسین کوفے کی طرف روانہ ہو گئے۔ حج کا زمانہ قریب تھا۔ تمام عالم اسلامی مکے کی طرف کھنچا چلا آ رہا تھا۔ امام حسینؑ

بھی حج کرنے کے لیے ہر سال مدینے سے مکے پاپیادہ آیا کرتے تھے۔ اس لیے جو لوگ راستے میں ملتے تھے وہ حیرت سے پوچھتے تھے کہ حج کے زمانے میں آپ مکے سے کہاں اور کیوں تشریف لیے جاتے ہیں۔ آپ جواب میں بالعموم فرما دیا کرتے تھے کہ میں خدا کی راہ میں قتل ہونے جا رہا ہوں۔ وہی قربانی پر آمادگی اس جواب سے بھی ظاہر ہو رہی ہے۔

حضرت مسلم کوفے پہنچ گئے۔ کوفیوں نے ان کی بڑی عزت کی۔ لوگ جوق جوق آنے لگے اور ان کے ہاتھ پر امام حسین سے بیعت کرنے لگے۔ یزید کو جب یہ خبر پہنچی تو اس نے ایک قسی القلب دشمنِ آلِ رسول عبید اللہ ابن زیاد کو گورنر مقرر کر کے کوفے بھیجا۔ اس نے وہاں پہنچتے ہی حضرت مسلم کو انتہائی بے رحمی کے ساتھ قتل کروا دیا اور ان کے میزبان ہانی کو سولی پر چڑھا دیا۔ کوفیوں کی وفاداری میں اتنی استواری کہاں تھی کہ ان سختیوں کی تاب لا سکتے آخر امام حسین سے پھر گئے۔ اہل کوفہ پر اپنی ہیبت بٹھانے کے بعد ابن زیاد نے شہر کے ناکے بند کروا دیے اور ہزار سواروں کا ایک دستہ حُر کی ماتحتی میں امام حسین کی تلاش میں بھیجا۔

راستے میں امام حسین کو حضرت مسلم کی شہادت کی خبر ملی مگر آپ نے اپنا سفر جاری رکھا۔ کئی منزلیں طے کرنے کے بعد حُر کا رسالہ سدِّ راہ ہوا۔ کچھ گفتگو کے بعد یہ طے ہوا کہ امام حسین کسی غیر معروف راستے سے سفر کریں۔ گرمی قیامت کا نمونہ دکھا رہی تھی۔ حر کا رسالہ پیاس سے جاں بلب تھا اور اس بیابان میں کوسوں پانی کا پتا نہ تھا۔ امام حسین کے ساتھ ان کے اہل و عیال اعزہ اور احباب کی ایک جماعت تھی جس میں چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ مگر انسانی ہمدردی سے بے چین ہو کر آپ نے اپنے ساتھ کا پانی دشمن کی فوج کو پلا دیا۔

اب حسینی قافلہ حُر کی تجویز کے مطابق ایک غیر معروف راستے سے روانہ ہوا۔ حُر کا رسالہ بھی ساتھ ہو لیا۔ تین چار دن کے بعد محرم کی دوسری تاریخ کو یہ قافلہ کربلا کے میدان میں پہنچ گیا اور دریائے فرات کے قریب ٹھہر گیا۔ دوسرے دن ابن زیاد کا بھیجا ہوا ایک

لشکر عمر ابن سعد کی سرکردگی میں کربلا پہنچا۔ اس کے بعد یزیدی فوجوں کی آمد کا سلسلہ بندھ گیا۔ تمام راستے بند کر دیے گئے۔ اور امام حسین کو ان فوجوں میں گھیر کر یزید کی بیعت پر اصرار کیا جانے لگا۔ ساتویں محرم کو ابن زیاد کی سرکردگی میں دریائے فرات پر کئی ہزار سپاہیوں کا پہرہ بٹھا دیا گیا اور امام حسین پر پانی بھی بند کر دیا گیا۔ وہ سرچشمہ ہمدردی جس نے ابھی چند روز ہوئے اپنے دشمنوں کی پوری فوج کو سیراب کیا تھا اب اس کے ننھے ننھے بچے ایک ایک قطرہ پانی کو ترس رہے ہیں۔ مگر طاقت کی تمام نمائشیں اور ایذا رسانی کی تمام صورتیں امام حسین کو مجبور نہ کر سکیں کہ ایک فاسق و فاجر بادشاہ کو اپنا دینی پیشوا تسلیم کر لیں۔ آٹھویں محرم کو عمر ابن سعد نے امام حسین سے ایک مرتبہ پھر کہا کہ اب بھی وقت ہے یزید کی بیعت کر لیجیے اور ان تمام مصیبتوں سے نجات پا جائیے۔

امام حسین کے استقلال میں اب بھی فرق نہ آیا۔ آپ نے بیعت سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ مجھ کو واپس جانے دو کہ میں مکے یا مدینے میں گوشہ نشین ہو جاؤں۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو اجازت دو کہ میں یزید کی سلطنت سے نکل کر ہندوستان یا کسی اور ملک میں جا رہوں۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو مجھ کو یزید کے پاس لے چلو کہ میں خود اس سے گفتگو کروں۔ عمر سعد نے یہ تینوں باتیں ابن زیاد کو لکھ بھیجیں مگر اس نے کوئی بات منظور نہ کی اور شمر کو ایک بڑی فوج کے ساتھ بھیجا کہ امام حسین سے یزید کی بیعت لے یا ان کا سر لائے۔

ابن زیاد کا یہ حکم امام حسین کو نویں محرم کی شام کو سنایا گیا۔ امام نے اس پر غور کرنے کے لیے ایک شب کی مہلت لی۔ نماز مغرب کے بعد آپ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ میں طے کر چکا ہوں کہ یزید کی بیعت کر کے اسلام کی تباہی میں شریک نہ ہوں گا۔ اب میرا ساتھ دینے میں تمھاری جانوں کا خطرہ ہے۔ اس لیے میں بخوشی اجازت دیتا ہوں کہ رات کے پردے میں جہاں چاہو چلے جاؤ۔

مروت اور رفاقت کی حد ختم ہو چکی۔ اب جانثاری اور سرفروشی کی منزل تھی۔

چند رفیق رخصت ہو گئے۔ اب صرف وہ لوگ باقی رہ گئے جو حسین کی عظیم الشان قربانی میں شریک ہونے کے اہل تھے۔ ان سر فروش مجاہدوں کی تعداد بہتر سے ایک سو دس تک بتائی جاتی ہو، جن میں چند ضعیف بڈھے، کچھ نو عمر لڑکے اور چند معصوم بچے بھی شامل تھے ان کے علاوہ کچھ عورتیں بھی امام حسین کے ساتھ تھیں۔ اس منتخب جماعت میں ایک فرد بھی ایسی نہ تھی جس نے اپنے کارناموں سے حسینی قربانی کی عظمت اور اثر میں اضافہ نہ کیا ہو۔

جب مہلت کی شب گزر گئی اور امام حسین اپنے فیصلے پر قائم رہے، تو یزیدی لشکر جس کی تعداد کم سے کم بیس ہزار بتائی جاتی ہے میدان کربلا میں صف آرا ہو گیا کہ ایک صبر و استقلال کے پہاڑ کو ظلم و جبر کی آندھیوں سے متزلزل کر دے۔ طبل جنگ بجنے لگے۔ امام حسین کا سر لینے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اتنے بڑے لشکر کا سامنا ہو، بھوک پیاس کی شدت سے کسی کے دم میں دم نہیں، بچے پیاس پیاس کہہ کر تڑپ رہے ہیں، اپنی اور عزیز ترین ہستیوں کی موت، گھر کی تباہی، ناموس کی اسیری کے منظر آنکھوں کے سامنے ہیں، مگر امام حسین کی فرض شناسی اصول پروری، ایثار اور جرأت کا کیا کہنا کہ آپ کی جبین استقلال پر اب بھی شکن نہیں۔

جب یزید کا فرمانی لشکر اپنی صفیں جما چکا تو امام حسین آگے بڑھے اور اپنی خاندانی خوش بیانی کے ساتھ ایک تقریر شروع کی۔ خدا کی حمد اور رسول کی نعت کے بعد اپنی نسبی شرافت اور اسلام کی نازک حالت بیان کی اور کوفیوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ تمھیں نے مجھ کو سیکڑوں خط بھیج کر اپنی ہدایت کے لیے بلایا اور تمھیں اب میرے قتل پر آمادہ کھڑے ہو۔ کیا مہمان نوازی کا یہی طریقہ ہے اور ہدایت کرنے والوں کے ساتھ یہی سلوک مناسب ہے؟ کوفیوں میں اتنی اخلاقی جرأت کہاں تھی کہ جان و مال کے خوف پر غالب آ سکتی۔ پھر بھی شرم سے سر جھک گئے۔

یزید کے اتنے بڑے لشکر میں صرف ایک شخص ایسا نکلا جس نے حق پر مرنا ناحق پر جینے سے بہتر سمجھا۔ وہ کون ؟ حر۔ وہی حر جس کو چند روز پہلے امام حسین نے پیاس کی شدت میں سیراب کر کے گویا دوسری زندگی بخشی تھی وہ اپنے چند ساتھیوں کو لے کر امام حسین کی طرف آ گیا۔

امام حسین کی تقریر ختم ہوئی۔ جواب میں یزیدی لشکر سے تیر برسنے لگے۔ امام حسین نے خود جنگ کا تہیہ کیا مگر جان نثار آپ کو تلواروں کی آنچ میں کیوں کر دیکھ سکتے تھے۔ عرب کے قدیم دستور کے مطابق ایک ایک شخص بڑھنے اور اپنے پیشوا کے نام پر جان نثار کرنے لگا۔ انصار کے بعد اعزہ رخصت ہونے لگے۔ یہ دس برس کے دو بھانجے عون و محمد، تیرہ چودہ برس کا بھتیجا قاسم، اٹھارہ برس کا بیٹا علی اکبر، بتیس برس کا بھائی عباس اور چند اور قریبی عزیز ایک ایک کر کے گئے اور حیرت انگیز شجاعت کے بے نظیر کارنامے پیش کر کر کے شہید ہو گئے۔ اب امام حسین بالکل تنہا رہ گئے۔ ایک بیٹا سید سجاد زندہ تو تھا، مگر بیماری اور نقاہت سے زندہ درگور تھا، اس مصیبت میں باپ کی نصرت کیونکر کرتا۔

امام حسین پر مصائب کا جو ہجوم تھا اب اس میں عزیز ترین دوستوں اور قریب ترین عزیزوں کے داغوں کا اور اضافہ ہو گیا تھا۔ پھر اپنی طرف کے شہیدوں کی لاشیں اٹھاتے اٹھاتے اور خیمہ گاہ تک لاتے لاتے نہ معلوم کیا حال ہوا ہوگا۔ دشمنوں کے لشکر میں گھس کر کسی کی لاش اٹھا لانا آسان کام نہ تھا۔ حضرت جتنی لاشیں میدان جنگ سے لائے ہوں گے اتنی لڑائیاں لڑنا پڑی ہوں گی۔ مختصر یہ کہ اس وقت امام حسین کی جو حالت ہوگی اس کا بیان کیا تصور بھی دشوار ہے۔ مگر نہ معلوم آپ کے پاش پاش قلب میں کتنا استقلال اور چور چور بدن میں کتنی قوت تھی کہ اس بے کسی اور بے بسی کے عالم میں جب یزیدی فوج سے مبارز طلبی کی آواز بلند ہوئی تو آپ باقاعدہ جنگ کرنے کے لیے تیار ہو گئے اور ان بی بیوں سے رخصت ہونے کے لیے خیمے میں تشریف لے گئے، جن کے گود کے پالے، گھر کے اجالے، آنکھوں کے تارے، زندگی کے سہارے، آپ پر نثار ہو چکے تھے۔ کس کے قلم میں طاقت ہو کہ اس دردناک منظر کی تصویر کھینچ سکے۔

سب سے رخصت ہو کر امام حسین میدان جنگ میں آئے اور اس عالم ضعف و یاس میں بہادری کے وہ جوہر دکھائے جن کی نظیر سے تاریخ عالم کے ورق خالی ہیں۔ یکا یک خیمے سے رونے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ امام حسین واپس آئے اور دیکھا کہ آپ کا ششماہہ بچہ علی اصغر پیاس

کی شدت سے دم توڑ رہا ہو۔ حضرت کو اپنی بے گناہی اور یزیدیوں کی شقاوت کے اظہار کا ایک بہت اچھا موقع مل گیا۔ آپ نے بچے کو اپنے ہاتھوں پر لیا اور ایک بلند مقام پر کھڑے ہو کر اسکی دردناک حالت دشمنوں کو دکھائی اور فرمایا کہ یہ معصوم پیاس سے جاں بلب ہو۔ اس کی ماں کا دودھ بھی خشک ہو گیا ہے اگر ایک قطرہ پانی اس کے حلق میں ٹپکا دو تو اس کی جان بچ جائے۔ یہ ایسا پر اثر منظر تھا کہ وہ پتھر دل جو عون و محمد کی کم سنی، اکبر کی نوجوانی امام حسین کی ضعیفی سے مطلق متاثر نہ ہوئے تھے وہ بھی آخر پسیج گئے۔ بعض لوگوں نے پانی دینے کا ارادہ کیا، مگر عمر ابن سعد نے اپنے لشکر کے ایک مشّاق تیرانداز حرملہ کو حکم دیا کہ حسینؑ کی بات کاٹ دے۔ حرملہ نے ایک سہ پہلو تیر تاک کر مارا جو بچے کی گردن اور باپ کا بازو کاٹ کر نکل گیا اور بچہ باپ کے ہاتھوں پر تڑپ تڑپ کر ختم ہو گیا۔

اپنے دل کے ٹکڑے کو زمین کی گود میں سلا کے امام حسین پھر میدان میں آئے اور ایسی جنگ کی کہ ہر طرف سے "الامان" "الامان" کی صدائیں آنے لگیں۔ آپ نے تلوار روک لی۔ تلوار کا رکنا تھا کہ دشمنوں نے گھیر لیا۔ تیروں، تلواروں اور نیزوں کا مینھ برسنے لگا۔ آخر سیکڑوں زخم کھا کر آپ گھوڑے سے گرے اور شمر نے اپنے خنجر سے حضرت کا سر کاٹ لیا۔ فتح کے باجے بجنے لگے، شہیدوں کی لاشیں گھوڑوں سے پامال کی گئیں، مال و اسباب لوٹا گیا، عورتوں کے سروں سے چادریں تک اتار لی گئیں، خیموں میں آگ لگا دی گئی، سید سجاد کو طوق و زنجیر پہنائی گئی، اور عرب کے شریف ترین خاندان کی عزت مند بیبیاں رسیّوں میں باندھ کر قیدی بنا دی گئیں۔

یزیدیوں نے اپنی طرف کے مردوں کو دفن کیا اور امام حسین اور ان کے رفیقوں کی لاشوں کو بے گور و کفن چھوڑ کر کوچ کر دیا۔ شہیدوں کے سروں کو نیزوں پر چڑھا کر آگے آگے رکھا، اہل حرم کو بے مقنع و چادر اونٹوں کی ننگی پیٹھ پر بٹھایا اور ہمارے امام حسین کے بیمار اور ضعیف بیٹے سید سجاد کے ہاتھ میں دے کر ان کو پرخار راستوں سے سر و پا برہنہ پیدل چلنے پر مجبور کیا۔ راستے بھر طرح طرح کی ذلتیں اور اذیتیں دیتے رہے۔ شقاوت کی انتہا یہ تھی کہ اگر سید سجاد تھک کر

بیٹھ جاتے تھے، یا پاؤں کے کانٹے نکالنے کے لیے ٹھہر جاتے تھے تو ان کو کوڑے مارتے تھے اگر بیبیاں عزیزوں کے سروں کو دیکھ کر روتی تھیں تو نیزوں کی نوکیں چبھوتے تھے۔ جب یزید کے دارالسلطنت دمشق میں پہنچے تو سب سے زیادہ آباد راستوں سے نہایت ذلت وخواری کے ساتھ ان قیدیوں کو یزید کے دربار تک لے گئے۔ یزید نے بھی ان کی ذلت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور سب کو ایک تنگ وتاریک مکان میں قید کر دیا۔

بنی اسد کا قبیلہ کربلا کے نواح میں آباد تھا۔ اس قبیلے کے لوگوں نے چند روز کے بعد امام حسین اور ان کے رفیقوں کی لاشوں کو دفن کر دیا۔ امام حسین کے اہل حرم سال بھر قید رہے۔ یزید کی بیوی ہندہ آل رسول سے محبت رکھتی تھی۔ اس کو جب ان واقعات کی خبر ہوئی تو اس کی سفارش پر یزید نے ان بے وارثوں کو رہا کر کے مدینے بھجوا دیا۔

حق کی حمایت اور اصول کی حفاظت کے لیے اکثر قربانیاں کی گئی ہیں مگر جو قربانی امام حسین نے کربلا میں ۱۰ محرم ۶۱ھ کو پیش کی اسکی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ امام حسین کی شہادت نے دلوں کو بدل دیا اور خیالوں میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس واقعے سے پہلے کس کی مجال تھی کہ یزید کے دربار میں امام حسین کا نام عزت کے ساتھ لے سکے۔ لیکن اس واقعے کے بعد اسکے منھ پر امام حسین کی تعریفیں ہوتی تھیں اور وہ خاموشی سے سنتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اکثر قتل حسین کا الزام اپنے ملازموں پر رکھ کر خود بھی افسوس اور ندامت کا اظہار کیا کرتا تھا۔ یزید کے بعد اس کا بیٹا سلطنت کا وارث ہوا۔ مگر وہ اپنے باپ کے افعال سے اتنا شرمندہ تھا کہ چند ہی روز میں سلطنت سے دستبردار ہو کر خانہ نشین ہو گیا اور تین مہینے کے بعد خاک کے پردے میں ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا۔

اسی شہادت کا اثر تھا کہ لوگوں کے دل یزید سے پھر گئے۔ یہاں تک کہ اسکی زبردست سلطنت تھوڑے ہی زمانے میں صفحۂ ہستی سے مٹ کر تاریخ کے دامن کا داغ بن کر رہ گئی۔ اور قاتلان حسین کا نام ایسا مٹا کہ آج ایک شخص بھی ان کی اولاد میں باقی نہیں۔ یا یوں کہیے کہ

اس واقعے سے وہ ایسے ذلیل ہوئے کہ ساری دنیا میں ایک آدمی بھی اپنا انتساب انکی طرف پسند نہیں کرتا۔ دوسری طرف وہی حسینؑ جن کے ساتھ کربلا کی جنگ میں گنتی کے چند آدمی تھے آج ان کے نام پر جان نثار کرنے والے کروروں کی تعداد میں موجود ہیں، اور جن کی اولاد میں صرف ایک سید سجاد باقی رہ گئے تھے آج لاکھوں سادات ان کی نسل سے ہونے پر فخر کرتے ہیں۔

جو لوگ ناواقیفت سے واقعہ کربلا کو دو حریفوں کی معمولی جنگ سمجھتے ہیں، یا "قتل" اور "فتح" کو مترادف الفاظ خیال کرتے ہیں، وہ شاید قاتل یزید کو فاتح اور مقتول حسین کو مفتوح سمجھیں لیکن جو لوگ امام حسین کی شہادت کو حق کی حمایت میں ایک عظیم الشان قربانی سمجھتے ہیں وہ اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتے۔ اس کے علاوہ اگر یزید اور امام حسینؑ کے مقاصد پر نظر کریں اور کامیابی کو حصول مقصد سے علیحدہ کوئی چیز نہ سمجھیں تو امام حسین کو فاتح اور یزید کو مفتوح ماننا پڑیگا۔ یزید کا مقصد کیا تھا؟ یہی کہ روحانیت کے تنہا علمبردار اور بنی ہاشم کی روحانی عظمت کے سب سے بڑے نمایندے کو قتل کر کے دنیوی حکومت کے ساتھ روحانیت اور مذہبیت کی قلمرو پر بھی فرماں روائی کرے، اور امام حسین کا مقصد کیا تھا؟ یہی کہ اصول اسلام کو یزید کے ہاتھوں تباہ نہ ہونے دیں اور یزید کی بداعمالیوں کو طشت از بام کر کے دنیا کو یزیدیت سے بیزار کر دیں۔ کیا واقعات کربلا کے نتائج پر نظر کرنے کے بعد کوئی کہہ سکتا ہے کہ یزید کو فتح اور امام حسین کو شکست ہوئی؟ کربلا کی جنگ ایک عجیب جنگ تھی جس میں نمائشی فتح حقیقی شکست اور ظاہری شکست باطنی فتح تھی۔ سید مرتضیٰ علم الہدیٰ نے شہدائے کربلا کے متعلق سچ کہا ہے۔

اِنَّ قَاصِدَھَا بِالضَّرِّ نَافِعُھَا   وَاِنَّ قَاتِلَھَا بِالسَّیْفِ مُحْیِیْھَا

یعنی ان کے ضرر کا قصد کرنے والا ان کو نفع پہنچانے والا تھا

اور ان کو تلوار سے قتل کرنے والا ان کو جِلانے والا تھا

یہ ہے واقعہ کربلا کا سادہ سا خاکہ جس سے اس کی اہمیت کا کسی قدر اندازہ ہو جائے گا۔ لیکن اس واقعے کی حقیقی عظمت اس کے تفصیلات میں مضمر ہے اور تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں

تاریخی تفصیلات کے علاوہ اس واقعے کے ساتھ تخیلی تفصیلات کا بھی ایک بڑا ذخیرہ شامل ہوگیا ہے جو مرثیہ گو شعرا کی قوت اختراع کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ اس واقعے کی حقیقی عظمت اتنی زیادہ ہو کر بڑے سے بڑے شاعروں کی عرش پرواز تخئیل بھی اس کی بلندی اور گہرائی میں کچھ اضافہ نہ کر سکی، پھر بھی ان کی خیال آرائیوں سے اس کا پھیلاؤ ضرور زیادہ ہوگیا ہے۔

مرثیہ گویوں کی تخصیص نہیں، دنیا کے بڑے سے بڑے شاعروں اور افسانہ نویسوں نے اپنی تخئیل کی بلند پروازیوں پر ایک زمانہ ایمان لاچکا ہے، کامل انسان کی خیالی تصویر کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ مگر ان کے خیالی مخلوقات میں بھی کوئی ایسا نہیں ہے، جو فضائل اخلاق میں امام حسین کا مقابلہ کر سکے۔ جن لوگوں نے اس بشریت سے بالاتر انسان کی سیرت کا غور سے مطالعہ کیا ہے ان کے نزدیک لفظ "حسین" ایک مرقع ہے جس میں بہترین اور شریف ترین خصائل انسانی کی بے نظیر اور عرفانی تصویریں نظر آتی ہیں۔

امام حسینؓ کے اس عظیم الشان کارنامے پر خواجہ معین الدین اجمیریؒ نے مذہبی زبان میں کتنا مختصر اور جامع تبصرہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

شاہ است حسین بادشاہ است حسین ۔۔۔ دین است حسین و دین پناہ است حسین

سر داد و نداد دست در دست یزید ۔۔۔ حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسین



مرثیہ اور اجزائے مرثیہ

مرثیہ بالعموم اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی مرنے والے کی خوبیاں بیان کر کے اس کی موت پر افسوس کیا جائے اور بالخصوص مرثیے کا اطلاق اس نظم پر ہوتا ہے جس میں امام حسین کی شہادت یا اس سے متعلق کوئی واقعہ غم انگیز پیرائے میں بیان کیا جائے یعنی مرثیے کا ایک مفہوم عام ہے اور دوسرا خاص۔ لفظ مرثیہ جب بغیر کسی تخصیص کے استعمال ہوتا ہے تو اس سے اکثر یہی خاص مفہوم مراد ہوتا ہے۔ 'مرثیہ گو' اور 'مرثیہ خوان' کی ترکیبوں میں بھی یہی خاص مفہوم مقصود ہوتا ہے۔

ابتدا میں مرثیہ بہت مختصر ہوتا تھا اور اس کی کوئی خاص شکل معین نہ تھی۔ کچھ مدت کے

بعد اس نے مربع کی شکل اختیار کر لی یعنی اس میں چار چار مصرعوں کا ایک ایک بند ہونے لگا۔ انیس کے زمانے سے کچھ پہلے چار چار مصرعوں کے بندوں کی جگہ چھ چھ مصرعوں کے بند ہونے لگے تھے۔ یعنی مرثیہ مسدس کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ اسکے اجزائے ترکیبی بھی معین ہو چکے تھے جو حسب ذیل ہیں:

(ا) چہرہ۔ صبح کا منظر، رات کا سماں، دنیا کی بے ثباتی، باپ بیٹے کے تعلقات، سفر کی دشواریاں، اپنی شاعری کی تعریف، حمد، نعت، منقبت، مناجات وغیرہ تمہید کے طور پر۔

(ب) سراپا۔ مرثیے کے ہیرو کے قدو قامت، خال و خط وغیرہ کا بیان۔

(ج) رخصت۔ ہیرو کا امام حسین سے جنگ کی اجازت لینا اور میدان جنگ میں جانے کے لیے عزیزوں سے رخصت ہونا۔

(د) آمد۔ ہیرو کا گھوڑے پر سوار ہو کر شان و شوکت کے ساتھ رزم گاہ میں آنا۔ آمد کے سلسلے میں گھوڑے کی تعریف بھی لکھی جاتی ہے۔

(ہ) رجز۔ ہیرو کی زبان سے اپنے نسب کی تعریف، اپنے اسلاف کے کارناموں کا بیان اور فن جنگ میں اپنی مہارت کا اظہار۔

(و) جنگ۔ ہیرو کا کسی نامی پہلوان سے یا دشمن کی فوج سے بڑی بہادری کے ساتھ لڑنا۔ جنگ کے ضمن میں ہیرو کے گھوڑے اور تلوار کی بھی تعریف کی جاتی ہے۔

(ز) شہادت۔ ہیرو کا دشمنوں کے ہاتھ سے زخمی ہو کر شہید ہونا۔

(ح) بین۔ ہیرو کی لاش پر اس کے عزیزوں، بالخصوص عزیز عورتوں کا رونا۔

انیس کے مرثیوں میں بالعموم یہ اجزا پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ لازمی نہیں ہو کہ ہر مرثیے میں کل اجزا ہوں اور بالکل اسی ترتیب سے ہوں۔ بعض مرثیوں میں شہادت امام حسین کے بعد کے واقعات لکھے گئے ہیں۔ مثلاً اہلبیت کا کربلا سے دمشق تک سفر کرنا، ان کا زندان شام میں مقید رہنا، یزید کی بیوی ہندہ کا ان سے قید خانے میں ملنا، ان کا قید سے چھوٹ کر مدینے واپس جانا۔ ظاہر ہے کہ ایسے مرثیوں میں اجزائے مذکورہ کا ہونا ممکن ہی نہیں۔

انیس کے مرثیوں کو اور اس قبیل کے تمام مرثیوں کو مرثیہ صرف اس بنا پر کہتے ہیں کہ ان کی بنیاد مرثیے ہی پر قائم ہوئی تھی اور اب بھی ان میں کربلا کے مجاہدوں کی شہادت کا بیان غمناک انداز میں کرنا ضروری ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جس نظم کی ترکیب ان اجزا سے ہوئی ہو اس کو مرثیہ کہنا کچھ بہت مناسب نہ تھا۔ انیس کا مرثیہ حقیقت میں ایک خاص طرح کی رزمیہ نظم ہے جس کی ترکیب میں مرثیت کا عنصر لازمی طور پر موجود ہوتا ہے۔ اس نظم کا میدان مرثیے سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ بلکہ معنوی حیثیت سے شعر کی جتنی قسمیں کی جا سکتی ہیں یہ ان سب پر حاوی ہے۔ بعض لوگ جو اس حقیقت پر نظر نہیں رکھتے ان نظموں کے نام سے دھوکا کھا کر طرح طرح کے بیجا اعتراض کرنے لگتے ہیں۔ خواجہ حالی لکھتے ہیں:

> مرثیے میں رزم و بزم اور فخر و خود ستائی اور سراپا وغیرہ کو داخل کرنا لمبی لمبی تمہیدیں اور توطیے باندھنے، گھوڑے اور تلوار وغیرہ کی تعریف میں نازک خیالیاں اور بلند پروازیاں کرنی اور شاعرانہ ہنر دکھانے، مرثیے کے موضوع کے بالکل خلاف ہیں[1]۔

بیشک مرثیے میں ان چیزوں کی گنجائش نہیں ہوتی۔ لیکن رزمیہ نظم میں یہ سب کچھ ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیئے۔ اور یہ ابھی کہا جا چکا ہے کہ انیس کے مرثیے اصل میں رزمیہ نظمیں ہیں۔ خواجہ حالی خود بھی اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے۔ شہدائے کربلا کے مرثیوں کی تدریجی ترقی اور اسکے اسباب کا ذکر کرنے کے بعد خود تحریر فرماتے ہیں۔

> "یہ ترقی براہ راست مرثیے کی ترقی نہ تھی بلکہ اردو شاعری میں ایک قسم کا ایجاد تھا[2]۔"

تعجب ہے کہ مرثیے کا یہ خاص مفہوم سمجھ لینے کے بعد خواجہ صاحب نے انیس کے مرثیوں کو معمولی مرثیے کے معیار پر جانچنا کیونکر جائز سمجھا۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ انیس کے مرثیوں کے جو مقامات مرثیے کے عام مفہوم کے اعتبار سے بھی مرثیہ کہے جا سکتے ہیں وہاں نہ رزم ہے نہ بزم، نہ فخر ہے نہ خودستائی، نہ گھوڑے کی تعریف ہے نہ تلوار کی توصیف۔ یہ چیزیں وہیں ہیں جہاں کے لیے زیبا ہیں۔

---

[1] شعر و شاعری مصنفہ حالی مطبوعہ انوار المطابع لکھنؤ صفحہ ۱۶۳، [2] شعر و شاعری صفحہ ۱۵۵



اشخاصِ مرثیہ

جن لوگوں کے نام مرثیوں میں اکثر آتے ہیں ان کے بارے میں صرف وہ چند باتیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں جن کا ذکر مرثیوں میں بیشتر آتا ہے یا جن کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

حسینی جماعت

حضرت محمدؐ۔ خدا کے آخری رسول۔ اسلام کے بانی۔ آپکا ذکر جن لفظوں میں اکثر کیا جاتا ہے وہ یہ ہیں:

رسول۔ نبی۔ پیغمبر۔ پیمبر۔ رسول خدا۔ رسالت مآب۔ رسالت پناہ۔ خاتم الانبیا۔ خاتم النبیین۔ ختم رسل۔ ختمی مرتبت۔ شافع محشر۔ مصطفٰے۔ احمد۔ احمد مختار۔ شاہ لولاک۔

حمزہ۔ پیغمبر اسلام کے چچا۔ شجاعت اور رعب داب میں مشہور زمانہ۔

جعفر۔ فن جنگ کے ماہر۔ بہادر سپاہی۔ رسول کی فوج کے علم دار۔ ایک جنگ میں آپ کے دونوں ہاتھ کٹ گئے تھے۔ ان کے عوض میں خدا نے جواہر کے پر عطا کیے جن سے آپ اڑتے ہیں اور اسی وجہ سے جعفر طیار کہلاتے ہیں (طیار کے معنی ہیں بڑا اڑنے والا)

علی۔ رسول کے چچازاد بھائی، داماد اور جانشین۔ ائمہ اثنا عشر میں پہلے امام۔ رسول کی فوج کے علم دار۔ فن جنگ کے زبردست ماہر۔ نہایت شجاع۔ بہت سخی۔ آپ کا ذکر اکثر ذیل کے لفظوں میں کیا جاتا ہے۔

امیر المومنین۔ جناب امیر۔ اسد اللہ۔ شیر خدا۔ شیر الٰہی۔ ابوتراب۔ شاہ مرداں۔ شاہ لافتیٰ، شاہِ ذوالفقار۔ شہنشاہِ نجف۔ ید اللہ۔ نفسِ رسول۔ زوج بتول۔ ساقی کوثر۔ مرتضیٰ۔ حیدر۔ حیدر کرار۔ مشکل کشا۔ فاتح خیبر۔

فاطمہ۔ پیغمبر عرب کی صاحبزادی۔ حضرت علی کی زوجہ۔ امام حسن اور امام حسین کی والدہ۔ زنانِ عالم کی سردار۔ آپ کو زہرا۔ سیدہ۔ بتول۔ خاتونِ جنت۔ خاتون قیامت۔ سیدہ عالم۔ بنت رسول۔ خیر النساء وغیرہ بھی کہتے ہیں۔

حسن ۔ حضرت علی کے بڑے صاحبزادے ۔ ائمہ اثنا عشر میں دوسرے امام ۔ آپ کو شبرِ مجتبیٰ اور حسن مجتبیٰ کے ناموں سے بھی یاد کرتے ہیں ۔ چونکہ امام حسن زہر سے شہید کیے گئے تھے اس لیے آپ کو سید مسموم ۔ امام مسموم وغیرہ بھی کہتے ہیں ۔

حسین ۔ پیغمبرِ عرب کے نواسے ۔ حضرت علی کے بیٹے ۔ ائمہ اثنا عشر میں تیسرے امام ۔ آپ ہی کی شہادت مرثیے کا اصل موضوع ہے ۔ آپ کا ذکر بیشمار ناموں سے کیا جاتا ہے ان میں سے بعض ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :۔

شاہ ۔ شہ کربلا ۔ سلطان مشرقین ۔ شہنشاہ مدینہ ۔ شاہ دیں ۔ شاہِ زمن ۔ شاہ حجاز ۔ سردار دو عالم ۔ سرور کونین ۔ شہید کربلا ۔ مظلوم کربلا ۔ غریب نینوا ۔ سبط رسول ۔ فرزند نبی ۔ ابن علی ۔ ابن فاطمہ ۔ شبیر ۔ سرور ۔ حضرت ۔ سید الشہدا ۔ سید ذی جاہ ۔ خامس آلِ عبا ۔

عباس ۔ امام حسین کے مختلف البطن چھوٹے بھائی ۔ حسینی لشکر کے علم دار ۔ فنون جنگ کے زبردست ماہر ۔ نہایت دلیر ۔ غصہ ور ۔ بڑے قدآور اور بارعب جوان ۔ وفا شعاری کا مجسمہ ۔ بتیس سال کی عمر ۔ کربلا میں امام حسین کے بچوں کو پیاس سے بے قرار دیکھ کر آپ نے ایک مشک اٹھائی اور پانی لینے کے لیے فرات کی طرف چلے ۔ لڑتے لڑتے دریا تک پہنچ گئے ۔ گھاٹ پر جتنی سپاہ کا پہرہ تھا ان کو ہٹا کر گھوڑا دریا میں ڈال دیا اور مشک بھرلی ۔ خود بھی دو دن کے پیاسے تھے چلو میں پانی لے کر پینا چاہا ، لیکن یہ خیال کر کے کہ امام حسین اور ان کے بچوں کو سیراب کرنے سے پہلے اپنی پیاس بجھا لینا وفاداری سے بعید ہے ، پانی پھینک دیا ۔ دریا سے پیاسے نکل آئے ۔ راستے میں دشمنوں نے گھیر لیا ۔ آپ بڑی دلیری سے لڑتے رہے ۔ یہاں تک کہ آپ کے دونوں بازو کٹ گئے اور ایک گرز کی سخت ضرب سے آپ شہید ہو گئے ۔

مسلم ابنِ عقیل ۔ امام حسین کے چچازاد بھائی ۔ ان کو امام حسین نے اپنی روانگی سے پہلے صورت حال دریافت کرنے کے لیے کوفے بھیجا تھا ۔ وہاں ابن زیاد کے حکم سے بڑی بے رحمی سے شہید کیے گئے اور ان کے دو بیٹے قید کر دیے گئے ۔ کچھ دن بعد زنداں بان نے ان کا نسب معلوم کر کے ان پر رحم کھا کر چھوڑ

دیا۔ آخر حارث نے دونوں کو شہید کر دیا۔

عابد۔ امام حسین کے صاحبزادے جو کربلا میں بیمار ہو گئے تھے اور مرض کی شدت کی وجہ سے جنگ میں شریک نہ ہو سکے۔ آپ کا اصلی نام 'علی' تھا اور سجاد۔ عابد۔ زین العابدین آپ کے لقب تھے۔ مرثیوں میں آپ کو 'بیمار کربلا' اور 'سید سجاد' کے نام سے بھی یاد کیا ہے۔

اکبر یا علی اکبر۔ امام حسین کے نوجوان فرزند۔ اٹھارہ سال کا سن۔ آپ کی مادر گرامی کا نام ام لیلیٰ تھا، لیکن مرثیوں میں اکثر آپ کو حضرت شہربانو کا بیٹا قرار دیا ہے۔ حضرت علی اکبر کو ان کی پھوپھی حضرت زینب نے پالا تھا اور ان کو اپنی اولاد سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔ آپ صورت میں جناب رسول خدا سے مشابہ تھے۔ اسی لیے ان کو شبیہ رسولؐ، ہمشکل نبیؐ، ہم صورت پیغمبرؐ وغیرہ بھی کہتے ہیں۔ کربلا کی جنگ میں آپنے خوب داد شجاعت دی۔ آخر حصین ابن نمیر کی برچھی سینے کے پار ہو گئی اور آپ شہید ہو گئے۔

اصغر یا علی اصغر۔ امام حسین کے چھوٹے صاحبزادے، جن کا سن صرف چھ مہینے کا تھا۔ کربلا میں ایک دشمن کے تیر سے شہید ہوئے۔

قاسم۔ امام حسن کے بڑے صاحبزادے۔ امام حسین کے بھتیجے۔ تیرہ برس کا سن۔ ایک روایت ہے کہ امام حسن کی وصیت پوری کرنے کی غرض سے حضرت قاسم کا عقد امام حسین کی صاحبزادی فاطمہ کبریٰ کے ساتھ کربلا میں شہادت سے ایک دن پہلے کر دیا گیا تھا۔ حال کے محقق اس روایت کو مستند نہیں سمجھتے۔ کربلا کی جنگ میں حضرت قاسم کا خاص کارنامہ یہ تھا کہ آپنے شام کے ایک نامی پہلوان ازرق اور اسکے چار بیٹوں کو قتل کیا۔ آخر شہید ہو گئے اور لاش گھوڑوں سے اس طرح پامال کی گئی کہ جسم مبارک ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

عبداللہ۔ امام حسن کے چھوٹے صاحبزادے جو بہت کم سنی کی حالت میں کربلا میں شہید ہوئے۔

عون و محمدؑ۔ حضرت زینب کے صاحبزادے، حضرت جعفر طیار کے پوتے، حضرت علی کے نواسے۔ نو دس برس کا سن مگر نہایت شجاع۔ بعض لوگوں نے ان کے نام 'عون و جعفر' بتائے ہیں۔ مرثیوں

میں ان دونوں بھائیوں کی جنگ ساتھ لکھی جاتی ہو اور یہ بات اکثر بیان کی جاتی ہو کہ چونکہ ان کے دادا جعفر طیار اور نانا حضرت علی دونوں لشکر رسول کے علم دار تھے، اس لیے کربلا کی جنگ میں وہ خود کو حسینی فوج کی علم داری کا دُوانستہ مستحق سمجھتے تھے اور علم نہ ملنے سے رنجیدہ تھے، مگر اپنی مادر گرامی کے سمجھانے سے راضی ہو گئے۔

زینب۔ امام حسین کی بہن۔ اپنے بھائی سے انتہا کی محبت رکھتی تھیں۔ اور اپنے بھتیجے علی اکبر کو اپنے بیٹوں سے زیادہ چاہتی تھیں۔ خاندانی فصاحت اور آبائی شجاعت ورثے میں پائی تھی۔ جب امام حسین کی شہادت کے بعد دشمن ان کے خاندان کو قید کر کے کربلا سے کوفے اور کوفے سے دمشق لے گئے، تو آپ نے راستے میں یزید کے دربار میں بڑی دلیری سے تقریریں کیں اور اپنی مصیبتیں ایسے پر اثر اشعار میں بیان کیں کہ پتھر کا دل پانی ہو جائے۔ مرثیوں میں آپ کا ذکر اکثر ان لفظوں میں کیا جاتا ہو۔ بنت علی۔ بنت فاطمہ۔ خواہر امام۔ شاہ کی ہمشیرہ

کلثوم یا ام کلثوم۔ امام حسین کی چھوٹی بہن۔

کبریٰ یا فاطمہ کبریٰ۔ امام حسین کی بڑی صاحبزادی جن کا عقد بقول بعض کربلا میں قاسم ابن حسن کے ساتھ امام حسین کی شہادت سے ایک دن پہلے ہوا اور دوسرے دن بیوہ ہو گئیں۔

صغریٰ یا فاطمہ صغریٰ۔ امام حسین کی صاحبزادی جو بقول بعض بیماری کی وجہ سے وطن میں رہ گئی تھیں۔

سکینہ۔ امام حسین کی چھوٹی صاحبزادی۔ تین چار برس کا سن۔ بقول بعض زندان شام میں انتقال کیا۔ آپ کی والدۂ محترمہ کا نام رباب تھا۔

اُم سلمہ۔ پیغمبر اسلام کی زوجہ جو واقعہ کربلا کے وقت زندہ اور مدینے میں مقیم تھیں۔

اُم البنین۔ حضرت عباس کی والدہ جنکی نگرانی میں امام حسین کی بیٹی فاطمہ صغرا مدینے میں مقیم تھیں۔

لیلیٰ یا اُم لیلیٰ۔ امام حسین کی زوجہ۔ حضرت علی اکبر کی والدہ۔

بانو یا شہر بانو۔ یزدگرد سوم بادشاہ ایران کی صاحبزادی۔ امام حسین کی زوجہ، امام زین العابدین

کی والدہ۔ مرثیوں میں اکثر انھیں کو حضرت علی اکبر کی والدہ بھی قرار دیا ہے۔

حبیب ابن مظاہر۔ امام حسین کے ساتھ کے کھیلے ہوئے بچپن کے دوست۔ مرثیوں میں ان کو بالعموم بہت بوڑھا دکھایا ہے۔

حُر۔ لشکرِ یزید کے ایک دستے کا سردار جو روزِ عاشورا امام حسین کی طرف آگیا اور سب سے پہلے لشکرِ یزید سے مقابل ہو کر شہید ہوا۔

یزیدی گروہ

یزید ابن معاویہ۔ عرب کا فاسق و فاجر بادشاہ جو اسلام کا مدعی ہو کر احکام اسلام کی صریح مخالفت کرتا تھا۔ اسی کے ایما سے امام حسین کی شہادت واقع ہوئی۔

عبید اللہ ابن زیاد۔ یزید کی طرف سے کوفے کا گورنر تھا۔ اسی کے حکم سے امام حسین شہید کیے گئے۔

عمر ابن سعد۔ اس یزیدی لشکر کا سالار جو کربلا میں امام حسین کے قتل کے لیے بھیجا ہوا تھا۔

شمر ذی الجوشن۔ یزیدی فوج کا ایک سردار۔ نہایت ظالم، بے رحم، حریص، احسان فراموش۔ اسی نے امام حسین کو اپنے ہاتھ سے شہید کیا۔

حصین ابن نمیر۔ یزیدی فوج کا ایک سردار۔ اس کی برچھی نے امام حسین کے نوجوان بیٹے علی اکبر کا کام تمام کیا۔

حُرملہ بن کاہل اسدی۔ یزیدی لشکر کا ایک مشّاق تیر انداز۔ امام حسین کا ششماہہ بچہ علی اصغر اسی کے تیر سے ہلاک ہوا۔

خولی۔ یزیدی لشکر کا ایک سپاہی۔ امام حسین کی شہادت کے بعد جب یزید کی فوج آپ کے اہلِ حرم کو قید کر کے یزید کے دربار کو لے چلی تو امام حسین کا سر مبارک اسی کے نیزے پر بلند تھا۔

ازرق۔ ملک شام کا ایک نامی پہلوان جو حضرت قاسم سے لڑا اور مارا گیا۔ اسکے چاروں بیٹے بھی جنگ آزما جوان تھے۔ وہ سب ازرق سے پہلے حضرت قاسم ہی کے ہاتھ سے قتل ہو چکے تھے۔

ہند یا ہندہ۔ یزید کی بیوی۔ اس کو رسول کے خاندان سے بڑی عقیدت تھی۔ جب اسے معلوم

ہوا کہ امام حسینؑ شہید ہو گئے اور ان کے اہل حرم زندان شام میں مقید ہیں تو اس نے یزید سے سفارش کر کے ان کو رہا کروا دیا۔

حارث۔ کوفے کا باشندہ۔ حضرت مسلم کے دونوں بیٹوں کا قاتل۔

جمال۔ یزیدی لشکر کا ایک بے حمیت بندۂ حرص، جس نے بعد شہادت امام حسینؑ کا پاکا اور انگوٹھی لینے کے لیے آپ کا ہاتھ اور انگلی کاٹ ڈالی۔

نوٹ:۔ عبیداللہ ابن زیاد، عمر ابن سعد اور حصین ابن نمیر کو زیادہ تر صرف ابن زیاد، ابن سعد، ابن نمیر کہتے ہیں۔



میر انیس کے حالات زندگی

میر ببر علی انیس فیض آباد میں (۱۲۱۸ھ ۱۸۰۳ء) پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگوں میں شاعری کئی پشتوں سے چلی آتی تھی۔ ان کے پردادا میر غلام حسین ضاحک فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ طبیعت فطرتاً ہزل اور ظرافت کی طرف مائل تھی۔ ہر وقت ہنسنے ہنسانے سے کام تھا۔ اسی مناسبت سے ضاحک تخلص اختیار کیا۔ سلطنت دہلی کی تباہی کے بعد وہ دہلی کو چھوڑ کر فیض آباد چلے گئے۔

میر انیس کے دادا میر غلام حسن حسن بڑے کامل شاعر تھے۔ ان کی مثنوی سحر البیان ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر اردو شاعری کو ہمیشہ فخر رہے گا۔ وہ غزل کے استاد تھے اور مرثیہ بھی کہتے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور جوانی میں اپنے والد کے ساتھ فیض آباد چلے گئے۔ جب نواب آصف الدولہ نے فیض آباد کی جگہ لکھنؤ کو اپنا دارالحکومت قرار دیا تو میر حسن بھی لکھنؤ چلے آئے اور آخر عمر تک یہیں رہے۔ ان کا انتقال یکم محرم ۱۲۰۱ھ کو ہوا۔

میر انیس کے والد میر مستحسن خلیق بھی باکمال شاعر تھے۔ وہ فیض آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں رہے۔ مگر آخر عمر میں لکھنؤ چلے آئے۔ شعر کا ذوق اور شاعری کا ملکہ ورثے میں ملا تھا۔ سولہ برس کی عمر سے شعر کہنے لگے۔ میر حسن نے ان کے کلام کی اصلاح شیخ مصحفی سے متعلق کر دی۔ مصحفی غزل کے استاد تھے،

شاگرد کو بھی اسی راہ پر لگایا اور اس نے غزلوں کا ایک پورا دیوان کہہ ڈالا۔ مگر صرف غزل گوئی سے شاعری کا شوق پورا نہ ہوا تو مرثیہ گوئی کی طرف توجہ کی اور آخر عمر تک اسی شغل میں مصروف رہے خلیق غزل گوئی کے میدان میں کچھ زیادہ نہ چمکے مگر مرثیہ گوئی نے ان کا نام خوب روشن کیا۔

میر خلیق کے ہمعصروں میں تین مرثیہ گو اور بھی تھے یعنی میر ضمیر، میاں دلگیر، اور مرزا فصیح۔ بگر خلیق کا پایہ مرثیہ گوئی میں کسی سے نیچا نہ تھا اور مرثیہ خوانی میں سب سے اونچا تھا۔ وہ جب مرثیہ پڑھتے تھے تو چشم و ابرو کے اشاروں سے، اعضا کی مناسب حرکتوں سے اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے مضامین کی تصویر کھینچ دیتے تھے۔ سنہ ۱۲۶۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

میر خلیق کے تین بیٹے تھے، میر ببر علی انیس، میر مہر علی انس اور میر نواب مونس۔ یہ تینوں شاعر تھے اور مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کا ذوق جو باپ دادا سے وراثۃً پہنچا تھا اس کو تینوں نے اپنی اپنی استعداد کے موافق اور بھی ترقی دی۔ میر انیس جس طرح سن میں سب سے بڑے تھے اسی طرح ان دونوں فنوں میں بھی اپنے بھائیوں سے کہیں بڑھ کر تھے۔ انھوں نے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی دونوں کو ترقی کی اس منزل پر پہنچا دیا جہاں کوئی آپ تک نہیں پہنچ سکا۔

دنیا کے اکثر باکمالوں کی طرح میر انیس کے بچپن اور تعلیم و تربیت کا حال معلوم نہیں۔ ان کے دو استادوں کے نام ملتے ہیں، مولوی میر نجف علی فیض آبادی اور مولوی حیدر علی لکھنوی۔ مولوی نجف علی مجتہد علوم اسلامیہ کے فاضل، علم طب میں کامل، فارسی کے شاعر اور متعدد کتب و رسائل کے مصنف تھے۔ مولوی حیدر علی لکھنوی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ میر انیس کی والدہ ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ فارسی زبان اور مذہبی مسائل سے کافی واقفیت رکھتی تھیں۔ یقیناً میر انیس نے ابتدائی تعلیم انھیں معظمہ سے حاصل کی ہوگی۔ شاعری میں ان کے کسی استاد کا نام نہیں ملتا۔ مگر ظاہر ہے کہ اس فن کے وہ شعبے جو اکتساب سے تعلق رکھتے ہیں انھوں نے اپنے بڑے چچا میر خلق اور والد میر خلیق سے سیکھے ہونگے۔ مگر انھوں نے اپنے کلام میں جا بجا میر خلیق کے فیض تعلیم اور ان کے اتباع کا ذکر کیا ہے۔ میر انیس کی تعلیم و تربیت کی طرح ان کی علمی استعداد کا حال بھی کسی نے تفصیل سے نہیں لکھا۔ مگر مختلف لوگوں کے بیانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عربی اور فارسی میں اچھی دستگاہ اور جو علم اس زمانے

میں رائج تھے ان سے کافی واقفیت رکھتے تھے۔ ان کے کلام کا غور سے مطالعہ کرنے سے ان کی علمی قابلیت کے بارے میں مندرجہ ذیل نتائج نکلتے ہیں۔ (الف) وہ عربی زبان بخوبی جانتے تھے۔ اپنے کلام میں عربی لفظ، فقرے، محاورے اور ترکیبیں بے تکلف اور برمحل استعمال کرتے ہیں۔ عربی صرف و نحو کے مسائل کی طرف جا بجا اشارے کرتے ہیں۔ عربی اقوال و امثال وغیرہ کا ترجمہ بھی ان کے کلام میں ملتا ہے۔ (ب) قرآن و حدیث کا کافی علم رکھتے تھے۔ آیات و احادیث، ان کے ترجمے، ان کی طرف اشارے تفسیر و حدیث کی کتابوں کے نام، راویوں کے حوالے، یہ سب چیزیں ان کے کلام میں موجود ہیں (ج) اپنے زمانے کے دوسرے علوم رسمی سے بھی واقف تھے۔ ان کے کلام میں عروض، منطق، فلسفہ، طب، رمل وغیرہ کی اصطلاحیں بکثرت موجود ہیں۔ بعض علوم کے مسائل کا بھی جا بجا ذکر ہے (د) فارسی زبان و ادب پر بڑا عبور رکھتے تھے۔ ان کے مرثیوں کا ایک ایک مصرع ان کی فارسی دانی پر شہادت دیتا ہے۔ فارسی لفظوں کا بامحل صرف، فارسی کی دل آویز ترکیبیں، فارسی مثلوں اور قولوں وغیرہ کی طرف اشارے، فارسی شعروں کے ترجمے اور جا بجا ان کو تضمین کرنا، یہ سب چیزیں بتاتی ہیں کہ انیسؔ کو فارسی زبان میں بڑی مہارت تھی۔ ان کی فارسی نظم اور نثر کے بعض نمونے بھی اب تک موجود ہیں۔

میر انیسؔ کی کتابی معلومات بھی کافی تھی، مگر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ ایک من علم سے کام لینے کے لیے دس من عقل بھی رکھتے تھے۔ کتابیں پڑھ پڑھ کر "چارپائے بر او کتابے چند" کا مصداق بن جانا اور چیز ہے اور اپنے علم کو اپنی ذات کا جزو بنا لینا اور اس پر حاکمانہ قدرت رکھنا اور چیز ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ عربیت کا غلبہ اور علمیت کا اظہار جتنا انیسؔ کے ابتدائی مرثیوں میں ہے اتنا آخری مرثیوں میں نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو جو مشق سخن بڑھتی گئی وہ وہ یہ قدرت بھی بڑھتی گئی کہ باریک اور نازک خیالوں کو غریب لفظوں اور علمی اصطلاحوں سے بچ کر سادہ اور عام فہم زبان میں ادا کریں۔

میر انیسؔ کا خاندانی مذہب شیعہ تھا۔ ان کی والدہ ایک تعلیم یافتہ اور پابند مذہب خاتون تھیں اور شرعی مسائل سے بخوبی واقف تھیں۔ میر انیسؔ کے والد بھی ایک مذہبی آدمی تھے۔ جس بچے کی تعلیم و تربیت ایسی ماں کی آغوش شفقت اور ایسے باپ کے ظل عاطفت میں ہوئی ہو اس کو فطرتاً

پابند مذہب ہونا ہی چاہیئے۔ میر انیس کا کلام بخوبی سمجھنے کے لیے ان کے مذہب کو سمجھ لینا ضروری ہو۔ اس لیے ان کے بعض مذہبی عقیدوں کا بیان کسی قدر تفصیل سے کیا جاتا ہے۔

خدا کی خدائی اور محمدؐ کی پیغمبری کے تو سب مسلمان قائل ہیں لیکن پیغمبر کی وفات کے بعد ان کی جانشینی کے مسئلے میں کچھ اختلاف پیدا ہو گیا، جس نے مسلمانوں کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کر دیا جو شیعہ اور سنی کے ناموں سے مشہور ہیں۔ شیعوں کے خیال میں رسول کے پہلے خلیفہ یعنی روحانی جانشین ان کے چچازاد بھائی اور داماد حضرت علی تھے۔ ان کے بعد خلافت انھیں کی اولاد میں نسل بہ نسل منتقل ہوتی رہی۔ رسول کے یہ جانشین جن کی تعداد بارہ ہے 'امام' کہلاتے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہو کہ حضرت محمدؐ، ان کی بیٹی جناب فاطمہ اور بارہ امام یہ چودہ آدمی معصوم ہیں۔ یعنی ان سے غلطی اور گناہ ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ بہترین اخلاق کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کی محبت اور اطاعت خدا کی خوشنودی کا باعث اور ابدی نجات کا ذریعہ ہے اور ان سے عداوت اور انحراف خدا کی ناراضی کا سبب اور دائمی عقوبت کا باعث ہو۔ خوش عقیدہ شیعوں کے نزدیک وہ ظاہری موت کے بعد بھی ابدی زندگی کے مالک ہیں۔ تمام کائنات پر ان کی حکومت ہے۔ معجزہ یعنی خرق عادت ہر وقت ان کے امکان میں ہو۔ زمان و مکان کا فاصلہ ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ان کی دعا سے مریض تندرست اور مردے زندہ ہو سکتے ہیں۔ قدرت کے تمام قانون اور فطرت کی تمام قوتیں ان کے ارادے کی تابع ہیں۔ مگر ان اختیارات کے باوجود انھوں نے کبھی خدا کی مرضی کے خلاف ایک سانس بھی نہیں لی۔ اصولاً سب اماموں کا مرتبہ برابر ہے اور سب یکساں احترام اور اطاعت کے قابل ہیں۔ لیکن عملاً شیعوں کے دل میں پہلے امام حضرت علی کی جس قدر عظمت ہو اور تیسرے امام حضرت حسین ابن علی کی جتنی محبت ہے اتنی کسی اور کی نہیں ہے۔ انھیں امام حسین کو بادشاہ وقت یزید کی فوج نے انتہائی شقاوت اور بے رحمی سے تین دن کی بھوک اور پیاس میں تمام عزیزوں اور رفیقوں سمیت کربلا کے میدان میں شہید کر دیا۔

یوں تو کون انسانی دل ہو جو کربلا کے خونیں واقعے سے متاثر نہ ہو اور حق کی حمایت میں دنیا کی اس سب سے بڑی قربانی کا حال سن کر انسانیت کی درگاہ میں دو آنسو نہ چڑھا دے، لیکن شیعہ تاریخ عالم کے اس بے حد عظیم اور بے انتہا غمناک واقعے کی یادگار قائم کرنا، مجالس عزا منعقد کر کے شہدائے کربلا کے کارناموں کا ذکر اور ان کی اشاعت کرنا جزو مذہب خیال کرتے ہیں۔ اپنی مصیبتوں سے مضطرب

ہونا اور اپنے عزیزوں کی موت پر رونا دھونا اچھا نہیں سمجھتے، لیکن اپنے مظلوم امام کی مصیبتوں پر ماتم کرنا دینی اور انسانی فریضہ سمجھتے ہیں۔ ان فرائض کو یوں تو وہ انفرادی حیثیت سے سال بھر برابر وقتاً فوقتاً ادا کرتے رہتے ہیں لیکن محرم کا مہینہ، بالخصوص اس کا پہلا عشرہ اس کام کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ ان دس دنوں میں وہ تمام کاموں کو ملتوی کر کے اجتماعی حیثیت سے واقعۂ کربلا کی یاد تازہ کرتے اور مجالس عزا قائم کر کے امام حسین کی مصیبتوں پر روتے اور ماتم کرتے ہیں۔ غریب سے غریب شیعہ بھی اپنا یہ مقدس فرض ادا کرنے کے لیے اپنی سخت سے سخت ضرورتوں کو روک کر کچھ نہ کچھ پس انداز کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ ان کی خلقت کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ وہ کربلا کے شہیدوں کی صف ماتم بچھائیں اور اس غم کو قیامت تک قائم رکھیں۔ مرثیوں کی تصنیف کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ انھیں مقدس مجالس عزا میں پڑھے جائیں۔ اس طرح مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کو ایک مذہبی اہمیت بھی حاصل ہو گئی۔

میر انیس کا کلام بتاتا ہے کہ وہ بھی یہ سب عقیدے رکھتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے مرثیوں میں جو زور، شان، اخلاقی بلندی، عظمت، شیفتگی، تقدس اور اثر ہے وہ انھیں عقائد کی بدولت ہے۔ کوئی دوسرا شاعر جو اس طرح کے عقیدے نہ رکھتا ہو وہ شاعری کے انتہائی کمال کے باوجود ایسے مرثیے لکھنے پر قادر نہیں ہو سکتا۔

انسان کی سیرت جن چیزوں سے بنتی ہے ان میں اس کی تعلیم و تربیت اور اس کے مذہبی خیالات کا اثر سب سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔ انیس نے جس فضا میں تربیت پائی تھی اس کا نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ وہ ایک متین، خوددار اور مہذب آدمی ہوں۔ ان کے کمال نے ان طبعی خصوصیات سے مل کر ان کو نازک مزاج بنا دیا تھا۔ ان کی نازک مزاجی اس وقت اور بڑھ جاتی تھی جب وہ مجلس عزا میں منبر پر بیٹھے ہوئے اپنا کلام اہل مجلس کو سنا رہے ہوں۔ اس وقت ان پر ایک محویت کا عالم طاری ہوتا تھا اور وہ اپنے کمال کے نشے میں سرشار ہو کر اس بلندی پر پہنچ جاتے تھے جہاں سے بے کمالی کا درجہ خواہ وہ ریاست و امارت کا لباس ہی کیوں نہ پہنے ہو، بہت پست معلوم ہونے لگتا ہے۔

خودداری اور عزت نفس میر انیس کی سیرت کے بہت نمایاں خصوصیات تھے۔ لیکن یہ باتیں حد اعتدال سے گزر کر خود بینی اور بدمزاجی تک نہیں پہنچ گئی تھیں۔ ان کی طبیعت کا فطری میلان انکسار کی طرف تھا اور وہ خاکساری کو انسان کی ایک اعلیٰ صفت سمجھتے تھے۔ انھوں نے انکسار کی

تعریف اور غرور کی مذمت بار بار نہایت مؤثر پیرائے میں کی ہے۔ وہ قانع اور متوکل آدمی تھے، کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاتے تھے اور خدا کے علاوہ کسی کی مدد پر بھروسہ نہ کرتے تھے۔ خدا نے انھیں جو نعمتیں عطا کی تھیں ان پر اس کا شکر بجالاتے تھے۔ حق کہنے میں ذی اختیار اور صاحب دولت لوگوں سے مرعوب نہ ہوتے تھے۔ قناعت اور استغنا کے متعلق انھوں نے ایسے ایسے پر زور شعر کہے ہیں جن کی نظیر اردو شاعری میں لا مشکل ہو۔ انیس کے زمانے کے امرا نہایت خوشامد پسند تھے اور انیس سا گزارا انھیں کی داد و دہش پر تھا۔ مگر وہ بھری مجلسوں میں ان کے منھ پر اپنی قناعت، خودداری اور بے نیازی کا ذکر نتائج کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اس شان سے کر دیتے تھے کہ ان کا بیان خود ان کے دعووں کی دلیل ہو جاتا تھا۔

مختصر یہ کہ میر انیس کی سیرت میں وہ تمام باتیں جمع تھیں جنھوں نے ان کو ایک کامیاب رزمیہ شاعر بنا دیا۔ جب تک کسی شاعر کے دل میں ولولہ اور جوش نہ ہو، وہ ذلت کرنے کو کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بہتر نہ سمجھتا ہو، ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح نہ دیتا ہو، اس وقت تک وہ رزم گوئی میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا۔

میر انیس اپنی وضع اور اپنے اوقات کے بہت پابند تھے۔ ورزش کا شوق تھا، شہسواری شمشیر زنی، بنوٹ وغیرہ میں مشاق تھے۔ ان کا قد میانہ مائل بہ درازی تھا۔ ورزش کی وجہ سے جسم ٹھوس اور اعضا چست و متناسب تھے۔ بھرا بدن، چوڑا سینہ، صراحی دار گردن، خوبصورت کتابی چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں اور گیہواں رنگ تھا۔ مونچھیں ذرا بڑی رکھتے تھے اور داڑھی اتنی باریک کترواتے تھے کہ دور سے منڈی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

میر صاحب نہایت وضع دار آدمی تھے۔ حباب کی شکل کی چوگوشیا ٹوپی، نیچا گھیر دار کرتہ ڈھیلی مہری کا سفید پائجامہ، گھیتلا جوتا بالعموم پہنتے تھے۔ ان کے زمانے کے ذی علم اور ثقہ شرفا اور صلحا کا یہی لباس تھا۔ ہاتھ میں چھڑی اور رومال بھی ضرور ہوتا تھا۔ وہ اپنی وضع کے اس قدر پابند تھے کہ بڑے سے بڑے نفع کے عوض میں بھی اس کو تبدیل کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ جب میر انیس حیدرآباد گئے اور ان کی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کی شہرت ہوئی تو وہاں کے بہت بڑے رئیس سر آسماں جاہ بہادر نے بھی ان کو اپنے یہاں ایک مجلس پڑھوا کر سننا چاہا، مگر شرط یہ لگا دی کہ

وہ اپنی معمولی ٹوپی کی جگہ حیدر آباد کی منصب داری پگڑی سر پر رکھ کر مرثیہ پڑھیں۔ اس ایک مجلس کے پڑھنے کے لیے پانچ ہزار یا بقول بعض دس ہزار روپیہ دینا تجویز کیا تھا۔ لیکن انیس نے اتنی بڑی رقم کے لیے بھی اپنی وضع میں ذرا سی تبدیلی پسند نہ کی۔

میر انیس نہایت خوش آواز تھے اور جتنے خوش آواز تھے اس سے کہیں زیادہ خوش بیان تھے۔ ان کا دفتر دفتر کلام ان کی خوش بیانی کے لیے شہادت کے بیشمار محضر پیش کر رہا ہے۔ موافق اور مخالف کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جو میر صاحب کی خوش بیانی کا قائل نہ ہو۔ خوش آوازی اور خوش بیانی کے علاوہ تقریر کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ مقرر کی آواز کا اتار چڑھاؤ، چہرے کا تغیر، آنکھوں کی گردش، اعضا کی حرکت، یہ سب چیزیں موقع و محل کے مناسب ہوں۔ اس طرح تقریر کے ہر لفظ کا صحیح مفہوم سامعین کے ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ اور بہت کچھ جو لفظوں سے ادا نہیں ہو سکتا وہ بیان کے انداز سے ادا ہو جاتا ہے اور مقرر سننے والوں پر جو اثر ڈالنا چاہتا ہے وہی پڑتا ہے۔ میر انیس کو خدا نے وہ تمام ذرائع حد کمال تک عطا فرما دیے تھے جن سے کوئی شخص اپنے دل کے حالات اور خیالات دوسروں کے دل تک پہنچا سکتا ہے اور ان میں تقریر کا وہ سب سے بڑا وصف جس کا ابھی ذکر کیا گیا ہے انتہائی درجے تک موجود تھا۔ وہ مرثیہ اس طرح پڑھتے تھے کہ کلام کا اثر بدرجہا بڑھ جاتا تھا۔ ایک ایک اشارے سے واقعات کی تصویر کھینچ دیتے تھے۔ بڑے بڑے لوگ ان کا پڑھنا سن کر مبہوت و متحیر ہو جاتے تھے۔ عام طور پر مسلم ہے کہ میر انیس کا سا مرثیہ پڑھنے والا آج تک پیدا نہیں ہوا۔

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ میر انیس کی ولادت فیض آباد میں ہوئی تھی۔ انھوں نے سب سے پہلا سفر لڑکپن میں اپنے والد کے ساتھ فیض آباد سے لکھنؤ تک کا کیا۔ اس کے بعد کئی مرتبہ اپنے والد کے ہمراہ لکھنؤ آئے۔ جب لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تو پھر اپنی خوشی سے کہیں نہیں گئے۔ البتہ سلطنت اودھ کے انتزاع اور لکھنؤ کی تباہی کے بعد ضروریات زندگی نے مجبور کر دیا کہ وہ قدر دانوں کی طلب پر لکھنؤ سے باہر نکلیں۔ پروفیسر آزاد کی تحقیق کے موافق میر صاحب نے

پہلے پہل ۱۸۵۹ء میں پٹنہ کا سفر کیا اور ان کے سفر الہ آباد، بنارس، پٹنہ اور حیدر آباد دکن تک محدود ہے۔ سب سے آخری اور ناگزیر سفر جس سے کسی ذی حیات کو مفر نہیں ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۰ دسمبر ۱۸۷۴ء کو پیش آیا۔ پنجشنبے کے دن قریب شام انتقال کیا اور جمعے کی صبح سے کچھ پہلے اپنے باغ واقع چوبداری محلہ میں دفن ہوئے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر قمری حساب سے ۷۳ برس چند مہینے اور شمسی حساب سے ۷۱ برس کی تھی۔

سید محمد ذکی الم شاگرد میر مونس نے قطعۂ تاریخ کہا جس کے چند شعر یہ ہیں:-

اے وائے شد خزاں چو بہار گل سخن از باغ نظم بلبل رنگیں کلام رفت

می بود پنجشنبہ و بست و نہم ز عید قبل از غروب پیش شہ خاص و عام رفت

سہ سال و چند ماہ بہ ہفتاد شد فزوں چوں آں رفیع مرتبہ و ذو الکرام رفت

از دل الم کشید سر آہ و زد ندا سوئے ارم انیس امام انام رفت

۱۲۹۱ھ



کلام پر مختصر تبصرہ

کسی شاعر کے کلام پر تبصرہ کرنے میں اپنے دعووں کو دلیلوں سے ثابت اور مثالوں سے واضح کرنا ضروری ہے۔ لیکن انیس کے یہاں ایک ایک مثال میں کئی کئی بند اور بعض اوقات کئی کئی صفحے نقل کرنا ہوتے اور اس سے تبصرہ طویل ہو کر مقدمے کی حد سے نکل جاتا مجبوراً مثالیں ترک کی گئیں۔ اب موجودہ صورت میں یہ تبصرہ کا ہے کو ہے صرف انیس کی شاعری کی خوبیوں کی طرف کچھ اشارے ہیں کہ اگر ان کو ذہن میں رکھ کر انیس کے کلام کا مطالعہ کیا جائیگا تو زیادہ لطف حاصل ہوگا۔

میر انیس نے عام رواج کے مطابق شاعری کی ابتدا غزل سے کی۔ ان کے والد میر خلیق مرثیے کی طرح غزل بھی خوب کہتے تھے۔ انھیں سے انیس نے اپنی غزلوں پر اصلاح لی ہو گی۔ گمان ہوتا ہے کہ انیس کی فطری قوت شاعری جس نے مرثیے میں یہ کمال دکھائے اس نے غزل میں بھی

کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔ لیکن دو تین غزلیں اور غزلوں کے چند متفرق اشعار جو ان کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں، ان سے ان کا شمار اعلیٰ درجے کے غزل گویوں میں نہیں کیا جاسکتا۔ میر انیس کی شاعری کا اصل میدان مرثیہ ہے۔ اس لیے مرثیوں کے مطالعے سے ان کی شاعری کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوسکا وہ ذیل میں نہایت اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

میر انیس بڑے قادر الکلام ہیں، ان کو یہ قدرت حاصل ہے کہ جو نازک سے نازک خیال دل میں پیدا ہو اور لطیف سے لطیف کیفیت طبیعت پر طاری ہو اُسے لفظوں میں بیان کر دیں۔ وہ جیسا خیال ظاہر کرنا چاہتے ہیں اس کی مناسبت سے ایسے الفاظ انتخاب کرتے ہیں جو اپنی آواز اپنے ربط باہمی اور اپنے متعلقات معنوی سے اس خیال کی کامل ترجمانی کرتے ہیں اور سامع کے دل میں وہی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں جو شاعر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مختلف طبقوں اور مختلف طبیعتوں کے لوگوں کے طرز کلام میں جو فرق ہوتا ہے، انیس اس کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ ایک ہی بات کو مختلف طریقوں سے ادا کر سکتے ہیں۔ اختصار اور طول پر بھی ان کو پورا اختیار ہے۔ ان کے پاس لفظوں کا اتنا بڑا خزانہ موجود ہے جس سے زائد شاید ہی کسی اور شاعر کو نصیب ہوا ہو۔ مترادفات کے نازک فرقوں کا بھی بہت لحاظ رکھتے ہیں، وہ ایک ہی واقعے کو جزئیات و تفصیلات کے اختلاف کے ساتھ بیسیوں طرح پر بیان کرتے ہیں اور ہر طرح وہ واقعہ مطابق فطرت رہتا ہے۔ نہ اس کی دلچسپی کم ہونے پاتی ہے نہ نظم کا زور گھٹنے پاتا ہے۔ یہ ایسی خصوصیت ہے جو شاید دنیا کے کسی اور شاعر کے حصے میں نہیں آئی۔ کلام کا اثر انیس کے ارادے کا تابع ہے اور یہ بھی وہ خوبی ہے جو بہترین شاعروں کے سوا کسی میں نہیں پائی جاتی۔

واقعہ نگاری میں انیس کو کمال حاصل ہے۔ مورخانہ واقعہ نگاری اور شاعرانہ واقعہ نگاری میں ایک خاص فرق ہے۔ اگر ایک واقعے کے تمام جزئیات کا علم ہو تو اس کو نظم کر دینے کے لیے صرف طبیعت کی موزونی کافی ہے اور اس کا نظم کر دینا شاعری نہیں ہے۔ کسی واقعے کے اجمالی علم کی بنیاد پر اس کے تفصیلات کا تخیل سے پیدا کرنا شاعری ہے۔ لیکن شاعرانہ واقعہ نگاری

کے لیے بھی یہ لازم ہو کہ واقعات شاعر کے قلم کی جنبشوں کے تابع نہ معلوم ہوں۔ بلکہ قدرتی اسباب کا نتیجہ معلوم ہوں۔ اس کے لیے شاعر کو ایسے اسباب مہیا کرنا پڑتے ہیں کہ جو کچھ وہ واقع کرانا چاہتا ہو اس کا وقوع ان اسباب کا فطری نتیجہ ہوتا ہو۔ حقیقت میں یہ بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن انیس کو اس میں بڑی مہارت ہے۔

ہر واقعے میں بہت سے جزئیات ہوتے ہیں ان میں سے بعض میں انتقال ذہن کی اتنی قوت ہوتی ہے کہ صرف انھیں کے بیان سے واقعہ کا پورا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہو۔ انیس اکثر انھیں جزئیات کو منتخب کر لیتے ہیں اور واقعات کے اجمالی بیان میں تفصیلی بیان سے زیادہ دلچسپی اور اثر پیدا کر دیتے ہیں۔ اسی طرح ایک واقعے کے بعض جزئیات میں دلوں کو متاثر کرنے کی قوت اس کے دوسرے جزئیات سے زیادہ ہوتی ہو۔ انیس بالعموم انھیں موثر جزئیات کو نمایاں کر دیتے ہیں۔

منظر نگاری کا کمال بالعموم یہ سمجھا جاتا ہو کہ منظر کی لفظی تصویر اصلی منظر سے اس قدر مطابق ہو کہ تصویر سے اصل کا لطف حاصل ہو۔ لیکن حقیقت میں مناظر کی تصویروں کو بالکل اصل کے مطابق کر دکھانا شاعر کا کمال نہیں ہے۔ باکمال شاعر اپنی قوت تخیل سے قدرتی منظروں میں ایسا تغیر کر دیتا ہو کہ وہ منظر بالکل فطری تو نہیں رہتا مگر خلاف فطرت بھی نہیں معلوم ہوتا اور منظر کا بیان اصل منظر سے زیادہ دلکش اور موثر ہو جاتا ہو۔ انیس نے صبح کی رونق، شام کا سناٹا، بہار کا جوش، گرمی کی شدت وغیرہ اکثر اس طرح بیان کی ہو کہ ان کے بیان میں شاعرانہ منظر نگاری کا یہ کمال موجود ہو۔

جذبات کے اظہار میں بھی انیس کو بڑی قدرت حاصل ہو۔ جذبات کے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ کوئی محل انتہائی خوشی، غم، حیرت، غصے وغیرہ کا ہوتا ہو، کسی محل پر یہی جذبات بالکل خفیف سے پیدا ہوتے ہیں۔ انتہائی شدت اور انتہائی خفت کے درمیان بیشمار درجے ہوتے ہیں۔ جذبات کے ان مدارج کو ملحوظ رکھنا اور ان کا اظہار کر لینا انیس کا وہ امتیاز ہو جس میں شاید ہی کوئی اردو کا دوسرا شاعر ان کا شریک ہو سکے۔ جن حالات میں جو جذبات پیدا ہونا چاہیے اور جس حد تک پیدا ہونا چاہیے انیس انھیں جذبات کو اسی حد کے اندر دکھاتے ہیں۔ انھوں نے مختلف

مرثیوں میں ایک ہی موقع پر ایک ہی شخص کے جذبات مختلف بلکہ متضاد دکھائے ہیں مگر ہر جگہ حالات میں کچھ ایسا ضمنی تغیر کر دیا ہو کہ جذبات فطرت کے مطابق ہی رہے۔

بعض وقت کئی طرح کے جذبات کے مخلوط ہونے سے ایک خاص کیفیت انسان کے دل پر طاری ہو جاتی ہو۔ بعض اوقات انسان کے دل میں دو طرح کے جذبات یکے بعد دیگرے کچھ دیر تک برابر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح نہ معلوم کتنی عجیب عجیب کیفیتیں انسان کے دل میں گزرتی رہتی ہیں۔ انیس ایسے نازک موقعوں پر جذبات کی فطری حالت کو محسوس کر سکتے ہیں اور ان کے اظہار کے لیے طرح طرح کے مؤثر پیرائے اختیار کرتے ہیں۔ وہ جذبات کا بیان اکثر صراحت سے نہیں کرتے بلکہ ایسے علامات کا ذکر کر دیتے ہیں جن سے وہ جذبات خود بخود سمجھ میں آجاتے ہیں۔

سیرت نگاری تو انیس سے پہلے گویا اردو میں تھی ہی نہیں۔ بعض قصّوں اور مثنویوں میں اشخاص کی سیرت ایک حد تک متعین کر کے دکھائی گئی ہو۔ لیکن سیرت نگاری کا وہ کمال جو انیس کے یہاں ہو اس کا ایک شائبہ بھی میر حسن کے سوا شاید ان کے کسی پیشرو کے یہاں نہیں ملتا۔ انیس کے مرثیوں میں جن لوگوں کا ذکر آتا ہے ان میں سے بعض کے کارناموں کو واقعہ کربلا میں خاص اہمیت حاصل ہو۔ ان لوگوں کی سیرتیں انیس نے تفصیل کے ساتھ دکھائی ہیں اور ان کے مخصوص امتیازات اور خاص خصوصیات ہر جگہ اور ہر حالت میں نمایاں رکھے ہیں۔ باقی لوگ جن کے کردار کو واقعہ کربلا میں کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں ہے ان میں انیس نے عام انسانی خوبیاں حدِ کمال تک دکھائی ہیں لیکن ان میں ایسے خصوصیات نہیں دکھائے ہیں جو ایک کی سیرت کو دوسرے کی سیرت سے ممتاز کر سکیں۔ یعنی انیس کے یہاں چند مشخص شخصیتیں ہیں اور باقی محض نام ہیں۔ امام حسینؑ کی سیرت دکھانے میں انیس نے بالخصوص بڑا کمال کیا ہے اور ملکیت اور بشریت کو کچھ اس تناسب سے سمو دیا ہو کہ وہ مقدس سیرت جس طرح دنیا کی تاریخ میں عدیم المثال تھی اسی طرح اردو شاعری کی دنیا میں بھی بے نظیر ہو گئی۔

انیس نے اشخاص مرثیہ کی جو سیرت دکھائی ہے وہ نہ خالص عربی ہے نہ بالکل ہندوستانی

ملکہ دونوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں ہندوستانیت عربیت سے زیادہ نمایاں ہے۔ بعض لوگ شاید اس کو قابل اعتراض سمجھیں۔ لیکن اگر انیس یہ نہ کرتے تو نہ واقعہ کربلا کو خاص وعام میں یہ عظمت اور اہمیت حاصل ہوتی، نہ امام حسین اور ان کے رفیقوں کی محبت اس طرح ہر دل میں گھر کرتی، نہ اہل ہند ان کو قابل تقلید نمونہ قرار دے سکتے، اور نہ ان کے مصائب کو اپنی ذاتی مصیبتوں کی طرح محسوس کر سکتے اور اگر یہ نہ ہوتا تو انیس کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔

اخلاقی شاعری کے اعتبار سے انیس کے مرثیوں کا پایہ بہت بلند ہو۔ ان کے تمام کلام میں بلند اخلاقی کی ایک لہر دوڑی ہوئی ہو۔ جن اخلاق فاضلہ کی تعلیم انیس کے مرثیوں سے ہوتی ہے وہ اخلاق و نصائح کی کسی کتاب سے یا وعظ و پند کے ذریعے سے ممکن نہیں نفس انسانی کی انتہائی شرافت کے نقشے جن موثر پیرایوں میں کھینچے ہیں ان کا جواب ممکن نہیں اور ان کو انتہائی رذالت کی تصویروں کے مقابلے میں رکھ کر ان کے اثر کو اور بھی قوی کر دیا ہے۔ حسینؑ اور رفیقان حسینؑ کی سیرتوں میں اخلاق حسنہ کی انتہا اس حسن سے دکھائی ہے اور ان کے اعمال و افعال کے ذریعہ سے دکھائی ہو کہ وہ حسن اخلاق کے محض خیالی معیار ہو کر نہیں رہ گئے بلکہ قابل تقلید نمونے بن گئے ہیں۔ بلند اخلاقی کی انتہا کے ساتھ ساتھ ان میں وہ کمزوریاں بھی دکھائی ہیں جو لازمۂ بشریت ہیں لیکن بد اخلاقی کی حد سے بہت دور ہیں۔ یہی کمزوریاں ان اخلاق کے پتلوں کو ہم سے قریب تر کر کے ہماری محبت اور ہمدردی کا رخ ان کی طرف موڑ دیتی ہیں۔

کبھی کبھی میر انیس نے اخلاق کی تعلیم براہ راست پند و موعظت کے ذریعے سے بھی دی ہو لیکن بالعموم وہ ایسا نہیں کرتے بلکہ بلند اخلاقی کے نہایت دل کش نمونے پیش کر کے ہم کو ان کی تقلید پر راغب کرتے ہیں اور اس طرح کی بالواسطہ اخلاقی تعلیم سے ان کے مرثیے کا کوئی مقام خالی نہیں ہوتا۔ اسی اخلاقی بلندی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ انیس کے کلام میں وقار اور تمکین کی ایک خاص شان نظر آتی ہو۔ ان کے بیانات میں اور ان کے ہیرو کے افعال و اقوال میں کہیں ابتذال اور چھچھوراپن نہیں پایا جاتا۔

سلاست، روانی، شگفتگی اور فصاحت کے دوسرے لوازم انیس کے کلام میں اس قدر نمایاں ہیں کہ ان کو بیان کرنے اور ان کی طرف متوجہ کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ جو صحیح المذاق شخص انیس کا ایک مرثیہ بھی پڑھ لے گا وہ کلامِ انیس کے اس وصف کو خود سمجھ لے گا اور اس طرح سمجھ لے گا جس طرح کسی دوسرے کے سمجھانے سے ہرگز نہ سمجھ سکتا۔ انیس کے کلام میں فصاحت اس درجہ نمایاں ہے کہ ان کا کوئی مخالف بھی اب تک اس کا انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکا۔ وہ دقیق اور نازک خیالات کو آسان لفظوں میں اس طرح ادا کر دیتے ہیں کہ ظاہر بیں نگاہیں مضمون کی جدت اور باریکی تک نہیں پہنچتیں اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ انیس کے کلام کی خوبی صرف اس کی فصاحت ہے۔

فصاحت کلام کے لیے یہ ضروری ہے کہ الفاظ کی ترتیب قواعد اور محاورے کے مطابق ہو۔ نظم میں وزن، قافیے اور ردیف کی پابندیوں کی وجہ سے ایسی ترتیب کا قائم رہنا نہایت مشکل ہے لیکن انیس نے اس مشکل کام کو بہتر سے بہتر طور پر انجام دیا ہے۔ ان کے کلام کا زیادہ حصہ ایسا ہے جس میں لفظوں کی ترتیب بالکل نثر کی سی ہے۔ جہاں ضروریاتِ نظم نے ترتیب بدلنے پر مجبور کیا ہے وہاں بھی ایسی تبدیلی ہوئی ہے جو ناگوار نہیں معلوم ہوتی بلکہ اکثر اس تبدیلی کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

حسنِ بیان کے سلسلے میں صنعتوں پر بھی ایک نظر کرنا ضروری ہے۔ بعض لوگوں نے صنعتوں کے استعمال میں ایسی بدسلیقگی اور اتنی بے اعتدالی برتی کہ اب طبیعتیں ان سے ابا کرنے لگی ہیں۔ لیکن کسی شے کے غلط استعمال سے نفسِ شے میں کوئی خرابی نہیں آ سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ اگر اعتدال اور سلیقے کے ساتھ بعض صنعتیں استعمال کی جائیں تو کلام کے حسن میں اچھا خاصہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ میر انیس صنائع کو اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ فصاحت کے شرائط اور بلاغت کے لوازم میں کوئی خلل نہیں پڑتا۔ وہ صنعت کے لیے کلام کے کسی عیب کو گوارا نہیں کر لیتے۔ بعض مفروضہ صنعتیں جن کو حقیقتہً کلام کے حسن میں کچھ دخل نہیں وہ ان کے یہاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ لیکن جن صنعتوں سے کلام کا حسن بڑھتا ہے ان کو انھوں نے بہت کثرت سے استعمال کیا ہے۔ مگر وہ صنعتوں کو اتنا

ابھرنے نہیں دیتے کہ وہ سامع کے ذہن کو معنی سے ہٹا کر اپنی طرف متوجہ کر لیں۔

انیسؔ کے زمانے میں رعایت لفظی کے استعمال کا بڑا زور تھا۔ یہاں تک کہ بعض لوگ اسی کو اصل شاعری سمجھنے لگے تھے اور اس لیے اس کے استعمال میں حد مناسب سے بہت تجاوز کر گئے تھے۔ انیسؔ نے بھی اپنے ماحول سے متاثر ہو کر اس صنعت کو خوب برتا ہے، مگر اس طرح کہ نہ اس کی وجہ سے بیان میں الجھاؤ اور محاورے میں خلل پڑتا ہے، نہ بے جا تکلف اور بے لطف تصنع ظاہر ہوتا ہے اور نہ ذہن کسی غیر متعلق مفہوم کی طرف منتقل ہونے پاتا ہے۔ ان کی مشاقی کے زمانے کے کلام میں ایسی مثالیں بہت ہی کم ملتی ہیں جن میں یہ صنعت بے اعتدالی سے استعمال کی گئی ہے۔ اور جو چند مثالیں ایسی ملتی بھی ہیں ان میں اکثر بے اعتدالی کے جواز کی کوئی صورت موجود ہوتی ہے۔

انیسؔ کے یہاں اکثر ایک ایک مصرعے میں کئی کئی صنعتیں موجود ہیں اور بعض جگہ ایک ایک صنعت کے اندر کئی کئی صنعتیں بھری ہوئی ہیں۔ کچھ صنعتیں ایسی بھی ہیں جو انھیں کی طبیعت نے ایجاد کی ہیں اور جن کا کوئی نام اب تک مقرر نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ صنعتوں کے استعمال میں بھی میر انیسؔ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ لیکن ان کی شاعری کا مرتبہ اس سے بلند تر ہو کہ صنائع کو اس کا طرۂ امتیاز قرار دیں۔ ان کا اصل کمال تو اس سادگی میں ظاہر ہوتا ہے جس پر ہزار صنعتیں نثار ہیں۔

انیسؔ کا کلام جتنا فصیح ہے اتنا ہی بلیغ بھی ہے۔ عام طور پر بلاغت کا ایک غلط مفہوم مشہور ہو گیا ہے جس کی بنا پر لوگ اس کلام کو بلیغ سمجھنے لگے ہیں جس میں مشکل الفاظ، دقیق ترکیبیں، دور از کار استعارے، بعید الفہم تشبیہیں وغیرہ ہوں۔ بعض لوگ اس کلام کو بلیغ سمجھتے ہیں جس میں لفظ کم اور معنی زیادہ ہوں۔ لیکن حقیقت میں بلاغت یہ ہے کہ کلام مقتضائے مقام کے موافق ہو۔ سلاست و اشکال، سادگی و رنگینی، طول و اختصار، سب کچھ بلاغت کے اندر آ جاتا ہے بشرطیکہ مناسب محل پر ہو۔ یہ بات بھی بلاغت میں داخل ہو کہ کلام کا ایک جز دوسرے جز کا نقیض نہ ہو۔ انیسؔ کے کلام میں بلاغت کے یہ تمام لوازم موجود ہیں وہ جس موقع پر جو کام جس شخص سے لیتے ہیں

اور جو بات جس سے کہواتے ہیں وہ اسی کے لیے موزوں ہوتی ہے۔ یہ صفت انیس کے کلام میں اس قدر نمایاں ہے کہ لکھنؤ کے جہلا کی زبان پر بھی یہ جملہ جاری ہے کہ میر انیس کے یہاں حفظ مراتب بہت ہوتا ہے۔

گفتگو اور مکالمے کے لکھنے میں بھی کوئی شاعر انیس کا مقابل نہیں ہو سکتا۔ یوں تو گفتگو کا نظم میں ہونا ہی خلاف فطرت ہے۔ لیکن نظم میں اور بالخصوص مسدس میں جس قدر فطرت کی مطابقت ممکن ہے اتنی انیس کے یہاں موجود ہے۔ اگر لفظوں کی ترتیب میں ذرا سا فرق کر کے انیس کے مکالموں کو نثر کر دیں تو معلوم ہو کہ نظم کا کیا ذکر نثر میں بھی ایسا مکالمہ لکھنے والا اردو میں اب تک کوئی پیدا نہیں ہوا۔ انیس جب دو شخصوں کی گفتگو لکھتے ہیں تو الفاظ طرز کلام اور لب و لہجے میں متکلم اور مخاطب دونوں کی عمر، صنف، بسرت، حیثیت، وقتی قلبی کیفیت، گفتگو کے موقعے اور ان کے باہمی تعلقات کا لحاظ رکھتے ہیں۔ امام حسینؑ اور ان کے اقربا کی گفتگو میں جو فصاحت، جو تہذیب، جو متانت انیس نے دکھائی ہو اس کا جواب کہیں نہیں مل سکتا۔ گفتگو اور مکالمے کا لکھنا بظاہر جتنا آسان معلوم ہوتا ہے حقیقت میں اتنا ہی مشکل ہے۔ ناولوں میں نثر کے مکالمے پڑھیے تو اکثر یہ معلوم ہوتا ہو کہ دو آدمی بے تکلفی کے ساتھ فطری انداز میں گفتگو نہیں کر رہے ہیں، بلکہ لکھے ہوئے سوال و جواب پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ تحریر میں تقریر کی بے ساختگی پیدا کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن انیس نے نظم میں بعض مکالمے اور گفتگوئیں ایسی لکھ دی ہیں کہ ان کو پڑھتے وقت یہ بات خود بخود نظر انداز ہو جاتی ہو کہ وہ نظم میں ہیں۔

ترتیب اور تسلسل بھی انیس کے کلام کی ایک خاص خوبی ہو۔ یہ صفت ان کے کلام میں اس قدر نمایاں ہو کہ ہر شخص اس کو خود محسوس کر سکتا ہے۔ اگر انیس کے متعدد مرثیے پڑھنے کے بعد کسی اور مرثیہ گو کا کلام پڑھا جائے تو اس صفت کا احساس شدت کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ انیس جب ایک بات ختم کر کے دوسری بات شروع کرتے ہیں یا ایک مقام کے بعد دوسرا مقام شروع کرتے ہیں تو دونوں کو اس حسن سے ملاتے ہیں کہ جوڑ معلوم نہیں ہوتا، بات میں بات نکلتی

چلی آتی ہو وہ جلے میں لفظوں کو اور عبارت میں جملوں کو اس ترتیب سے رکھتے ہیں کہ ایک بات سن کر اس کے بعد آنے والی بات کے لیے ذہن خود تیار ہو جاتا ہے اور اس کو کسی خلاف توقع بات سے اچانک سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ یہ نہیں ہوتا کہ کوئی بات ناگہانی طور پر سامنے آکر ذہن کو متوحش کر دے۔ اس خوبی کی بنا پر میر انیس کا کلام پڑھتے وقت دماغ کو راحت اور دل کو لذت ملتی ہے۔

انیس کے کلام کا ایک خاص وصف اعتدال ہے جس کا اظہار تین طرح پر ہوا کرتا ہے:

(۱) لفظ و معنی کی مناسبت میں یعنی وہ دس سیر معنی کے لیے دس من کا لفظ نہیں رکھ دیتے۔

(۲) جذبات کے اظہار میں یعنی وہ مقتضیات مقام کے لحاظ سے جذبات میں شدت اور خفت دکھاتے ہیں۔ انکے یہاں جذبات میں جاہلانہ زور و شور نہیں ہوتا بلکہ مہذبانہ اور شریفانہ اعتدال ہوتا ہے۔

(۳) تعریف و مذمت میں یعنی وہ ہر خوشنما درخت کو طوبیٰ سے، ہر پر فضا باغ کو بہشت سے، اور ہر حسین کو یوسف سے بہتر نہیں کہہ دیتے۔ اسی طرح مذمت میں بھی اعتدال ملحوظ رکھتے ہیں۔

بیان رزم حقیقت میں واقعہ نگاری اور منظر نگاری کے تحت میں آتا ہے، لیکن چونکہ یہ خاص بیان انیس کے یہاں کثرت سے ملتا ہے اور اکثر مرثیوں میں جنگ کے منظر بڑی تفصیل کے ساتھ دکھائے گئے ہیں، اس لیے اس باب میں بھی کچھ لکھنا ضروری ہے۔ انیس جنگ کا نقشہ خوب کھینچتے ہیں۔ پہلوانوں کی ہیبت، ان کی آمد کی دھوم دھام، رجز کا شور اور حریفوں کے داؤں پیچ خوب دکھاتے ہیں اور اس سلسلے میں شمشیر زنی، نیزہ بازی، تیر اندازی اور شہسواری کی اصطلاحوں سے اکثر کام لیتے ہیں۔ حرب و ضرب کے ہنگاموں کی ایسی تصویر کھینچتے ہیں کہ میدان جنگ کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ عام ہنگامہ جنگ کے علاوہ دو حریفوں کا مقابلہ اور ان کی گھاتیں اور چوٹیں اس تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ لڑائی کا سماں سامنے آجاتا ہے۔ اس خصوص میں بھی انیس کا کوئی نظیر دکھائی نہیں دیتا۔

انیس کے زمانے میں تلوار اور گھوڑے کی تعریف مرثیے کا ایک جز بن گئی تھی۔ تلوار کی تعریف کے ضمن میں بالعموم شمشیر زنی کے کمالات دکھائے جاتے ہیں جو حقیقت میں تلوار کی نہیں بلکہ تلوار چلانے والے کی تعریف ہوتی ہے۔ انیس نے بھی زیادہ تر یہی کیا ہے۔ لیکن خود تلوار کی تعریف بھی جا بجا کی ہے۔ گھوڑے کی خوبصورتی، خوش خرامی، سبک روی اور تیز گامی کا بیان بھی خوب

کیا ہے۔ یہ بیان زیادہ تر مبالغہ آمیز ہوتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں گھوڑے کے حقیقی اوصاف بھی نہایت خوبی سے بیان کیے ہیں۔ تلوار اور گھوڑے کی تعریف انیس نے جس جس طرح لکھی ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شمشیر زنی اور شہسواری کی اصطلاحوں پر عبور رکھنے کے علاوہ ان فنون سے بھی واقف تھے۔

پرانے زمانے میں دستور تھا کہ مقابل فوجوں میں سے ایک ایک پہلوان نکل کر مقابلہ کرتا تھا۔ مقابلے سے پہلے ہر پہلوان کچھ فخریہ اشعار پڑھتا تھا۔ جن میں اپنی نسبی فضیلت، اپنے اور اپنے اسلاف کے کارنامے، اپنی بہادری اور فن جنگ کی مہارت وغیرہ کا ذکر شد و مد کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ ان فخریہ اشعار کو رجز کہتے ہیں۔ انیس نے رجز بڑے زور شور کے لکھے ہیں اور اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا ہے کہ ہر شخص کا رجز اسکے حسب حال ہو۔ اسی بنا پر امام حسینؑ کے رجز میں پہلوانی اور زور آوری کا ذکر کم، اور دوسرے شرفوں اور فضیلتوں کا ذکر زیادہ ہوتا ہے۔ اگر کہیں طاقت وری اور جنگ آزمائی کا ذکر ہوتا بھی ہے تو ایک خاص متانت اور وقار کے ساتھ جو امام کے رجز کو محض ماہر جنگ سپاہی کے رجز سے ممتاز کر دیتا ہے۔

انیس نے رخصت پر اکثر بہت زور دیا ہے اور بیشتر جذبات نگاری کا کمال دکھایا ہے۔ حضرت علی اکبر کی رخصت بالخصوص بڑے اہتمام سے اور نئے نئے عنوانوں سے لکھی ہے یہ انیس کا کمال ہے کہ ایک ہی بات کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا اور ہر جگہ فطرت سے مطابقت قائم رہی۔ مرثیے کا یہ حصہ بالعموم بہت دردناک ہوتا ہے۔

مرثیہ کا سب سے زیادہ دردناک حصہ بین ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو بین ہی اصل مرثیہ ہے۔ میر انیس بالعموم مختصر بین لکھتے ہیں۔ طولانی بین بہت کم لکھے ہیں۔ وہ سخت بین لکھنا پسند نہیں کرتے، کیونکہ ان کے مخاطب صحیح عوام نہیں بلکہ لطیف جذبات کے لوگ ہیں، جن کے دل پر بے محل نالے اتنا اثر نہیں کرتے جتنی بامحل ایک آہ۔ جو لوگ لطیف جذبات رکھتے ہیں ان کو سخت مظالم کے بیان سے تنفر اور سخت بین سے تنغص ہوتا ہے۔ لیکن جہاں جہاں ان کے نازک جذبات کو ٹھیس لگتی ہے وہاں ان کے آنسو بے ساختہ نکل آتے ہیں۔ میر انیس اس حقیقت کو خوب سمجھتے تھے۔ ان کے یہاں بین کے علاوہ مرثیے کے دوسرے مقامات بھی اکثر بہت دردناک اور نہایت پر اثر ہوتے ہیں رخصت بالخصوص ایسی ہوتی ہے کہ پتھر کا دل پانی ہو جائے۔

آج کل بعض لوگ قافیہ اور ردیف کو بے ضرورت قیدیں سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ان سے کلام غیر فطری ہو جاتا ہے لیکن وزن جو شعر کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہو اُسے بھی تو غیر فطری کہہ سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہو کہ جس طرح وزن سے کلام کا حسن اور اثر بڑھتا ہو اسی طرح قافیے اور ردیف سے بھی۔ اگر کوئی شخص قافیے اور ردیف کی قیدوں کے ساتھ اظہارِ مطالب میں عاجز ہو تو اس کو بیشک ان پابندیوں سے آزاد ہی رہنا چاہیئے لیکن جو قادر الکلام قافیے اور ردیف کا التزام اس طرح کر سکتے ہیں کہ بیان میں آمد، بے ساختگی اور فطری پن باقی رہتا ہو ان کا کلام سحر بن جاتا ہو۔ اس نکتے کو سمجھنا ہو تو میر انیس کا کلام غور سے پڑھیئے انیس کو قافیے اور ردیف کی پابندی میں ذرا بھی دقت نہیں ہوتی وہ نہایت مشکل قافیے اور ردیفیں اس حسن اور اس آسانی سے نظم کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو ان کے مشکل ہونے کا خیال بھی نہیں ہوتا۔

انیس کے کلام کی چند خصوصیتیں جو نہایت مختصر طور پر علٰحدہ علٰحدہ بیان کی گئی ہیں ظاہر ہو کہ یہ الگ الگ نہیں پائی جاتیں بلکہ ان کا کلام ان تمام خوبیوں کا مجموعہ ہو اور ان سب کے اجتماع سے کلام میں جو حسن اور اثر پیدا ہوتا ہو اس سے صرف دل لطف اندوز ہو سکتا ہو زبان اسکے بیان سے قاصر ہیں۔

آخر میں اس حقیقت کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہو کہ کلام انیس کے جو محاسن اوپر بیان کیے گئے ہیں ان میں انیس کا صرف اعلیٰ درجے کا کلام پیش نظر رکھا گیا ہو۔ کسی شاعر کے بارے میں یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اس کے ابتدائی کلام میں بھی وہ سب خوبیاں موجود ہوں جو بعد کو اس کا طرّۂ امتیاز قرار پائیں۔ یہ توقع بھی بیجا ہوگی کہ کسی ماہر صنّاع کے تمام مصنوعات یکساں طور پر اس کے کمال صنعت کے آئینہ دار ہوں۔ اس سے لغزشیں بھی ہوں گی، فروگزاشتیں بھی ہوں گی، مگر اس کے شاہکاروں میں ان کی حیثیت وہی ہوگی جو چاند میں داغوں کی ہے۔



مرثیہ (۱)

بخدا فارسِ میدانِ تہوّر تھا حُر — ایک سے دو لاکھ سواروں میں بہادر تھا حُر
نارِ دوزخ سے ابوذر کی طرح حُر تھا حُر — (۱) گوہرِ تاجِ سرِ عرش ہو وہ دُر تھا حُر
ڈھونڈ لی راہ خدا کام بھی کیا نیک ہوا — پاک طینت تھی تو انجام بھی کیا نیک ہوا

واہ رے طالعِ بیدار زہے عزت و جاہ — حُر پہ کیا فضلِ خدا ہو گیا اللہ اللہ
پیشوائی کو گئے آپ شہِ عرش پناہ — (۲) خضرِ قسمت نے بتا دی اسے فردوس کی راہ
مدتوں دور رہے جو وہ قریب ایسا ہو — بخت ایسے ہوں اگر ہو تو نصیب ایسا ہو

نار سے نور کی جانب اسے لائی تقدیر — ابھی ذرہ تھا ابھی ہو گیا خورشیدِ منیر
شافعِ حشر نے خوش ہو کے بحل کی تقصیر — (۳) تکیۂ زانوئے شبیر ملا وقتِ اخیر
اوج و اقبال و حشم فوجِ خدا میں پایا — جب ہوا خاک تو گھر خاکِ شفا میں پایا

اللہ اللہ حُر صفدر و غازی کا نصیب — یاں محبوبِ الٰہی جسے فرمائے حبیب
ہجر میں لطفِ ملاقات کا دوری میں قریب — (۴) وہی کام آتے ہیں محسن کے جو ہوتے ہیں نجیب
صدقے ہو جائے اسے عشقِ ولی کہتے ہیں — اس کو دنیا میں سعیدِ ازلی کہتے ہیں

آیا کس شان سے کعبے کی طرف چھوڑ کے دیر — کوئی حضرت کا یگانہ بھی نہ سمجھا اُسے غیر
حق نے لکھ دی تھی جو تقدیر میں فردوس کی سیر — (۵) فتنہ و شر سے بچا ہو گیا انجام بخیر
ذکرِ خیر اسکے موے پر بھی ہوئے جاتے ہیں — عملِ نیک ہر اک وقت میں کام آتے ہیں

---

۱ سوار، شہسوار ۲ فلسفۂ اخلاق میں حد سے بڑھی ہوئی شجاعت کو تہوّر کہتے ہیں جو ایک بری صفت ہے لیکن عام طور پر تہوّر سے انتہائی بہادری مراد لیتے ہیں۔ ۳ بے نظیر، جس کا سا کوئی دوسرا نہ تھا۔ ۴ رسولِ خدا کے ایک جلیل القدر صحابی ۵ آزاد ۶ تعجب کا کلمہ ہے ۷ ایسا بادشاہ جس کے پاس عرش پناہ لے۔ مراد امام حسین ۸ کربلا کی مٹی جس سے بیمار شفا پاتے ہیں۔ ۹ 'محبوبِ الٰہی' سے مراد حضرت محمدؐ اور ان کی جان سے مراد امام حسین۔

کفر کی راہ سے کارہ[1] تھا جو وہ نیک طریق — کس بشاشت سے ہوا رہبرِ[2] ایماں کا رفیق

تھے تو لاکھوں پہ کسی کو بھی ہوئی یہ توفیق — (۶) خلق طینت میں ہو جنکی وہی ہوتے ہیں خلیق

اوج دیندار کو بے دیں کو سدا پستی ہے — اصل جس تیغ کی اچھی ہو وہی کستی[3] ہے

کیوں نہ بالیدہ[4] ہو اس کا چمن جاہ و جلال — جس کو سرسبز[5] کرے خود اسد اللہ کا لال

ہو گیا فاطمہ کے باغ[6] میں آتے ہی نہال — (۷) وہ ثمر پائے کہ پہنچے[7] نہ جہاں دستِ خیال

کھل گیا غنچۂ دل عذر جو منظور ہوئے — صورتِ[8] برگِ خزاں دیدہ گنہ دور ہوئے

حُر کہاں اور کہاں احمدِ مرسل[9] کا خلف — بخت نے دیر سے پہنچا دیا کعبے کی طرف

دل صفا ہو گیا سینے میں تو پائے یہ شرف — (۸) جب کہ آنکھیں ہوئیں حق بیں تو ملا دُرِ نجف[10]

نیک جو امر ہیں دل پر وہی ٹھن جاتے ہیں — جب خدا چاہے تو بگڑے ہوئے بن جاتے ہیں

وصفِ حُر میں ہو زباں معترفِ عجز و قصور — آمد آمد کا بہادر کی سنو اب مذکور

جب ہوئی مستعد جنگ سپاہِ مقہور — (۹) مہرِ[11] افلاکِ امامت نے کیا رن[12] میں ظہور

غل ہوا جنگ کو اللہ کے پیارے نکلے — اے فلک دیکھ زمیں پر بھی ستارے نکلے

۱؎ کراہت کرنے والا ۲؎ ایمان کا راستہ بتانے والے۔ مراد امام حسین ۳؎ تلوار کے جھکنے اور جھک کر سیدھی ہو جانے کی صفت کو تلوار کا کسنا کہتے ہیں۔ ۴؎ بڑھا ہوا۔

۵؎،۶؎،۷؎ سبز اور لال میں ایہام تضاد ہے۔ باغ اور نہال، پہنچے اور دست میں ایہام تناسب ہے۔

۸؎ جس طرح خزاں یعنی پت جھاڑ کے موسم میں درختوں کے زرد پتّے ہوا کے ذرا سے جھونکے میں جھڑ پڑتے ہیں اسی طرح امام حسین کی ادنیٰ توجہ سے حُر کے گناہ دور ہو گئے۔

۹؎ رسول خدا حضرت محمدؐ کے فرزند یعنی امام حسین ۱۰؎ سفید آب دار پتھر در نجف میں پایا جاتا ہے۔ اس کے نگ کی انگوٹھی پہننا فلاح اور برکت کا باعث سمجھا جاتا ہے۔

۱۱؎ امامت کے آسمانوں کا آفتاب۔ جلیل القدر امام۔ یعنی امام حسین

۱۲؎ جنگ کا میدان۔

کیا کہوں شان جواناں جنودِ[1] اللہ | کوئی ہم طلعتِ خورشید کوئی غیرتِ ماہ
باندھی شیروں نے صفِ جنگ میانِ جنگاہ | (۱۰) چمنِ خلد سے کرنے لگیں حوریں بھی نگاہ
واں لعینوں نے درِ ظلم و ستم کھول دیا | بڑھ کے عباس نے یاں سبز علم کھول دیا

ہو گئے سرخ شجاعت سے رخِ آلِ نبی | آئی ٹھنڈی جو ہوا بھول گئے تشنہ لبی
رن میں کرکھا[2] ہوا، بجنے لگے باجے عربی | (۱۱) یکہ تازوں[3] نے کیا شورِ مبارز طلبی[4]
اک گھٹا چھا گئی ڈھالوں سے سیہ کاروں کی | برق ہر صف میں چمکنے لگی تلواروں کی

برچھیاں تولی[5] کے ہر غول سے خونخوار بڑھے | نیزے ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے اسوار بڑھے
تیر جوڑے ہوئے چلّوں میں کماندار بڑھے | (۱۲) بولے شیریاں سے ابھی کوئی نہ زنہار بڑھے
اسدِ حق کے گھرانے کا یہ دستور نہیں | میں نبی زادہ ہوں سبقت مجھے منظور نہیں

یہ سخن کہہ کے مخاطب ہوئے اعدا سے امام | اے سپاہِ عرب و روم و رے و کوفہ و شام
تم پہ کرتا ہے حسین آخری حجت کو تمام | (۱۳) پسرِ مصحفِ ناطق[6] ہوں سنو میرا کلام
سخنِ حق کی طرف کانوں کو مصروف کرو | شور باجوں کا مناسب نہیں موقوف کرو

یہ صدا سنتے ہی خود رک گیا قرنا[7] کا خروش | تھم گیا طبل وغا کی بھی وہ آواز کا جوش
ہو گئے جوڑ کے ہاتھوں کو جلاجل[8] خاموش | (۱۴) کیا بجاتے کہ بجا تھے نہ کسی شخص کے ہوش
پھیرنا ان کو سرودوں[9] کا بھی ناساز ہوا | رعبِ فرزندِ علی سے سرمہ[10] آواز ہوا

---

۱ خدا کی فوجیں، اللہ کے لشکر جنود جمع ہے جُند کی ۲ وہ اشعار یا کلمات جو میدانِ جنگ میں سپاہیوں کو جوش دلانے کے لیے بلند آواز سے کہے جاتے ہیں۔ کرکھا کہنے والے کو کرکیت کہتے ہیں ۳ تنہا دوڑنے والا اکیلا حملہ کرنے والا۔ ایسا شہسوار جس کے برابر کوئی گھوڑا نہ دوڑا سکے ۴ جنگ کے لیے اپنا مقابل طلب کرنا۔ پرانے زمانے میں ایک ایک سپاہی میدانِ جنگ میں نکل کر مخالف فوج کے سپاہیوں کو مقابلے کے لیے آواز دیتا تھا۔ ۵ "تولی در غول" میں تجنیس لاحق ہے۔ ۶ بولتا ہوا قرآن۔ ایسا شخص جس کا کلام آیاتِ قرآنی کے مطابق ہو۔ مراد حضرت علی ۷ ایک فوجی باجا جسے منھ سے پھونک کر بجاتے ہیں۔ بڑی ترئی ۸ جھانجھیں جھانجھ کی جمع۔ ۹ گیت۔ فوجی گیت۔ ۱۰ سرمہ کھانے سے گلا بیٹھ جاتا ہے۔ آواز نہیں نکلتی۔

کم ہوا غلغلۂ فوجِ ستم جب اک بار — یوں گہر بار ہوئے شہ کے لبِ گوہر بار
صف کشی کس پہ ہے یہ اے سپہ ناہنجار — (۱۵) قتلِ سادات[1] کی لشکر میں یہ کیسی ہے پکار
وطن آواروں پہ یہ قرق ہو کیوں پانی کا — کیا زمانے میں یہی طور ہے مہمانی کا

مجھ کو لڑنا نہیں منظور یہ کیا کرتے ہو — تیر چھوڑے ہیں جو مجھ پر تو خطا کرتے ہو
کیوں نبی زادے پہ غربت میں جفا کرتے ہو — (۱۶) دیکھو اچھا نہیں یہ ظلم برا کرتے ہو
شمعِ ایماں ہوں اگر سر مرا کٹ جائے گا — یہ مرقع ابھی اک دم میں الٹ جائے گا

میں ہوں سردارِ شباب[2] چمنِ خلد بریں — میں ہوں خالق کی قسم دوشِ محمد کا مکیں
میں ہوں انگشترِ پیغمبرِ خاتم کا نگیں — (۱۷) مجھ سے روشن ہے فلک مجھ سے منور ہے زمیں
ابھی نظروں سے نہاں نور جو میرا ہو جائے — محفلِ عالمِ امکاں میں اندھیرا ہو جائے

قلزمِ عز و شرف کا درِ شہوار ہوں میں — سب جہاں زیرِ نگیں ہے وہ جہاندار ہوں میں
آج گو مصلحتاً بیکس و ناچار ہوں میں — (۱۸) وارثِ احمدِ مختار[3] کا مختار ہوں میں
بخدا دولتِ ایماں اسی دربار میں ہے — سب بزرگوں کا تبرک مری سرکار میں ہے

یہ قبا کس کی ہے بتلاؤ یہ کس کی دستار — یہ زرہ کس کی ہے پہنے ہوں جو میں سینہ فگار
بر میں کس کا ہے یہ چار آئینۂ جوہر دار — (۱۹) کس کا رہوار ہے یہ آج میں جس پر ہوں سوار
کس کا یہ خود ہے یہ تیغِ دو سر[4] کس کی ہے — کس جری کی یہ کماں ہے یہ سپر کس کی ہے

تنگ آئے گا تو رکنے کا نہیں پھر شبیر — (۲۰) ایک حملے میں فنا ہوں گے یہ دو لاکھ شریر
چل سکیں گے نہ تبر مجھ پہ نہ تلوار نہ تیر — کاٹ جائے گی گلے سب کے یہ برّاں شمشیر
شیر ہوں نجلِ غالب ہر غالب ہوں — میں جگر بندِ علی ابنِ ابی طالب ہوں

---

[1] سید کی جمع۔ یعنی رسول کی اولاد [2] شباب بالعموم جوانی کے معنی میں مستعمل ہے مگر یہاں یہ لفظ شاب کی جمع ہے جس کے معنی ہیں جوان۔ اس فقرے میں اشارہ ہے رسول کے اس قول کی طرف اَلحسن والحسین سیدا شباب اہل الجنۃ۔ یعنی حسن و حسین جوانانِ جنت کے سردار ہیں [3] مختار: منتخب، ذی اختیار، نائب، نمائندہ، کارندہ [4] ایسی تلوار جس کے پھل کا اگلا حصہ دو شاخہ ہوتا ہے۔

مجھ کو ہوتا نہ اگر بخشش امت کا خیال
روک لیتا مجھے رستے میں یہ تھی حر کی مجال

(۲۱)
تھام سکتا تھا لجام فرس برق مثال
پوچھ لو دیکھا ہے اس نے مرے شیروں کا جلال

گفتگو میں سپر اس کی جو نہ ہم ہو جاتے
ہاتھ اک وار میں پہنچوں سے قلم ہو جائے

غیظ سے ہونٹھ چباتے تھے علیؑ کے دلدار
تیغے تولتے تھے عونؑ و محمدؑ ہر بار

(۲۲)
اگلی پڑتی تھی جگر بند حسنؑ کی تلوار
میں نے جب سر کی قسم دی تو رکے وہ جرار

چلتی تلوار تو جنگل تہ و بالا ہوتا
پھر نہ حر خلق میں ہوتا نہ رسالہ ہوتا

تھا یہ بپھرا ہوا عباس مرا شیر جواں
سینۂ حر پہ رکھے دیتا تھا نیزے کی سناں

(۲۳)
میں یہ کرتا تھا اشارہ کہ نہ اے بھائی جاں
رحم لازم ہے ہمیں ہم ہیں امام دو جہاں

کچھ تردد نہیں سر تن سے اتارا جائے
کوئی بندہ نہ مرے ہاتھ سے مارا جائے

گرچہ یہ امر نہیں اہل سخا کے شایاں
کہ کسی شخص کو کچھ دے کے کرے سب پہ عیاں

(۲۴)
پوچھ لو حر تو ہے موجود عیاں راچہ بیاں
اسی جنگل میں مع فوج تھا یہ تشنہ دہاں

شور تھا آج چلیں جسم سے جانیں سب کی
منہ کے باہر نکل آئی تھیں زبانیں سب کی

(۲۵)
زیست ہر شے کی ہے پانی سے شجر ہو کہ بشر
مجھ سے دیکھا نہ گیا میں تو سخی کا ہوں پسر

میں نے عباس دلاور سے کہا گھبرا کر
مشکوں والے ہیں کہاں اونٹ ہیں پانی کے کدھر

کرم ساقی کوثر[۲] کو دکھا دو بھائی
جتنا پانی ہے وہ پیاسوں کو پلا دو بھائی

(۲۶)
رہ نہ جائے کوئی گھوڑا کوئی ناقہ بے آب
چھاگلیں[۳] جلد منگاؤ مرا دل ہے بے تاب

سقے مشکیزوں کے منہ کھول کے آپہونچے شتاب
متوجہ ہوا میں خود کہ وہ تھا کار ثواب

چین آیا نہ مجھے بے انھیں آرام دیئے
تھا جو اک جام کا پیاسا اسے دو جام دیئے

---

[۱] میاں سے خود بخود نکلی پڑی تھی [۲] کوثر کا پانی پلانے والا۔ مراد حضرت علی۔ جو لوگ نیک اعمال کی بدولت بہشت میں جائیں گے، ان کو حضرت علی کوثر کا انتہائی خوشگوار پانی پلائیں گے۔ کوثر بہشت کا ایک چشمہ ہے۔ [۳] چھوٹی مشکیں۔

(۲۷)
تھی یہی فصل یہی دھوپ یہی گرم ہوا — ٹھنڈے پانی پہ گرے پڑتے تھے حر کے رفقا
تشنہ کاموں کا یہ مجمع تھا کہ ملتی نہ تھی جا — سقے بھر بھر کے کٹوروں کو یہ دیتے تھے صدا
بھائیو آؤ جو پانی کی طلب گاری ہے — چشمۂ فیض حسین ابن علی جاری ہے

(۲۸)
آب شیریں کا جو دریا ہوا جنگل میں رواں — فرس و اشتر و قاطر نہ رہے تشنہ دہاں
شکر کرنے لگی تر ہو کے ہر اک خشک زباں — پانی پی پی کے دعائیں انھیں دیتے تھے جواں
شور تھا ابن ید اللہ نے جاں بخشی کی — دین و دنیا کے شہنشاہ نے جاں بخشی کی

(۲۹)
ایک دن وہ تھا اور اک دن یہ ہے اللہ اللہ — کہ اسی طرح ہمیں پیاس میں پانی کی ہے چاہ
چشم امید ہو کیا سب نے پھرائی ہے نگاہ — کوئی اک جام بھی بھر کر ہمیں دیتا نہیں آہ
ہر مسلماں پہ نبی زادے کا حق ہوتا ہے — بچے روتے ہیں تو سینہ مرا شق ہوتا ہے

(۳۰)
کئی معصوم ہیں کم سن کہ موئے جاتے ہیں — دم اکھڑتا ہے مرا جب انھیں غش آتے ہیں
پانی پانی[۲] جو وہ کہتے ہیں تو شرماتے ہیں — پاس دریا ہے پہ اک بوند نہیں پاتے ہیں
سچ ہے غربت کی عجب شام و سحر ہوتی ہے — تیسرا دن ہے کہ فاقوں میں بسر ہوتی ہے

(۳۱)
شہ کی مظلومی پہ گریاں ہوئی ظالم کی سپاہ — عمر سعد نے کی مڑ کے رخ حر پہ نگاہ
بولا وہ اشہد باللہ[۳] بجا کہتے ہیں شاہ — محسن و منعم و آقا ہے مرا یہ ذی جاہ
ان کے احساں کا کیونکر کوئی منکر ہو جائے — سخن حق میں جو شک لائے وہ کافر ہو جائے

(۳۲)
ایک میں کیا ہوں زمانے پہ ہے احساں ان کا — ابر رحمت ہیں خطا پوش ہے داماں ان کا
خشک و تر پر ہے کرم خلق میں یکساں ان کا — اے خوشا حال جو غربت میں ہو مہماں ان کا
جنتی ہے جسے حاصل یہ شرف ہوئے گا — جو ادھر ہو گا خدا اس کی طرف ہوئے گا

---

۱ خنجر۔ ۲ یہاں 'پانی پانی' کے لفظوں سے کلام میں بڑا حسن پیدا ہو گیا ہے، اس لیے کہ 'پانی پانی ہونا' کے معنی ہیں شرمانا۔
۳ خدا کی گواہی دیتا ہوں۔ ایک قسم ہے۔

ان سے قطرہ کوئی مانگے تو گہر دیتے ہیں — ہیں سخی ابن سخی بات پہ سر دیتے ہیں (۳۳)
پیٹ سائل کا یہ فاقوں میں بھی بھر دیتے ہیں — یاں تو زر دیتے ہیں فردوس میں گھر دیتے ہیں
اس مجرم کی گنہگار کی امید ہیں یہ — ذرہ پرور جنھیں کہتے ہیں وہ خورشید ہیں یہ

یہ ابھی ہاتھ اٹھا کر جو دعا فرمائیں — جتنے عالم کے گنہگار ہیں بخشے جائیں
(۳۴) حق سے جس شے کے طلبگار ہوں فوراً پائیں — جام کوثر یہیں فردوس سے حوریں لائیں
مثل خورشید ہے روشن وہ شرف ان کا ہے — یہ وہ بندے ہیں کہ اللہ پہ حق[1] جن کا ہے

ہو کے گھبرا کے یہ بولا عمر سعد شریر — یہ تو ہے صاف طرفداری شہ کی تقریر
(۳۵) اپنے عالم کا نہ کچھ ذکر نہ تعریف امیر — اللہ اللہ یہ اوصاف یہ مدح شبیرؑ
سن چکا ہوں میں کہ مضطر ہو گئی راتوں سے — الفت شاہ ٹپکتی ہے تری باتوں سے

وہ آنکھیں نہ وہ چتون نہ وہ تیور نہ مزاج — سیدھی باتوں میں بگڑنا یہ نیا طور ہے آج
(۳۶) تخت بخشا ہے محمد کے نواسے نے کہ تاج — جن کو سمجھا ہے غنی دل میں وہ خود ہیں محتاج
کون سا باغ تجھے شاہ نے دکھلایا ہے — کہیں کوثر[2] کے تو چھینٹوں میں نہیں آیا ہے

کیا کسی حور کا دکھلا دیا حضرت نے جمال — مل گیا سایۂ طوبیٰ کہ جو ایسا ہے نہال
(۳۷) قصر یاقوت میں پہونچا جو ترا رنگ ہے لال — کون سے میوۂ شیریں پہ ٹپکتی ہے رال
دفعتاً حق نمک کو بھی فراموش کیا — کیا تجھے بادۂ تسنیم نے بے ہوش کیا

میں جہاں دیدہ ہوں سب مجھ کو خبر ہے تیری — قرۃ العین[3] محمد پہ نظر ہے تیری
(۳۸) ہونٹھ بھی خشک ہیں اور چشم بھی تر ہے تیری — جسم خالی ہے ادھر جان ادھر ہے تیری
راہ میں کچھ جو سلوک اور نوازش کی ہے — تو نے فرزند ید اللہ سے سازش کی ہے

۱؎ انھوں نے خدا کی راہ میں ایسے ایسے کار نمایاں انجام دیئے ہیں کہ ان کا صلہ گویا خدا کے ذمے واجب الادا ہے۔ ۲؎ بہشت کا ایک چشمہ۔
۳؎ آنکھوں کی ٹھنڈک۔ نور نظر۔ فرزند۔

(۳۹)

خیر مخفی نہ رہے گا یہ قصور اور فتور
حاکم شام ہے جابر وہ سزا دے گا ضرور
سب تری قوم کے سر تن سے جدا ہوئیں گے
لکھیں گے عہدہ اخبار پہ جو ہیں مامور
گر تجھے دار پہ کھینچے تو کچھ اس سے نہیں دور
زن و فرزند گرفتار بلا ہوئیں گے

(۴۰)

نفع اس امر میں کیا جس میں ہو مردم[۵۱] کا ضرر
شجر قامت سرور پہ جو ڈالے گا نظر
الفت زلف سے بھی پیچ میں تو آئیگا
آنکھیں نکلیں گی محبت سے جو دیکھے گا ادھر
سر چڑھے گا ترا برچھی پہ یہ اس کا ہے ثمر
خال رخ دیکھا تو گھر خالصے لگ جائیگا

(۴۲)

بدر پیشانی سرور کا جو ہے سر میں خیال
سب میں ہو جائے گا انگشت نما شکل ہلال
عشق رخسار میں رتبہ ترا گھٹ جائے گا
تو اسی ماہ میں نقصان ترا ہوئے گا کمال
تیر و شمشیر ہے ابرو کی محبت کا مآل
منھ پہ کہتا ہوں کہ چہرہ ابھی کٹ جائے گا

(۴۲)

خوف کس بات کا پیاسوں سے یہ تھرانا کیا
ننگ کی بات ہے دشمن کی طرف جانا کیا
ابھی لے جائیں جو شبیرؑ کا سر ہاتھ لگے
لب پہ ہر مرتبہ بیکس کی ثنا لانا کیا
ہو نبی یا کہ وصی جنگ میں شرمانا کیا
غلط ہم اس کو سمجھتے ہیں کہ زر ہاتھ لگے

حر پکارا کہ زباں بند کرا و ناہموار
ابن زہراؑ ہے جگر بند رسولؐ مختار
اک زمانہ صفت آل عبا کرتا ہے
قابل لعن ہے تو اور وہ تیرا سردار
میرا کیا منھ جو کروں مدح امام ابرار
آپ قرآں میں خدا ان کی ثنا کرتا ہے

---

۵۱ آنکھ کی پتلی۔ "مردم" اور "آنکھیں" میں ایہام تناسب ہے۔ ۵۲ ضبط ہو کر سرکاری ملکیت میں آجائے گا مجازاً برباد ہو جائے گا۔ خالصہ سرکاری جائداد۔ عوامی تلفظ خالصا۔ ۵۳ دفتر سے نام خارج ہو جائے گا۔ فوج کے دفتر میں ہر سپاہی کا چہرہ یعنی حلیہ لکھ لیا جاتا تھا۔ ۵۴ قائم مقام۔ نائب۔ رسول کا نائب۔ ۵۵ جب آیۂ تطہیر نازل ہوئی تو رسول نے حضرت علی و فاطمہ حسن و حسین کو اپنی عبا کے اندر لے لیا اور کہا کہ خداوندا یہی میرے اہل بیت ہیں۔ تو ان کو پاک کر اور ان پر رحمت نازل کر۔ آل عبا سے یہی چاروں حضرات مراد ہیں۔

وصف ایسوں کا زباں پر کوئی کیونکر لائے
تین سو آئے[۱۱] ہوں تعریف میں جن کی آئے
کسی انساں نے یہ دنیا میں ہیں رتبے پائے (۴۴)
اپنا محبوب و ولی جس کو خدا فرمائے
الفت آل میں مریے تو خوش اقبالی ہے
سنگ ہے ان کی محبت سے جو دل خالی ہے

اسفلوں سے ہے محبت تجھے او سفلہ مزاج
خاک پا اس کی ہوں میں ہے جو سر عرش کا تاج
جس کو کاندھے پہ محمدؐ کے ملی ہے معراج (۴۵)
میرے آقا سا سخی کون ہے کونین میں آج
کیوں ترے سامنے مکروں کہ نہیں بخشا ہے
ہاں مجھے شاہ نے فردوس بریں بخشا ہے

باغ جو مجھ کو دکھایا اسے کیا جانے تو
راحت روح ہے جس باغ کے ہر پھول کی بو
مجھ کو اللہ نے بخشی ہیں وہ حوریں خوشرو (۴۶)
کہ جنھیں تیرے فرشتوں نے نہ دیکھا ہو کبھو[۱۴]
نام کوثر کا نہ لے تو مجھے جوش آتا ہے
انھیں چھینٹوں سے تو بے ہوش کو ہوش آتا ہے

عزت دیں شرف کون و مکاں ہیں شبیرؑ
جان زہرا ہیں محمدؐ کی زباں ہیں شبیرؑ
سنگ پانی ہو وہ اعجاز بیاں ہیں شبیرؑ (۴۷)
جان کیوں ہو نہ اُدھر جان جہاں ہیں شبیرؑ
مہرباں ہوں تو ابھی عقدہ کشائی ہووے
وہ نہ بخشیں تو خدا تک نہ رسائی ہووے

کیا میں اور کیا وہ ریاست مری کیا میرؑ عیال
جب کہ آفت میں پھنسے احمد مختار کی آل
واں کی املاک و زراعت کا ہو کیا مجھ کو خیال (۴۸)
یاں ہوئی جاتی ہے سادات کی کھیتی پامال
گھر کا اب دھیان نہ بچوں کا الم ہے مجھ کو
خانہ بربادی سادات کا غم ہے مجھ کو

۱۱؎ ،آئے، لفظ ،آیہ، کی اردو جمع ہے۔ قرآن کی آیتیں۔ اس مصرعے میں اسی شکل کا ایک اور لفظ آیا ہے۔ ان دونوں لفظوں میں تجنیس تام ہے۔

۱۲؎ یہاں آل سے آل رسول مراد ہیں۔

۱۳؎ جس کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ وہ (بچپن میں) رسول خدا حضرت محمدؐ کے کاندھے پر سوار ہوا کیا ہے۔

۱۴؎ یہ لفظ انیسؔ بالعموم استعمال نہیں کرتے۔ یہ قافیے کی پابندی سے استعمال کرنا پڑا ہے۔

دولتِ حاکمِ دوں پر ہے ترا دار و مدار[۱] ‏ دارِ دنیا سے تعلق نہیں رکھتے دیں دار
کیا مجھے دار پہ کھینچے گا وہ ظالم غدار ‏ (۴۹) ‏ خوابِ غفلت ہے اسے اور مرے طالع بیدار

کسی سردار نے یہ اوج نہ پایا ہوگا ‏ دارِ طوبیٰ[۲] کا مرے فرق پہ سایا ہوگا

ہے سرافراز سدا عاشقِ پیشانیٔ شاہ ‏ سجدے کعبے کرے ہے بیت[۳] ابروؤں کی بیت اللہ
عشق آنکھوں کا ہے مردم کے لیے نورِ نگاہ ‏ (۵۰) ‏ ہے وہ یوسف[۴] جسے ہو مصحفِ رخسار کی چاہ

عاشقِ لب کو غذا لعل و گہر دیتا ہے ‏ یہ دہن چشمۂ کوثر کی خبر دیتا ہے

خالِ رخسار نہیں گوے سعادت ہے یہ ‏ مجھ سے مجرم کے لیے مہرِ شفاعت ہے یہ
ہوں جو آشفتۂ گیسو تو عبادت ہے یہ ‏ (۵۱) ‏ بخدا سلسلۂ بخششِ امت ہے یہ

شبِ معراجِ رسولِ دو جہاں سمجھا ہوں ‏ اس کے ہر تار کو میں رشتۂ جاں سمجھا ہوں

وصفِ دنداں میں زباں جس کی رہے گوہر بار ‏ موتیوں سے دہن اس شخص کا بھر دے غفار
شوق میں سیبِ ذقن کے جسے آئے نہ قرار ‏ (۵۲) ‏ حوریں غرفوں سے دکھائیں اسے رنگِ رخسار

دمبدم چاہنے والوں کے لہو گھٹتے ہیں ‏ یہ گلا وہ ہے گلے جس کے لیے کٹتے ہیں

صدقے اس سینے پہ ہیں عاشقِ صافی سینا ‏ خاک اس دل پہ جو اس سینے سے رکھے کینا
حق نما ہے دو جہاں میں ہے یہی آئینا ‏ (۵۳) ‏ اس کا عاشق ہو تو ہوں کور کی آنکھیں بینا

فیض پاتا ہے وہ دل جس میں لاہوتی ہے ‏ چشم کو اس کی زیارت سے جلا ہوتی ہے

پاؤں پہ وہ ہیں کہ ان پاؤں کو جو ہاتھ لگائے ‏ تو سرِ دست سرافرازیٔ کونین وہ پائے
گردِ نعلینِ مبارک جو اثر اپنا دکھائے ‏ (۵۴) ‏ تو تیا ہوئے کحل الجواہر شرمائے

صدقے کر دیں گے سر ان پاؤں پہ ہم ایسے ہیں ‏ دوشِ احمد پہ رہے جو یہ قدم ایسے ہیں

۱؎ اس بند میں لفظ دار نو مرتبہ آیا ہے، کبھی مستقل لفظ کی حیثیت سے کبھی کسی لفظ کے جزو کی حیثیت سے یہ ایک طرح کی صنعت ہے۔ ۲؎ درخت۔ ۳؎ شعر جس طرح شعر کے دو مصرعے برابر کے ہوتے ہیں اسی طرح دونوں بھویں برابر کی ہوتی ہیں اس لیے بھووں کو شعر یا بیت سے تشبیہ دیتے ہیں۔

۴؎ یوسف اور چاہ میں صنعت ایہام تناسب ہے۔

(۵۵)

عمل خیر سے بہکا نہ مجھے او ابلیس | یہی کونین کا مالک ہے یہی راس و رئیس[1]

کیا مجھے دیگا ترا حاکم ملعون و خسیس | کچھ تردد نہیں کہہ دے کہ لکھیں پرچہ نویس[2]

ہاں سوئے ابن شہنشاہ عرب جاتا ہوں

اے ستمگر جو نہ جاتا تھا تو اب جاتا ہوں

(۵۶)

کہہ کے یہ ذاب[3] سے غازی[4] نے نکالی تلوار | سرخ آنکھیں ہوئیں ابرو پہ بل آئے اک بار

تن کے دیکھا طرفِ فوج امام ابرار[5] | پاؤں رکھنے لگا بن بن کے زمیں پر رہوار

غل ہوا سید والا کا ولی[6] جاتا ہے

یہ طرفدار حسینؑ ابن علیؑ جاتا ہے

(۵۷)

حر نے نعرہ کیا یا حیدر[7] صفدر[8] مدد دے | وقت امداد ہے یا فاتح خیبر[9] مدد دے

زوج[10] زہرا مدد دے نفس پیمبر[11] مدد دے | بندۂ آل ہوں یا خواجۂ قنبر[12] مدد دے

تن تنہا ہے غلام اور بہت ظالم ہیں

آئی آواز کہ اے حر ترے حامی ہم ہیں[13]

(۵۸)

مل گئی راہ خدا واہ رے اقبال ترا | پاک عصیاں سے ہوا نامۂ اعمال ترا

جرم ماضی ہوئے سب عفو خوشا حال ترا | جلد جا جلد کہ شائق ہے مرا لال ترا

مرد ہے جس کی یہ ہمت یہ ارادہ ہوئے

ہاں بہادر تری توفیق زیادہ ہوئے

منتظر ہیں ترے سب فوج حسینی کے جواں | در فردوس پہ مشتاق کھڑا ہے رضواں[14]

راہ تکتی ہیں تری دیر سے حورانِ جناں | شور کوثر پہ ہے شبیرؑ کا مہماں ہے کہاں

فوج قدسی تری ہمت کی ثنا کرتی ہے

فاطمہؑ آج ترے حق میں دعا کرتی ہے

---

۱ سر۔ سردار۔ ۲ خبر نویس، واقعہ نگار، جو ہر جگہ کی خبریں پرچوں پر لکھ لکھ کر دار السلطنت کو بھیجتے رہتے تھے۔ ۳ تلوار لگانے کی پیٹی۔ ۴ بہادر سپاہی۔ ۵ نیکوکار۔ فرض شناس، مقدس، پاک۔ یہ عربی لفظ بار اور برّ کی جمع ہے۔ اردو میں واحد کی حیثیت سے بھی مستعمل ہے۔ ۶ دوست۔ مددگار۔ محافظ۔ ۷ حضرت علی کا ایک نام۔ ۸ صفوں کو پھاڑنے یا چیرنے والا۔ بڑا بہادر سپاہی، فن جنگ کا ماہر۔ ۹ خیبر کا قلعہ مدینے کے قریب واقع تھا۔ اس کا محافظ مرحب اسلام کا سخت دشمن اور بڑا نامی پہلوان تھا۔ جب رسول نے خیبر پر حملہ کیا تو کسی کو مرحب سے مقابلہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ آخر حضرت علی نے اس کو قتل کیا اور قلعے کا بھاری پھاٹک جس کو بہت سے لوگ مل کر کھولتے اور بند کرتے تھے اکیلے اکھاڑ لیا۔ ۱۰ شوہر۔ ۱۱ پیغمبر کی جان و روح، مراد حضرت علی۔ ۱۲ ایک شاہزادہ جس نے حضرت علی کی غلامی اختیار کر لی تھی۔ ۱۳ حر حامی ہم ہیں یہ چار لفظ ایک ہی آواز سے شروع ہوتے ہیں۔ التزام ایک صنعت ہے۔ ۱۴ بہشت کے داروغہ

(۶۰)

تو بہشتی ہے یہ کافر ہیں کنشتی[1] اے حُر
مٹ گئی سب ترے اعمال کی زشتی اے حُر
دیکھ اب صورتِ حورانِ بہشتی اے حُر
کس تلاطم میں بچی ہے تری کشتی اے حُر
غضب اللہ کا شبیر کی ناراضی ہے
پنجتن[2] تجھ سے ہیں راضی تو خدا راضی ہے

(۶۱)

اور بالیدہ[3] ہوا سن کے یہ مژدہ وہ ہژبر[4]
دل بیتاب پکارا کہ نہیں طاقتِ صبر
اب تو اس فوج میں اک دم کی بھی تعویق[5] ہے جبر
قعرِ[6] دوزخ ہے مسلماں کے لیے صحبتِ گبر[7]
ہاں اٹھا باگ جو شیدائے شہِ عالی ہے
فوجِ اللہ دینی میں تری جا خالی ہے

(۶۲)

سن کے یہ باگ جو لی اسپِ سبک[8] تاز اڑا
ڈر سے رنگِ عمرِ شعبدہ پرداز اڑا
کیا اڑا رخش[9] کہ طاؤس بصد ناز اڑا
دی پرندوں نے یہ آواز کہ شہباز اڑا
باغ زہرا میں نسیمِ سحری جاتی ہے
غل تھا دربارِ سلیماں[10] میں پری جاتی ہے

(۶۳)

کیا د تین رسالوں نے تعاقب ہر چند
حُر کا ہاتھ آنا تو کیسا نہ ملی گردِ سمند[11]
کہتے تھے شرم سے وہ لپکے جو دوڑے تھے کمند
یہ چھلاوا[12] تھا کہ آندھی یہ فرس تھا کہ پرند
کیا سبک سوئے چمن بادِ بہاری پہونچی
ہم نہیں رہ گئے واں حُر کی سواری پہنچی

(۶۴)

یاں ہے علمِ[13] امامت سے شہِ دیں آگاہ
ہنس کے عباس سے فرمایا کہ اے غیرتِ ماہ
میرے لشکر کی طرف ہے رخِ حُرِ ذی جاہ
سب سے کہہ دو کہ نہ روکے کوئی اس شخص کی راہ
جاؤ لینے کو عجب رتبہ شناس آتا ہے
میرا مہماں مرا عاشق مرے پاس آتا ہے

---

[1] کنشت۔ کافروں کا عبادت خانہ دیر۔ مندر۔ گرجا [2] پانچ بزرگ، یعنی حضرات محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ۔
[3] خوشی سے پھولا ہوا۔ [4] شیر۔ [5] تاخیر۔ [6] گہرائی۔ تہ [7] آتش پرست۔ کافر۔
[8] عمدہ قسم کا تیز رفتار گھوڑا۔ [9] رستم کے گھوڑے کا نام۔ [10] کہتے ہیں کہ پریاں حضرت سلیمان کی اُمّت میں ہیں۔ یعنی ان کو اپنا پیغمبر مانتی ہیں اور ان کی پیروی کرتی ہیں۔ سلیمان اور پری کا ساتھ ذکر کر کے ان کے اسی تعلق کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ [11] اچھی نسل کا گھوڑا، ایک خاص رنگ کا گھوڑا۔ [12] ایک ہوائی مخلوق جس کو کسی جگہ قرار نہیں ہوتا اور دم بھر میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔ [13] وہ علم جو اماموں کے لیے مخصوص ہے۔

ذکر یہ تھا کہ صدا در سے آئی اک بار — الغیاث[1] اے جگر و جان رسول مختار

مجرم ایسا ہوں کہ عصیاں کا نہیں جس کے شمار (۶۵) عفو کر عفو کر اے چشمۂ فیض غفار

پار دریائے خطا سے مری کشتی ہو جائے — دوزخی بھی ترے صدقے میں بہشتی ہو جائے

کئی روزوں سے تلاطم میں ہوں اے شاہنشاہ — مدد اے نوح غریباں مرا بیڑا ہے تباہ

دست و پا گم ہیں کچھ ایسے کہ نہیں سوجھتی راہ (۶۶) شور کرتا ہوں کہ بتلائے کوئی جائے پناہ

ابر رحمت کی طرف جا یہ صدا دیتے ہیں — سب ترے دامن دولت کا پتا دیتے ہیں

تیرے دامن کے نثار اے مرے آقائے غلیل — رحم کر رحم کہ شرمندہ ہے یہ عبد ذلیل

دل غنک ہوئے جو نکلے کوئی کوثر کی سبیل (۶۷) جان آ جائے جو مولائے دو عالم ہوں کفیل

نہ وزیروں میں یہ ہمت نہ شہنشاہ میں ہے — سب مرے درد کا درماں تری درگاہ میں ہے

خلق میں آپ کے والد کا کرم ہے مشہور — بات میں بخش دیے سیکڑوں بندوں کے قصور

مجھ سے ہیں بات پکڑ لینے پہ آزردہ حضور (۶۸) بخش دیجے تو کرم سے نہیں کچھ آپ کے دور

یہ تو کیونکر کہوں میں لائق تعزیر نہیں — مگر اسود[2] سے زیادہ مری تقصیر نہیں

اے مددگار و معین الضعفا[3] ادرکنی[4] — اے خبر گیر گروہ غربا ادرکنی

پاؤں لغزش میں ہیں اے دست خدا ادرکنی (۶۹) ہاتھ باندھے ہوں میں اے عقدہ کشا ادرکنی

دیجیے حشر کو سند نار سے آزادی کی — آیئے جلد خبر لیجیے فریادی کی

---

[1] غیاث کے معنی مدد۔ "الغیاث" کی صدا دینا مدد کی درخواست کرنا ہے۔

[2] اسود۔ ایک اسلامی مجاہد جس نے مال غنیمت میں سے ایک زرہ چرائی تھی۔ حضرت علی نے قانون اسلام کے مطابق اس کا ہاتھ کٹوا لیا۔ مگر وہ ہاتھ کٹنے کی حالت میں حضرت علی کی تعریف کرتا رہا۔ اس کا یہ فعل خدا کو پسند آیا اور رسول نے خدا کے حکم سے اس کا گناہ معاف کر دیا اور ہاتھ جوڑ دیا۔

[3] ضعیفوں کے مددگار۔

[4] میری خبر لیجئے۔ عربی فقرہ ہے۔

میرے اعمال میں ہر چند سراسر ہے بدی　　ہوں گنہگار خدائے ازلی و ابدی
(۷۰) آپ ہیں مالک سرکار جناب احدی　　اے خداوند جہاں خُذ بیدی[1] خُذ بیدی
جو تہی دست ہیں تکتے ہیں شہنشاہ کا ہاتھ　　آپ کا ہاتھ زمانے میں ہے اللہ کا ہاتھ

ایک یہ خستہ تن اور درپے جاں لاکھ حریف　　اے سلیماں کہیں پامال نہ ہو مور ضعیف
(۷۱) چھوڑ کر آپ کی سرکار کہاں جائے نحیف　　کیجیے اب نظر لطف کہ ہوتا ہوں خفیف
ہوں سرافراز جو اتنا ہی کرم ہو جائے　　نام قنبر کے غلاموں میں رقم ہو جائے

استغاثہ یہ کیا حُر نے جو با دیدۂ نم　　آگیا جوش میں اللہ کا دریائے کرم
(۷۲) خود بڑھے ہاتھوں کو پھیلائے شہنشاہِ امم　　حر کو یہ ہاتف غیبی نے صدا دی اس دم
شکر کر سبطِ رسول الثقلین آتے ہیں　　لے بہادر ترے لینے کو حسینؑ آتے ہیں

حُر نے دیکھا کہ چلے آتے ہیں پیدل شبیر　　دوڑ کر چوم لیے پائے شہ عرش سریر
(۷۳) شہ نے چھاتی سے لگا کر کہا اے با توقیر　　میں نے بخشی مرے اللہ نے بخشی تقصیر
میں رضامند ہوں کس واسطے مضطر ہے تو　　مجھ کو عباس دلاور کے برابر ہے تو

کس کے کیوں باندھا ہے ہاتھوں کو میں ہوتا ہوں خجل　　سہل کر دیں اسے گر اور کوئی ہو مشکل
(۷۴) بھائی آ مجھ سے بغلگیر تو ہو کھول کے دل　　غافر[2] و راحم[3] و تواب[4] ہے رب عادل
جرم سب محو کیے حق نے ترے دفتر سے　　آج پیدا ہوا گویا شکم مادر سے

حُر پکارا بابی انت و امی[5] یا شاہ　　قابل عفو نہ تھے بندۂ آثم[6] کے گناہ
(۷۵) مجھ سے گمراہ کو اک آن میں مل جائے یہ راہ　　سب ہے صدقہ انھیں قدموں کا خدا ہے آگاہ
مہر قدمے یہ جو ہو ذرہ تاباں ہو جائے　　آپ جس مور کو چاہیں وہ سلیماں ہو جائے

---

[1] میرا ہاتھ پکڑ۔ میری مدد کر۔ عربی فقرہ ہے۔ [2] گناہ بخشنے والا۔ [3] رحم کرنے والا۔
[4] توبہ قبول کرنے والا۔ [5] میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔ عربی جملہ ہے۔
[6] گنہگار۔

(۷۶)

کون مقداد[1] تھے سلمان و ابوذر تھے کون ۔۔۔ آپ فرمائیں کہ عمار دلاور تھے کون
شور عالم میں جو ہے مالک اشتر تھے کون ۔۔۔ اے خداوند جہاں حضرت قنبر تھے کون
انھیں قدموں کا تصدق تھا کہ ممتاز ہوئے ۔۔۔ اسی سرکار کے خلعت سے سرفراز ہوئے

(۷۷)

شہ نے فرمایا کہ خالق کی عنایت ہے یہ سب ۔۔۔ دے کسی شخص کو بندے ہیں یہ مقدور ہے کب
اس مسبب کی عنایت کے یہ سارے ہیں سبب ۔۔۔ وہی منعم وہی محسن وہی رازق وہی رب
اپنے کیسے سے نہ دام اور نہ درم دیتے ہیں ۔۔۔ جب وہ خالق ہمیں دیتا ہے تو ہم دیتے ہیں

(۷۸)

لاکھ[2] ہاتھ اس کے ہیں دینے کے وہ ایسا ہے جواد[3] ۔۔۔ ہم اسے بھولیں تو بھولیں وہ ہمیں کرتا ہے یاد
رزق وہ حوصلۂ حرص سے دیتا ہے زیاد ۔۔۔ شکر کرتے نہیں معبود کا اس پر بھی عباد[4]
وہ غنی ہے کہ ہے محتاج زمانہ اس کا ۔۔۔ کبھی خالی نہیں ہوتا ہے خزانہ اس کا

(۷۹)

جس قدر اس سے طلب کیجیے خوشنود ہے وہ ۔۔۔ صاحب جود ہے وہاب[5] ہے محمود[6] ہے
ہاتھ پھیلائیے جو سو بار تو موجود ہے وہ ۔۔۔ بخش دیتا ہے کہ ہم عبد ہیں معبود ہے
پرورش جرم پہ بھی صبح و مسا ہوتی ہے ۔۔۔ یاں سے ہوتی ہے خطا واں سے عطا ہوتی ہے

(۸۰)

کہہ کے یہ ساتھ لیے حر کو چلے شاہ امم ۔۔۔ ہاتھ میں ہاتھ تھا مہمان کا اللہ رے کرم
راس و چپ قاسم و اکبر تھے نہ بے شان حشم ۔۔۔ سر پہ کھولے ہوئے تھے حضرت عباس علم
دور سے اہل خطا تیر جو برساتے تھے ۔۔۔ رفقا سائے میں ڈھالوں کے لیے آتے تھے

---

[1] مقداد، سلمان، ابوذر، عمار، مالک اشتر، یہ سب رسول کے جلیل القدر صحابی تھے۔
[2] وہ بڑا دینے والا ہے۔ لاکھ طریقوں سے دیتا ہے۔
[3] سخی
[4] بندے، عبد کی جمع۔
[5] بڑا دینے والا۔ بڑا سخی۔
[6] جس کی حمد کی جائے۔

لائے اس عزت و حرمت سے جو مہماں کو امام | بولے عباس کمر کھول اب اے نیک انجام
شہ نے فرمایا مناسب ہے کوئی دم آرام | (٨١) عرض کی مرتے کمر خلد میں کھولے گا غلام
فاتحہ[1] پڑھ کے یہ شمشیر و سپر باندھی ہے | آج اس عزم پہ خادم نے کمر باندھی ہے

ہے بہت شمر و عمر سے مجھے لڑنے کی امنگ | ایک ہی وار میں دونوں کو کروں گا چورنگ
لشکر شام سے بہم چلے آتے ہیں عدو تنگ | (٨٢) شاہزادوں کی سپر ہوں کہ عبادت ہے یہ جنگ
کہیں ایسا نہ ہو بچہ کوئی بے جان ہو جائے | پہلے یہ تازہ غلام آپ پہ قربان ہو جائے

شہ نے فرمایا کہ دشوار ہے فرقت تیری | مجھ کو مر کر بھی نہ بھولے گی محبت تیری
وا دریغا ہوئی کچھ ہم سے نہ خدمت تیری | (٨٣) خیر فردوس میں ہو جائے گی دعوت تیری
آج رتبہ ترا افضل شہدا میں ہوگا | شب کو تو صحبت محبوب خدا میں ہوگا

تجھ پہ مخفی نہیں ہفتم سے جو کچھ ہے مرا حال | (٨٤) راہیں ہر سمت کی روکے ہوئے ہیں اہل ضلال[2]
قحط پانی کا ہے اس دشت میں گندم کا ہے کال | نان جو کا بھی ہے ملنا کسی قریے میں محال
سب کو ایذا عوض آب و غذا ملتی ہے | دودھ[3] اصغر کو نہ عابد کو دوا ملتی ہے

حُر نے رو کر سر تسلیم جھکایا بہ ادب | شہ نے رومال رکھا آنکھوں پہ رونے لگے سب
جب چڑھا گھوڑے پہ وہ عاشق سلطان عرب | (٨٥) شاہ بولے کہ عجب دست چھٹا ہائے غضب
دم بدم یاں سے جو آواز بکا جاتی تھی | گریۂ آل محمد کی صدا آتی ہے

---

[1] مردے کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے سورۂ فاتحہ اکثر پڑھا جاتا ہے۔ کسی شخص یا چیز کا (یا یہ) کا فاتحہ پڑھنا کے مجازی معنی ہیں اس سے ہاتھ اٹھانا، مایوس ہونا، اس کی آس چھوڑ دینا۔ اس کی توقع نہ رکھنا۔ یہاں زیر نظر فقرے کے معنی ہیں زندگی سے ہاتھ دھو کے۔

[2] گم راہی۔

[3] مجبوری اور بے بسی کی انتہا یہ ہے کہ تندرست اور سن دار لوگوں کو کھانا پانی نہ ملنے کا کیا ذکر، چھ مہینے کے بچے کے لیے دودھ اور بیمار بیٹے کے لیے دوا تک میسر نہیں۔

(٨٦)

حر چلا فوج مخالف پہ اٹھا کر توسن ۔۔۔ جو کڑی بھول گئے جس کی تگاپو سے ہرن[1]

وہ جلال اور وہ شوکت وہ غضب کی چتون ۔۔۔ ہاتھ میں تیغ کمال دوش پہ ہر[2] میں جوشن

دوسرے دوش پہ شملے کے[3] جو بل کھاتے تھے ۔۔۔ کاکل حور کے سب پیچ کھلے جاتے تھے

(٨٧)

زور بازو کا نمایاں تھا بھرے شانوں سے ۔۔۔ دست فولاد دبا جاتا تھا دستانوں[4] سے

برچھیوں[5] اڑتا تھا دب دب کے فرس رانوں سے ۔۔۔ آنکھ لڑ جاتی تھی دریا کے نگہبانوں سے

خود روئی کی جو ضو تا بہ فلک جاتی تھی ۔۔۔ چشم خورشید میں بجلی سی چمک جاتی تھی

٦ برچھیوں اڑنا محاورہ

(٨٨)

نیزۂ حر کی سناں[6] پر نہ ٹھہرتی تھی نگاہ ۔۔۔ تھا یہ ظاہر کہ نکالے ہے زبان مار سیاہ

قبضۂ تیغ پہ رکھے تھی سر عجز پناہ ۔۔۔ آفتابی[7] وہ بھی جس سے خجل گردۂ ماہ

قدر اندازوں کو جانوں کے ادھر لالے تھے ۔۔۔ تیر ترکش میں نہ تھے آگ کے پرکالے تھے

مطلع دوم

رن میں جیب کی طرف سے حر دیندار آیا ۔۔۔ کس بشاشت سے اٹھاتا ہوا رہوار آیا

غل ہوا سید مظلوم کا غمخوار آیا ۔۔۔ جاں نثار خلف حیدر کرار آیا

تیغ تو ہے[8] ور سر راہ نظر آتا ہے ۔۔۔ جلوۂ قدرت اللہ نظر آتا ہے

---

[1] بدن۔ [2] اوپر کا دھڑ۔ [3] ایک طرح کی پگڑی [4] لوہے کے دستانے جو سپاہی جنگ کرتے وقت ہاتھوں کی حفاظت کے لیے پہن لیتے تھے [5] برچھیوں اڑنا اور برچھیوں اُڑنا دونوں کے معنی ہیں بہت اونچی جست کرنا یہ محاورہ ان دونوں صورتوں سے آتا ہے۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:۔

اڑا اڑ کے برچھیوں جو اترتا تھا کھیت میں ۔۔۔ گھوڑے کے چاروں پاؤں در آتے تھے ریت میں (انیس)

اڑا اڑ کے برچھیوں وہ تگادر روانہ تھا ۔۔۔ نیزے کا عکس اس کے لیے تازیانہ تھا (مونس)

شبدیز کو رانوں میں دلاور نے جو دابا ۔۔۔ پھر اڑ گیا برچھیوں ہی وہ گھوڑا دورکا با (انیس)

آ گئی آفت اگر اس شوخ کی مژگاں ہلی ۔۔۔ پر لگے برچھیوں سمند ناز دلبر اڑ گیا (برق)

[6] نیزے یا برچھی کا پھل۔ پورا نیزہ بھی مراد لیتے ہیں۔ [7] پردہ۔

آنے جانے کا بہادر کے کروں کیا مذکور — پہلے کچھ اور ہی جلوہ تھا پر اب اور ظہور
(۹۰) اے خوشا رتبۂ فیض قدم پاک حضور — غل تھا آتا ہے ملک پہنے ہوئے خلعت نور
صحبت اہل ولا[1] دل کو جلا کرتی ہے — مس کو اک آن میں اکسیر طلا کرتی ہے

واہ کیا فیض ہے سرکار شہ عالم میں — ذرۂ خاک کو خورشید کیا اک دم میں
(۹۱) نور[2] یہ حور میں دیکھا نہ بنی آدم میں — یہ وہی حر جری ہے جو ابھی تھا ہم میں
تن ہے خوشبو رخ گل رنگ ترو تازہ ہے — خاک نعلین مبارک کی عجب غازہ ہے

ہر ذرہ ہے جہاں چہرۂ روشن ایسا — چاند بھی جس سے کرے کسب ضیا تن ایسا
(۹۲) حرز ہو بازوے داؤد[3] کا جوشن[4] ایسا — ہوش پریوں کے اڑے جاتے ہیں توسن[5] ایسا
گلشن دہر میں لو باد بہاری آئی — قاف[6] میں غل ہے سلیمان کی سواری آئی

حر پکارا کہ بجا کہتے ہو بے شک لاریب — دامن حضرت شبیرؑ نے ڈھانپے مرے عیب
(۹۳) دولت دیں سے نہ دامن مرا خالی ہے نہ جیب — بارک اللہ کی دیتا ہے صدا ہاتف غیب
فیض پا کر یہ شمشیر زنی آیا ہوں — یاں سے محتاج گیا واں سے غنی آیا ہوں

مجھ کو خورشید کیا نور خدا کی ضو نے — نور بخشا قمر فاطمہؑ کے پرتو نے
(۹۴) بخت پائے ہیں سکندر کے غلام نو نے — گنج وہ لایا ہوں دیکھا جو نہ تھا خسرو[7] نے
دور دورہ آج سے میرا ہے زمانہ میرا — کبھی خالی نہیں ہونے کا خزانہ میرا

---

[1] محبت۔ دوستی۔ [2] نور اور حور میں تجنیس لاحق ہے۔ [3] حضرت داؤد پیغمبرؑ کو خدا نے یہ معجزہ عطا کیا تھا کہ ان کے ہاتھ میں لوہا بالکل نرم ہو جاتا تھا اسی لیے انھوں نے زرہ سازی کو اپنا پیشہ قرار دیا تھا۔ اس مصرعے میں انھیں باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ [4] ایک طرح کی زرہ۔ [5] مشکل سے قابو میں آنے والا شوخ اور جی دار گھوڑا۔ [6] قاف کاکیشیا میں ایک پہاڑ ہے۔ کاکیشیا کی عورتیں بہت خوبصورت ہوتی ہیں غالباً اسی بنا پر کوہ قاف پریوں کا مسکن سمجھا جاتا ہے اور پریاں حضرت سلیمان کی امت میں ہیں اسطرح قاف اور سلیمان میں ایک نسبت ہے۔ [7] خسرو پرویز ایران کا ایک بادشاہ جس کے پاس آٹھ خزانے ایسے تھے کہ ان کا جواب روئے زمین پر نہ تھا۔

رُخِ روشن کو مرے تکتے ہو کیا حسرت سے — ل کے آیا ہوں منھ اپنا قدمِ حضرت سے
نور وہ ہے جسے دیکھیں نظرِ رغبت سے — (۹۵) وائے وہ لوگ جو محروم ہیں اس دولت سے
مجھ کو بھی دیکھ کے بیدار نہیں ہوتے ہو
ہے غضب آنکھیں تو کھولے ہو مگر سوتے ہو

جانِ سلطانِ رسالت[۱] کو غنیمت جانو — پسرِ شاہِ ولایت[۲] کو غنیمت جانو
قمرِ برجِ امامت[۳] کو غنیمت جانو — (۹۶) نورِ خالق کی زیارت کو غنیمت جانو
ساتھ اس کے برکت خلق سے اٹھ جائیگی
پھر جو ڈھونڈھوگے یہ دولت تو نہ ہاتھ آئیگی

ایک سید کو مٹا دینے میں ہے کون سا نام — اس ہوا پر[۴] ہو کہ بجھ جائے چراغِ اسلام
گر ہو دانا تو کہو بد ہے کہ ہے نیک یہ کام — (۹۷) خوش نما کب ہے وہ تسبیح[۵] نہ ہو جس میں امام
شکرِ احسانِ جنابِ احدی کرتے ہیں
پیشوا سے کہیں پیرو بھی بدی کرتے ہیں

یہ سخن سن کے پکارا پسرِ سعدِ شریر — ہاں طرفدارِ شہِ دیں پہ چلیں نیزہ و تیر
لیے حربوں کو بڑھا فوج کا انبوہِ کثیر — (۹۸) فاتحہ[۶] پڑھ کے جواں مرد نے کھینچی شمشیر
حُر کا منھ سُرخ ہوا فوجِ ستم زرد ہوئی
شعلۂ تیغ سے بجلی کی چمک گرد ہوئی

رعد[۷] تھرّا گیا نعرے جو سنے ضیغم کے — استخواں کانپ گئے زیرِ زمیں رستم کے
تہ و بالا ہوئیں لشکر کی صفیں جم جم کے — (۹۹) برقِ شمشیر سے ڈر ڈر کے فرس بھی چمکے[۸]
نوبتِ جنگ نہ آئی تھی کہ دل ٹوٹ گئے
بیرقیں[۹] گر گئیں ہاتھوں سے نشاں چھوٹ گئے

---

۱ سب سے بڑا رسول۔ مراد حضرت محمدؐ۔ ۲ سب سے بڑا ولی، مراد حضرت علی۔
۳ امامت کے برج کا چاند۔ ذی مرتبہ امام۔ امام حسینؑ ۴ یہ غلط منصوبہ باندھے ہوئے ہو۔
۵ تسبیح کے سرے کا لمبا دانہ۔ ۶ قرآن کا پہلا سورہ جس کو سورۂ حمد کہتے ہیں۔ اس کا پڑھنا
برکت اور کامیابی کا باعث خیال کیا جاتا ہے۔
۷ وہ فرشتہ جس کی آواز بادل کی گرج ہے۔ ۸ بھڑکے
۹ جھنڈیاں۔

چھیڑ کر باگ فرس کو جو ذرا گرمایا   غیظ میں آن کے گھوڑا بھی غضب کھا آیا
شیر سا فوجِ مخالف پہ جھپٹ کر آیا   روند ڈالا اُسے دم میں جسے سرکش پایا (۱۰۰)
اس کا قاتل تھا جو دشمن شہِ عالی کا تھا   کاٹ ہر نعل میں شمشیرِ ہلالی کا تھا

حشر برپا تھا کہ تیغِ حسنِ ذی جاہ چلی   آگ برسانے کو بجلی سوئے جنگاہ چلی
کس کرشمے سے وہ لیلیٰ ظفر راہ چلی   کہ تھمی گاہ بڑھی گاہ رُکی گاہ چلی (۱۰۱)
زخم سینوں کے گریباں کی طرح پھٹتے تھے   چال کیا تھی کہ ہزاروں کے گلے کٹتے تھے

کیں صفیں صاف مگر منہ کی صفائی نہ گئی   کج ادائی کو نہ چھوڑا وہ لڑائی نہ گئی
کاٹ چھانٹ اور وہ لگاوٹ وہ رکھائی نہ گئی   سیکڑوں خون کیے اور کہیں آئی نہ گئی (۱۰۲)
شور تھا برق پئے جلوہ گری نکلی ہے   جان لینے کو اجل بن کے پری نکلی ہے

جس طرف دیدۂ جوہر[1] سے نظر کرتی ہے   پل نہ گزرے کہ صفیں زیر و زبر کرتی ہے
چشم ہر چند کہ پتلی کو بسر کرتی ہے   ہے وہ طرار[2] کہ آنکھوں[3] میں یہ گھر کرتی ہے (۱۰۳)
اس کے افسوں سے جو ساحر ہو تو جل جاتا ہو   سحر پریوں کا اسی طرح سے چل جاتا ہو

پھونکے بجلی کو یہ اُس آگ کی ہے پرکالا[4]   کاٹ جائے تو کبھی لہر نہ لے پھر کالا[5]
برچھیاں چل گئیں اس پر جسے دیکھا بھالا   آ گیا دام میں جس شخص پہ ڈورا ڈالا[6] (۱۰۴)
اس کے پانی میں کفِ مار سیہ گھولا[7] ہے   باڑھ ہے یا ملک الموت نے منہ کھولا ہے

---

[1] وہ گول گول سے نشان جو عمدہ قسم کے فولاد میں ہوتے ہیں اور صیقل کرنے سے اُبھر آتے ہیں۔
[2] تیز۔ چالاک۔ ڈھیٹ۔ [3] آنکھوں میں سمانا۔ موہ لینا۔ محبوب ہونا۔ ڈھٹائی کرنا۔
[4] چنگاری۔ ٹکڑا۔ اصل میں یہ لفظ 'پرکالہ' ہے۔ لیکن چونکہ 'کالا' 'بھالا' 'ڈالا' کے ساتھ قافیہ کیا گیا ہے اس لیے 'پرکالا' لکھا گیا ہے۔ [5] سانپ۔ صفت بول کر موصوف مراد لیا ہے۔
[6] اصل محاورہ ڈورے ڈالنا ہے۔ یہاں قافیے کی ضرورت سے محاورے میں ذرا سا تغیر کر دیا گیا ہے۔ ڈورے ڈالنا کے معنی ہیں اپنی طرف مائل کرنا۔ پرچانا۔ ڈھب پر لانا۔ پھانسنا۔ لگاوٹ کرنا۔ [7] گھلا ہوا ہے۔

آئی جس غول پہ لاشوں سے زمیں پاٹ گئی
دست و پا صدر و کمر گردن و سر کاٹ گئی
چاٹ ایسی تھی لہو کی کہ صفیں چاٹ گئی
(۱۰۵) دیکھی تیغوں کی جدھر باڑھ[1] اسی گھاٹ گئی
جس پہ جاتی تھی نہ بے جان لیے پھرتی تھی
ایک بجلی تھی مگر لاکھ جگہ گرتی تھی

گل نئے پھولے جو برچھی پہ لگا پھل اس کا
زور دکھلاتا تھا ہر ضرب میں کس بل اس کا
ڈھیر تھا خاک پہ کاٹا ہوا جنگل اس کا
(۱۰۶) جو بڑھا جنگ کو قصہ ہوا فیصل اس کا
شور تھا دیکھیے کیونکر یہ بلا ٹلتی ہے
اس قدر جلد تو سیفی[2] بھی نہیں چلتی ہے

جنگ میں تیغ کا دعویٰ تھا کہ یکتا میں ہوں
سر اٹھایا تھا یہ گھوڑے نے کہ عنقا میں ہوں
چرخ کہتا تھا کہ یارب تہ و بالا میں ہوں
(۱۰۷) برق کہتی تھی کہ تلوار ہے یہ یا میں ہوں
کس میں ہے یہ جو تڑپ پر فلک میری ہے
تیغ کرتی تھی اشارہ یہ چمک میری ہے

نہ تھمی سنگ سے وہ اور نہ رکی آہن سے
ہاتھ اڑا لے گئی پہنچوں سے تو سر گردن سے
نہ اٹھی اسکی کڑی ضرب کسی جوشن سے
(۱۰۸) چل گئی باد مخالف جدھر آئی سن سے
جوش طوفاں کا دکھا کر وہ خوش اسلوب گئی
خوں کے دریا میں اک کشتی تن ڈوب گئی

کثرت جوہر ذاتی سے وہ گو جال میں تھی
پر تڑپ صورت ماہی وہی ہر حال میں تھی
تھی چمک جانے میں بجلی تو پری چال میں تھی
(۱۰۹) کبھی مغفر[3] میں کبھی سر میں کبھی ڈھال میں تھی
کہیں دم لینے کی مہلت تھی نہ بسمل کیلئے
تھی جگر کے لیے برچھی تو چھری دل کیلئے

صید کرنے کو جھپٹے صورت شہباز آئی
لاکھ تڑپا پہ نہ بے جان لیے باز آئی
غل ہوا شہپر شاہیں کے تلے قاز آئی
(۱۱۰) اڑ گیا طائر جاں اور نہ آواز آئی
گرچہ قبضے میں لیے تھی اسے پر چھوڑ دیا
تھا زبس صید زبوں[4] کاٹ کے سر چھوڑ دیا

---

[1] سیلاب، زیادتی۔ [2] ایک عمل کا نام ہے جس میں دشمن کی ہلاکت کی نیت سے کوئی دعا خاص شرائط کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔ [3] خود، جنگ میں سر کی حفاظت کے لیے فولادی ٹوپی۔
[4] لاغر، خوار۔

آب نے آتشِ سوزاں کا اثر دکھلایا
تاب نے مرگِ مفاجات[1] کا گھر دکھلایا
باڑھ نے جادۂ صحرائے سقر دکھلایا (۱۱۱)
گھاٹ نے آئینۂ فتح و ظفر دکھلایا
تیغ کہتی تھی درِ فتح کی مفتاح[2] ہوں میں
قول قبضے کا یہ تھا قابضِ ارواح[3] ہوں میں

خم وہ پایا تھا کہ شرمائے ہلالِ مہِ عید
حر کے ہاتھ آگئی تھی گلشنِ جنت کی کلید
برش ایسی تھی کہ کٹ کٹ گئی سب فوجِ یزید (۱۱۲)
جامۂ کفر کے پرزے تھے زہے قطع و برید
نہ بچا تارِ نفس خلق میں جینے کے لیے
چاک زخموں کے فقط رہ گئے سینے کے لیے

کئی حملے کیے سہم جو کمانداروں پر
خجل گئے تیرِ ملامت کے خطاکاروں پر
چٹکیاں سب کی دھری رہ گئیں سوفاروں[4] پر (۱۱۳)
رخ پھرا تھا کہ گری برق ستمگاروں پر
جل کے خرمن ہوا یوں خاک کہ خوشہ نہ ملا
کشمکش میں کہیں چھپنے کو بھی گوشہ نہ ملا

نیزۂ فوجِ ستمگار تھے دیکھے بھالے
دم میں اس شیرِ نیستاں نے قلم کر ڈالے
گرچہ تھے جان لڑائے ہوئے لڑنے والے (۱۱۴)
آفتِ مرگ کو سر سے کوئی کیونکر ٹالے
جب سپرداروں کے پرے جنگ پہ تل جاتے تھے
بند سب ناخنِ شمشیر سے کھل جاتے تھے

الف[5] گرز کو کر دیتی تھی ہر ضرب میں دال
تھی نئی آمد و رفت اور نئی طرح کی چال
کہیں برچھی کی انی[6] تھی تو کہیں تیر کی بھال[7] (۱۱۵)
کہیں تلوار کہیں خنجرِ براں کہیں ڈھال
ضرب کو دو کیے دشمن کو فنا کرتی تھی
دم بدم فوجِ ستمگر بھی ثنا کرتی تھی

---

[1] ناگہانی موت۔ [2] کنجی۔ فتح اور مفتاح میں صنعتِ اشتقاق ہے۔ [3] روحوں کا قبض کرنے والا۔ ملک الموت۔ [4] تیر کے پیچھے کا سرا جس میں کمان کا چلّہ لگانے کے لیے ایک کھندانہ بنا ہوتا ہے۔

[5] ہر چوٹ اتنی کڑی پڑتی تھی کہ جو گرز حرفِ الف کی طرح سیدھے تھے وہ حرفِ دال کی طرح ٹیڑھے ہو جاتے تھے۔

[6] برچھی کی نوک۔ [7] تیر کی نوک۔

(١١٦)
شور تھا آگ ہے تلوار میں یا پانی ہے
جل نہ جائے کشتیِ تن خون میں طوفانی ہے
ضرب میں فرد ہی یہ زور میں لاثانی ہے
کہتا تھا حُر یہ فقط قوتِ ایمانی ہے
زور تھا مجھ میں ایسا نہ وغا کی طاقت
سب ہے یہ سبطِ پیمبر کی دعا کی طاقت

(١١٧)
کہہ کے یہ فوج میں پھر تشنہ جگر ڈوب گیا
در لطۂ[1] قلزمِ آفت میں گہر ڈوب گیا
لشکرِ شام کے بادل میں قمر ڈوب گیا
کشمکش تھی کہ عرق میں گلِ تر ڈوب گیا
تھا کبھی شیر سا بپھرا ہوا شمشیروں میں
کبھی نیزوں کے نیستاں میں کبھی تیروں میں

(١١٨)
گہہ چھپا اور کبھی نکلا وہ مہِ برجِ شرف
کبھی اس صف میں در آیا کبھی روندی وہ صف
کبھی دریا کے کنارے کبھی صحرا کی طرف
کبھی نعرہ تھا کہ صدقے ترے یا شاہِ نجف
جتنے مجروح تھے دم انکے نکل جاتے تھے
شیر بھی نام علی سن کے دہل جاتے تھے

(١١٩)
نخل تھراتے تھے سب گونج رہا تھا جنگل
سرکی جاتی تھی زمیں رن کی غضب تھی ہلچل
کوند جاتی تھی سروں پر جو وہ شمشیرِ اجل
منھ کے بل گرتا تھا کوئی تو کوئی سر کے بھل
حشر برپا تھا سواروں پہ فرس لوٹتے تھے
دو پہ چار ایک پہ دو پانچ پہ دس لوٹتے تھے

(١٢٠)
بڑھ کے فرماتے تھے عباس زہے ہمتِ جاہ
بارک اللہ[2] کی دیتا تھا صدا اکبر[3] شاہ
کہتے تھے ابنِ حسن[4] واہ حرِ غازی واہ
شاہ ہر ضرب پہ فرماتے تھے ماشاء اللہ[5]
اپنی جانبازی کا غازی جو صلہ پاتا تھا
مسکراتا ہوا تسلیم کو جھک جاتا تھا

---

[1] گرداب۔ بھنور۔
[2] خدا برکت دے۔ کلمہ تحسین ہے۔
[3] امام حسینؑ کا بیٹا یعنی حضرت علی اکبر۔
[4] امام حسنؑ کا بیٹا۔ حضرت قاسم۔
[5] لفظی معنی ہیں جو کچھ خدا نے چاہا۔ اردو میں واہ واہ۔ شاباش کے معنی دیتا ہے۔ اس کلمے سے بڑے چھوٹوں کی تعریف کرتے ہیں۔

حیف جھکنے میں لعینوں نے جو فرصت پائی ‌ ‌ ‌ سامنا چھوڑ کے سب فوج عقب سے آئی
لاکھ خونریز اُدھر اور اِدھر تنہائی ‌ (۱۲۱) ‌ باگ گھوڑے کی پھراتا تھا کہ برچھی کھائی
آگیا موت کے پنجے میں نہ کچھ دیر لگی ‌ ‌ ‌ فرق پر گرز[1] لگا دوش پہ شمشیر لگی

سینہ غربال ہوا تیر چلے اعدا کے ‌ ‌ ‌ رکھ دیا شیر نے قربوس[2] پہ سر نہوڑا[3] کے
علی اکبر نے یہ حضرت سے کہا چلا کے ‌ (۱۲۲) ‌ گر ہو ارشاد تو مہماں کو سنبھالوں جا کے
خانہ زین[4] سے عدم کا سفری گرتا ہے ‌ ‌ ‌ خاک پر گھوڑے سے اب حُر جری گرتا ہے

شاہ رونے لگے یہ سنتے ہی مہماں کی خبر ‌ ‌ ‌ ہو گئی آنسوؤں سے ریش مبارک سب تر
علی اکبر سے کہا تم ابھی ٹھہرو دلبر ‌ (۱۲۳) ‌ حُر کی امداد کو ہم جائیں گے اے نور نظر
کس سے اس وقت کہوں میں جو قلق مجھ پر ہے ‌ ‌ ‌ لاش مہماں کی اُٹھاؤں گا کہ حق مجھ پر ہے

عرض کی حضرت عباس نے جاتا ہے غلام ‌ ‌ ‌ جوش رقت میں کہا شہ نے نہیں اے گل فام
میری الفت میں ہوا قتل حر نیک انجام ‌ (۱۲۴) ‌ دوست کیسے جو برے وقت میں ہم آئیں نہ کام
اُس پہ جب سخت گھڑی ہو گی تو کام آئیں گے ‌ ‌ ‌ لاش کیا قبر میں مہمان کی ہم جائیں گے

اس کے لاشے پہ نہ جائیں یہ مروت سے ہے دور ‌ ‌ ‌ اس سے ہم شاد ہوئے وہ بھی تو ہو کچھ مسرور
قصر خلد اس کو دکھائیں کہ ہوئے عفو قصور ‌ (۱۲۵) ‌ سرخرو جاتا ہے دنیا سے وہ خالق کے حضور
ایسا ذی رتبہ کوئی خلق میں کم نکلے گا ‌ ‌ ‌ میرے مہماں کا مری گود میں دم نکلے گا

یہ سخن کہہ کے چلے رن کو جناب شبیر ‌ ‌ ‌ واں گرا خاک پہ گھوڑے سے حُرِ با توقیر
دیکھ کر شاہ کو آتے ہوئے بھاگے بے پیر ‌ (۱۲۶) ‌ پہنچے لاشے پہ امام دو جہاں وقت اخیر
چمن ہستی مہماں کو اجڑتے دیکھا ‌ ‌ ‌ ایڑیاں خاک پہ زخمی کو رگڑتے دیکھا

---

[1] سر۔ ماتھا۔ [2] گھوڑے کی کاٹھی کا اگلا حصہ جو قوسی شکل میں ابھرا ہوا ہوتا ہے۔
[3] جھکا کے۔ سر جھکانے کے لیے انیس نہوڑانا اکثر لاتے ہیں۔ اب یہ لفظ متروک ہے۔
[4] زین کا درمیانی حصہ جہاں سوار بیٹھتا ہے۔

گر کے لاشے کے برابر یہ پکارے سرور
ہائے اے میرے مددگار و معین و یاور
گُرز کیا مجھ کو لگا ٹوٹ گئی میری کمر
(۱۲۷) گر پڑے گھوڑے سے اور آہ نہ کی مجھ کو خبر
دوست کے ہجر میں کس دوست کو چین آیا ہے
کھول دے آنکھوں کو بھائی کہ حسین آیا ہے

واہ اے حُر جری میں تری ہمت کے فدا
اس کو کہتے ہیں محبت اسے کہتے ہیں وفا
ہے یہ بیکس ترا شرمندۂ احساں بخدا
(۱۲۸) بس یہی بھائی بھی کرتے ہیں جو کچھ تو نے کیا
حق تعالیٰ یہ چمن خلد میں گھر دے بھائی
اس ریاضت کا خدا تجھ کو ثمر دے بھائی

حُر کو چونکا کے حبیب ابنِ مظاہر نے کہا
آپ بیتاب ہیں اے حُر جری ہوش میں آ
دیکھ دیدارِ جگر بندِ جناب زہرا
(۱۲۹) کوچ درپیش ہے یہ وقت نہیں غفلت کا
دم رکا ہے تو اشارے سے وصیت کر لے
نزع میں نور الٰہی کی زیارت کر لے

کس آقا نے کبھی کی ہے یہ توقیرِ غلام
دیکھ تو رحم ترے واسطے روتے ہیں امام
بھائی فرماتے ہیں شفقت سے شہ عرش مقام
(۱۳۰) اے خوشا حال خدا سب کا کرے نیک انجام
حشر تک خلق میں یہ ذکر غم انگیز رہا
تو تو بچپن[1] کے غلاموں سے بھی کچھ تیز رہا

نیم[2] وا چشم سے حُر نے رخ مولا دیکھا
زیر سر زانوے شبیر کا تکیا دیکھا
مسکرا کر طرف عالمِ بالا دیکھا
(۱۳۱) شہ نے فرمایا کہ اے حُر جری کیا دیکھا
عرض کی حسن رخ حور نظر آتا ہے
فرش سے عرش تلک نور نظر آتا ہے

باغ فردوس دکھاتا ہے مجھے اپنی بہار
صاف نہریں ہیں رواں جھوم رہے ہیں اشجار
شاخوں سے میری طرف بڑھتے ہیں میوے ہر بار
(۱۳۲) حوریں لاتی ہیں جواہر کے طبق بہر نثار
ہے یہ رضواں کی صدا دھیان کدھر تیرا ہے
دیکھ اے شاہ کے مہمان یہ گھر تیرا ہے

---

[1] حبیب ابن مظاہر نے خود اپنی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ امام حسینؑ کے ساتھ کھیلے ہوئے بچپن کے دوست تھے۔

[2] ادھ کھلی۔

مجھ کو لینے چلے آتے ہیں فرشتے یا شاہ
ملک الموت بھی کرتا ہے محبت کی نگاہ
خلد سے شیر خدا نکلے ہیں اللہ اللہ
لو برآمد ہوئے شبر بھی پدر کے ہمراہ (۱۴۳)
ننگے سر احمد مختار کی پیاری آئی
دیکھیے آپ نے نانا کی سواری آئی

قبلہ رو کیجیے لاشہ مرا اے قبلۂ دیں
پڑھیے یاسینؔ[1] کہ اب ہے یہ دم باز پسیں
کوچ نزدیک ہوا اے بادشہ عرش نشیں
لیجیے تن سے نکلتی ہے مری جانِ حزیں (۱۴۴)
بات بھی اب تو زباں سے نہیں کی جاتی ہے
کچھ اڑھا دیجیے مولا مجھے نیند[2] آتی ہے

کہہ کے یہ گود میں شبیر کی لی انگڑائی
آیا ماتھے پہ عرق چہرے پہ زردی چھائی
شہ نے فرمایا ہمیں چھوڑ چلے کیوں بھائی
چل بسے حر جری پھر نہ کچھ آواز آئی (۱۴۵)
طائر روح نے پرواز کی طوبیٰ کی طرف
پتلیاں رہ گئیں پھر کر شہ والا کی طرف

لاش اٹھا کر شہ دیں خیمے کے در پہ آئے
پاؤں بھائی کے سنبھالے علی اکبر آئے
غل ہوا خیمۂ اقدس میں کہ سرور آئے
پیچھے پردے کے حرم کھولے ہوئے سر آئے (۱۴۶)
دختر فاطمہ[3] سامان عزا کرنے لگی
فضہ[4] پردے کے ادھر آکے بکا کرنے لگی

بس انیسؔ اب یہ دعا مانگ کہ اے رب عباد
لکھنؤ کے طبقے کو تو سدا رکھ آباد
رونے والے شہ والا کے رہیں خلق میں شاد
ان کے سائے میں برومند ہو ان کی اولاد (۱۴۷)
عشرۂ[5] ماہ عزا نالہ کشی میں گزرے
سال بھر شہ کے غلاموں کو خوشی میں گزرے

---

۱ قرآن کا ایک سورہ جس کے پڑھنے سے نزع کی تکلیف کم ہو جاتی ہے۔ ۲ نیند آنے کے وقت ایک خاص طرح کا سرور حاصل ہوتا ہے۔ حر پر امام حسین کی نظر عنایت تھی اور وہ خدا کی راہ میں شہید ہوا تھا لہٰذا موت کی شدید تکلیف اس کے لیے نیند آنے کی لذت بن گئی۔ ۳ فاطمہ کی بیٹی۔ حضرت زینب۔

۴ حضرت فاطمہ کی کنیز خاص جو کربلا میں امام حسین کے ساتھ تھیں۔

۵ محرم کے مہینے کے ابتدائی دس دن، چونکہ محرم میں امام حسین کا غم کیا جاتا ہے اس لیے اس کو ماہِ عزا کہتے ہیں۔

مرثیہ (۲)

جاتی ہو کس شکوہ سے رن میں خدا کی فوج[1]
کمریں دعا پہ باندھے ہو مشکل کشا کی فوج
صف بستہ آگے پیچھے ہو سب پیشوا کی فوج
جنت کا رخ کیے ہے شہِ کربلا کی فوج
ڈیوڑھی پہ جن و انس و ملک کا ہجوم ہے
نیچے سے اب علم کے نکلنے کی دھوم ہے (۱)

حاضر ہیں صبح سے درِ دولت پہ جاں نثار
اک سو تھل لیے ہیں رفیقانِ ذی وقار
پیدل کھڑے ہیں سامنے باندھے ہوئے قطار
بیٹھے ہیں تخت زین پوش[2] بچھائے ہوئے سوار
شوقِ زیارتِ علمِ فوجِ شاہ ہے
ایک اک کی جانبِ درِ دولت نگاہ ہے (۲)

رخ ہے کسی کا جوشِ شجاعت سے لالہ رنگ
کوئی سنوارتا ہے بدن پر سلاحِ جنگ
جھک جھک کے چست کرتا ہو کوئی فرس کا تنگ
چلّے[3] سے جوڑتا ہو کوئی فاقہ کش خدنگ
بھالا سنبھالتا ہو کوئی جھوم جھوم کے
تکتا ہو کوئی تیغ کے قبضے کو چوم کے (۳)

---

[1] خدا کی راہ میں جہاد کرنے والی فوج [2] سچی تصویر۔ زین پوش بچھا کر اس پر بیٹھنا سواروں کا معمول تھا۔ پرانی کتابوں میں اس کا ذکر آتا ہے مثلاً "سپاہی پیشہ بھلے آدمی، چبوتروں پر اپنے اپنے زین بچھائے، حقے لگائے بیٹھے ہیں۔" (شیر علی افسوس: آرائشِ محفل، مطبع کالی پرشاد، لکھنؤ سنہ ۱۲۸۶ھ ص ۸) "یہ بھی دھوپ کا مارا ہوا تھا، گھوڑے کو ایک درخت سے باندھ کر زین پوش بچھا کر بیٹھ رہا۔"

(بیتال پچیسی، رام کمار پریس لکھنؤ، سنہ ۱۹۵۳ء ص ۵۴)

"ایک ندی کے کنارے پر پہنچا۔ اتر کر اپنے ہاتھ سے زین پوش بچھا کر، گھوڑے کو ایک جھنڈ سے باندھ بیٹھ رہا۔" (سنگھاسن بتیسی، رام کمار پریس، لکھنؤ، سنہ ۱۹۵۳ء، ص ۴۵)

"شام کو سب نے گھوڑوں کے تنگ ڈھیلے کر دیے، دانہ چڑھا، زین پوش بچھا کر بیٹھ گئے۔"

(قصصِ ہند مصنفہ آزاد۔ مفیدِ عام پریس، لاہور، سنہ ۱۹۲۱ء ص ۲۲)

[3] کمان کی ڈوری۔

(۴)

ملتا ہے ہنس کے ایک جواں ایک کے گلے
چہرے وہ سُرخ سُرخ وہ جرأت وہ ولولے
مرکز بھی لبیں لفتِ حیدر کی بوٹ ہے

ساری خوشی یہ ہے کہ بس اب خلد میں چلے
حق سے یہ التجا کہ نہ رن سے قدم ٹلے
پانی ہمیں ملے نہ ملے آبرو رہے

(۵)

حاضر ہے ذوالجناح شہنشاہِ بحر و بر
خادم چنور لیے ہیں مگس راں اِدھر اُدھر
گھوڑے سمند سرِ زوپیشاں کلیاتھ ہیں

کلغی ہو یا کہ خوشہ پرؔ[1] وین قریبِ سر
پیچھے ہیں باد پائے عزیزانِ نامور
پریوں کے غول تختِ سلیماںؔ[2] کیساتھ ہیں

(۶)

ڈیوڑھی پہ خادماتِ محل کی ہے یہ پکار
خلعت پہن رہے ہیں علمدار نامدار
بھائی بڑا ہی سر پہ تو سایا ہو باپ کا

آتے ہیں اب حضور خبردار ہوشیار
نذریں خوشی کی دینے کو حاضر ہوں جاں نثار
عہدہ جوان بیٹے نے پایا ہو باپ کا

(۷)

یہ سن کے شاد ہو گئی فوجِ حسین سب
بولے حبیب ابن مظاہر کہ شکرِ رب
سر دے کے لے بہشت کی جس کو تلاش ہو

آئے رفیق سب درِ دولت پہ باادب
ہاں سرفروشو جنگ جدل کا مزہ ہے اب[3]
دیکھیں علم کے سائے میں کس کس کی لاش ہو

(۸)

کون اور کائنات میں ہے دوسرا جواں
یا نورِ شاہِ دیں، جدِ مرتضیٰ کی جاں
باتیں پیمبروں کی خدا کے ولی میں تھیں

قابل اسی کے دوش مبارک کے تھا نشاں
پیروں کا سرپرست جوانوں کا قدرداں
سب اسمیں جمع ہیں صفتیں جو علی میں تھیں

---

[1] سات ستاروں کا ایک مجموعہ جو قطب کے گرد گردش کرتا ہے۔

[2] حضرت سلیمان کا تخت جو ہوا میں اڑتا تھا۔

[3] اب حسینی فوج میں حضرت عباس سب سے زیادہ دلیر اور فنِ جنگ کے سب سے بڑے ماہر تھے۔ اس لیے جب ان کو لشکر کا علم دیا گیا یعنی وہ فوج کے علمدار بنا دیے گئے، تو بہادر سپاہیوں کے لیے ان کی سرکردگی میں جنگ کرنے کا خیال نہایت دل خوش کن تھا۔

(۹)

الفت وہی حیا وہی مہر و وفا وہی
طاعت وہی وقار وہی اتقا وہی
بخشش وہی کرم وہی جود و سخا وہی
جرأت وہی جلال وہی دبدبا وہی
گیتی میں اور بھی کوئی ایسا دلیر ہے
خود تھا علی کا قول کہ عباس شیر ہے

(۱۰)

بے مثل سب ہیں قبلۂ عالم کے رشتہ دار
لیکن خدا نے اس کو دیا ہے عجب وقار
جیسے نبی کی فوج میں تھے شیر کردگار
ویسا ہی بے عدیل ہے یہ شہ کا جانثار
سب فوج سے بڑھا ہوا رتبہ اسی کا تھا
شیر خدا کے بعد یہ حصہ اسی کا تھا

(۱۱)

باہر تو اشتیاق علم میں ہے سب سپاہ
خیمے میں باندھتے ہیں کمر شاہ دیں پناہ
سب خویش و اقربا ہیں مسلح قریب شاہ
ہیں سامنے علم لیے عباس عرش جاہ
رتبے کو اوج نخلِ ترقی مراد پر
گویا علی کھڑے ہیں ہما جہاد پر

(۱۲)

شیر خدا کا خودِ مبارک ہے زیب سر
کلغی، ہمائے اوج سعادت کے جس میں پر
ماتھا ہے یا کہ ابر سے نکلا ہوا قمر
ابرو ہیں ذوالفقار یداللہ نامور
ڈوبے ہوئے جو سرخ ہیں چشم سیاہ میں
پھرتی ہیں خوں بھری ہوئی تیغیں نگاہ میں

(۱۳)

اس کی خوشی جو تھی کہ ملا رایت رسولؐ
رخسار تھے کھلے ہوئے دو ارغواں کے پھول
قد سرو باغ حسن نہ پستی فزوں نہ طول
وہ لب کہ جن سے روح کو ہو تازگی حصول
یہ شور[۱] تھا نمک کا جہاں کے رواق[۲] میں
حوریں بھی ہونٹ چاٹتی تھیں اشتیاق میں

---

[۱] 'شور' اور 'نمک' میں صنعت ایہام تناسب ہے۔
[۲] مکان۔ بارہ دری۔

(۱۴)
دیتے تھے تہنیت جو عزیز ان پر جگر — عباس مسکرا کے جھکاتے تھے اپنا سر
فرط طرب سے چاند سا چہرہ تھا جلوہ گر — رخ کی ضیا ادھر تھی علم کی چمک ادھر
وہ کہتے آسمان حشم ہو یہ کیواں جناب ہیں
غل تھا کہ ایک صبح میں دو آفتاب ہیں

(۱۵)
زینب بلائیں لے کے یہ کہتی تھیں بار بار — منصب مبارک اے شہ مرداں کے یادگار
کہتے تھے ہاتھ جوڑ کے عباس ذی وقار — مجھ کو سمجھیے عون و محمد کا جاں نثار
ان کی طرف سے ہمتم بندوبست ہوں
مالک یہ شاہزادے ہیں میں پیش دست ہوں

(۱۶)
فرماتی تھیں یہ دختر خاتون کائنات — دونوں کے تم بزرگ ہو یہ کون سی ہے بات
اس وقت ہے خوشی جو اس آفت سے ہو نجات — سمجھوں کہ بیکسوں کو دوبارہ ملی حیات
گھیرا ہے بے گناہ شہ مشرقین کو
تم سب شریک ہو کے بچا لو حسین کو

(۱۷)
سب خوش تھے خیمۂ شہ ذی جاہ میں مگر — چیں بر جبیں تھے زینب ناشاد کے پسر
نے جانب علم تھی نہ ماں کی طرف نظر — آنکھوں میں ڈبڈبائے تھے آنسو جھکے تھے سر
اس طرح تھا عرق رخ پر آب و تاب پر
جیسے پڑے ہوں قطرۂ شبنم گلاب پر

(۱۸)
پھر کر ادھر سے ماں نے جو بیٹوں پہ کی نظر — سمجھیں علم نہ ملنے سے بے دل ہیں یہ قمر
ہٹ کر کیا اشارہ کہ آؤ ذرا ادھر — آئے عقب سے شہ کے سعادت نشاں پسر
بولیں کہ اپنے ہوش نہ مجھ میں حواس ہیں
قربان جاؤں کیا ہے جو چہرے اداس ہیں

---

۱ اس سے حضرت عباس کی خوش مزاجی شرافت اور فروتنی ظاہر ہوتی ہے۔ بلند نگاہ اور عالی ظرف لوگوں کا خاصہ ہے کہ جتنا ان کا رتبہ بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی ان میں انکسار آتا جاتا ہے۔ ۲ 'وہ' کا اشارہ علم کی طرف اور 'یہ' کا حضرت عباس کی طرف ہے۔ ۳ کیواں ایک ستارے کا نام ہے جو بہت بلندی پر ہے۔ ساتویں آسمان کو بھی کہتے ہیں۔ ۴ جناب کے معنی ہیں دہلیز، چوکھٹ 'کیواں جناب' کے معنی ہوئے وہ جس کی چوکھٹ ساتویں آسمان یا کیواں ستارے کے برابر اونچی ہو جس کا مرتبہ بہت بلند ہو۔ ۵ ایک حضرت عباس کا نورانی چہرہ دوسرا چمکتا ہوا علم۔ ۶ مرداں یعنی بہادروں کے بادشاہ۔ مراد حضرت علیؑ۔ ۷ کارندہ، پیش کار، خادم۔ ۸ دنیا جہان کی ملکہ۔ مراد حضرت فاطمہ۔ ۹ کسی بزرگ کے سامنے سے گزرنا بے ادبی ہے۔ اس لیے عون و محمد امام حسینؑ کی پشت کی طرف سے گئے۔

ہتھیار سج چکے ہیں شہنشاہ حق شناس | تم نے نہ زیب جسم کیا فاخرہ لباس

(۱۹) مردوں کو جان دینے میں ہوتا نہیں ہراس | دولھا سے بن کے جاؤ امام امم کے پاس
کچھ ملگجے ہیں آؤ میں کپڑے اتار دوں | سرمہ لگا دوں گیسوئے مشکیں سنوار دوں

شب سے تو صبح تک یہ دعا تھی پھر ایک پل | تیغوں میں پہلے ہم کو کرے سرخرو اجل

(۲۰) اب کیا ہوا یہ کون سا غصے کا ہے محل | آنکھوں میں اشک رخ پہ عرق ابروؤں پہ بل
وہ خوش مزاجیاں وہ باتوں کے طور ہیں | اس وقت دیکھتی ہوں کہ تیور ہی اور ہیں

ماں پر یہ آفتیں ہیں یہ ماموں پہ ظلم و جور | پیارو ہمارے حال پہ لازم ہے تم کو غور

(۲۱) نازک مزاجیوں کے کسی دن نہ تھے یہ طور | اب مشورے ہیں اور تصور ہیں اور اور
وہ دل نہیں وہ آنکھ نہیں وہ نظر نہیں | اوروں کا ذکر کیا تمھیں میری خبر نہیں

اس کا نہیں خیال کہ کیونکر جیے گی ماں | ہوتا ہے آفتوں میں محبت کا امتحاں

(۲۲) تم میری دس برس کی ریاضت ہو میری جاں | مجھ سے سوا ہے کون تمھارا مزاج داں
جس پر یہ برہمی ہو وہ سب جانتی ہوں میں | غصے کی آنکھ کا ہے کو پہچانتی ہوں میں

پردہ ہے تو سناؤ الگ چل کے دل کا حال | دونوں نے عرض کی کہ نہیں کچھ نہیں ملال

(۲۳) ہاں آج ہم کو بھول گئے شاہ خوش خصال | اوروں کی پرورش ہے ہمارا نہیں خیال
کیا ورثہ دار جعفر طیار ہم نہ تھے | اس عہدۂ جلیل کے حقدار ہم نہ تھے

انگشت رکھ کے دانتوں میں ماں نے کہا کہ ہا | اب اس کا ذکر کیا ہے جو ہونا تھا ہو چکا

(۲۴) دیکھو سنیں نہ زوجۂ عباس با وفا | اچھا یہ ہے خوشی کی جگہ یا گلے کی جا
غبطہ نہ اس میں چاہیے جو امر خیر ہو | واری وہ کون غیر ہے تم کون غیر ہو

---

۱ کسی قدر میلے۔ ۲ دلے دلے پرشکن۔ ۳ ممانعت اور تنبیہ کا کلمہ۔
۴ برابری کی خواہش۔ رشک۔ یہاں حسد کے معنی میں آیا ہے۔
۵ میں تم پر صدقے۔ انتہائی محبت کا کلمہ۔ عورتوں کی زبان سے مخصوص۔

اک دوپہر کے واسطے ناحق یہ قیل و قال
تا عصر تم نہ ہوگے نہ عباس خوش خصال

(۲۵)
اس دن کی دے گئے ہیں خبر شیر ذوالجلال
مجھ کو نہیں یقیں کہ بچے فاطمہ کا لال
پیدا ہوئی ہوں اشک بہانے کے واسطے
رہ جاؤنگی میں قید میں جانے کے واسطے

لو اپنے [1] دودھ کی تمھیں دیتی ہوں میں قسم
اب کچھ کہو گے منھ سے تو ہوگا مجھے بھی غم

(۲۶)
سنتے [2] تھے تم جو کہتے تھے عباس ذی حشم
دو جا کے ان کو تہنیت عہدۂ علم
صدقے گئی خلاف ادب کچھ سخن نہ ہو
میری خوشی یہ ہے کہ جبیں پر شکن نہ ہو

کہنے میں ایک نے بھی اگر سن لیا یہ حال
کہتی ہوں صاف میں، مجھے ہوگا بہت ملال

(۲۷)
ننھے سے ہاتھ جوڑ کے بولے وہ نونہال
ہم بادفا غلام ہیں کیا تاب کیا مجال
دیجے سزا ہمیں جو بل ابرو پہ پھر پڑیں
کہیے تو چھوٹے ماموں کے قدموں پہ گر پڑیں

زینب بلائیں لے کے یہ بولیں کہ میں نثار
دونوں ہو تم سعید و رشید و وفا شعار

(۲۸)
دے ایسے لال سب کو زمانے میں کردگار
ذی قدر و ذی شعور و سخن فہم و ذی وقار
لازم خوشی ہے جو جسے عہدہ سپرد ہو
چھوٹوں کے تم بزرگ بزرگوں کے خورد ہو

پہنائے پیار سے انھیں پھر فاخرہ لباس
ہتھیار جب لگائے تو روئیں بدرد و یاس

(۲۹)
جب ان کو لے کے آئیں امام امم کے پاس
بولے گلے لگا کے انھیں شاہ حق شناس
دو چاند ہیں یہ خانۂ شیر الٰہ میں
زینب انھیں بھی بھیجوگی کیا قتل گاہ میں

نکلے نہیں ہیں گھر سے ابھی تک یہ گلبدن
تلوار اگر چلی تو پڑے [3] گا غضب کا رن

(۳۰)
فوجوں سے گونجتا ہے یہ سب کربلا کا بن
طالب ہیں ایک جان کے دو لاکھ تیغ زن
لشکر سے تیر کیں مری جانب جو آئیں گے
میں کس طرح جیونگا جو یہ زخم کھائیں گے

---

[1] ایشیائی تمدن کی رو سے دودھ پلانے کا حق سب سے زیادہ ہے۔ اس لیے سب سے بڑی قسم جو ماں اپنی اولاد کو دے سکتی ہے وہ اپنے دودھ کی قسم ہے۔ [2] اس مصرعے میں بند ۱۵ کی طرف اشارہ ہے۔
[3] رن پڑنا جنگ ہونا۔

بنت علی نے عرض یہ کی ہاتھ جوڑ کر
رکھتی نہیں کچھ اور میں یا شاہ بحر و بر
اک جان ہے بس اور یہ دو پارۂ جگر
(۳۱) مایہ مرا یہی یہی دولت یہی ہے زر
پالا ہو جس نے اس کا نہ کچھ حق ادا کرو
ان کو بچاؤں گر تو کسے پھر فدا کرو

اس کا نہ کیجے دھیان کہ یہ سن میں ہیں صغیر
دونوں نے بنت شیر خدا کا پیا ہے شیر
ہمت میں بے عدیل ہیں جرأت میں بے نظیر
(۳۲) سینہ سپر کریں گے یہ جس دم چلیں گے تیر
تلواریں چمکیں خون کے دریا چڑھے رہیں
امید ہو کہ سب سے یہ آگے بڑھے رہیں

حضرت کے آگے بات کی ان کو نہیں مجال
مخفی حضور پر ہو ارادوں کا ان کے حال
دادا کا رعب و دبدبہ و شوکت و جلال
(۳۳) تیغ و سپر میں ہو شہ مرداں کی چال ڈھال
کیجے نظر سنوں پہ تو بیشک صغیر ہیں
ہمت میں نوجواں ہیں متانت میں پیر ہیں

روتی تھی میں جو آج کی شب کو بہ درد و یاس
دونوں دلاسا دینے کو آ بیٹھے میرے پاس
رو کر کہا کہ آپ کو اتنا ہے کیوں ہراس
(۳۴) آسان کچھ ہے قتل شہنشاہ حق شناس
بچے ہیں شیر کے ہمیں بچا سمجھتی ہیں
کیا آپ ماموں جان کو تنہا سمجھتی ہیں

حضرت کے ساتھ فضل خدا سے ہیں دو دلیر
تھرا کے بھاگ جاتا ہے نعروں سے جن کے شیر
تا کوفہ کیا عجب ہے جو ہوں زخمیوں کے ڈھیر
(۳۵) کر دیں گے رستموں کو زبردستیوں سے زیر
کل شیر سب ہیں اور یہ دشت مصاف ہے
سن لیجئے گا آپ کہ میدان صاف ہے

بیکا ہو دشمنوں کا شہ دیں کے بال اگر
پھر کاٹ ڈالیے گا تنوں سے ہمارے سر
حضرت تک آ سکے کوئی کیا تاب کیا جگر
(۳۶) آنکھیں نکال لیں جو کرے غیظ سے نظر
پوتے شجاع کے ہیں نواسے دلیر کے
ساعد ہیں یہ علی کے یہ پنجے ہیں شیر کے

لاکھوں میں ذی حشم جواں نہیں اس آن بان کے
حافظ ہیں سب یہ آپ کے بھائی کی جان کے
حملے کریں گے رن میں جو سینوں کو تان کے
(۳۷) مل جائیں گے زمیں سے طبق آسمان کے
سو سو کی جان لے کے ہر اک جان کھوئے گا
ہم سب کے بعد ہوگا جو قسمت میں ہوگا

غالی نہ جائیں گے یہ شجاعت کے ولولے
رکھ دیں گے دوڑ دوڑ کے تیغوں پہ خود گلے
ہم بھی ہیں بنت فاطمہ کے شیر سے پلے
مرتے ہیں شوق میں کہیں تلوار تو چلے (۳۸)
چمکا کے نیمچوں کو جو کھیلیں گے جان پر
لاشے زمیں پہ ہونگے لہو آسمان[۱] پر

دونوں[۲] نے اس طرح بفصاحت کیا بیاں
مجھ کو یقین فتح ہوا یا شہ زماں
گویا دوبارہ آگئی میرے بدن میں جاں
خوش ہو کے بولی میں کہ تصدق ہو تم پہ ماں (۳۹)
محسن ہو آج جو مرے بھائی کی پرچ کرے
اس منھ کے میں نثار خدا اس کو سچ کرے

ہر بار دیکھتی ہوں میں ان کی طرف بغور
دو تین دن سے اور ہیں کچھ تیوروں کے طور
کہتے ہیں ناگوار ہیں اعدا کے ظلم و جور
تب چین ہو مٹے جو یزید لعیں کا دَور (۴۰)
سکّہ پڑے حسین علیہ السلام کا
خطبہ[۳] ہو ممبروں پہ شہ دیں کے نام کا

نو دس برس کے ہیں ابھی دونوں کا کیا ہے سن
راتیں یہ غفلتوں کی ہیں یہ کھیلنے کے دن
یہ تو وہ معرکہ ہے کہ ہیں مضطرب مسن
لیکن کنیز[۴] ان کی طرف سے ہے مطمئن (۴۱)
گھوڑے اڑا اڑا کے جو فوجوں پہ جائینگے
اتنا میں جانتی ہوں کہ جیتے نہ آئینگے

فرمایا شہ نے ان کی شجاعت میں فرق کیا
ہیں ورثہ دار شیر الٰہی یہ باوفا
اچھا ہمارے ساتھ چلے ایک دلربا
زینب تمھارے پاس رہے ایک مہ لقا (۴۲)
تم کس طرح جیو گی جو دونوں سے یاس ہو
گھر لٹتے وقت ایک تو فرزند پاس ہو

---

۱ تلوار سے جو خون اڑے گا وہ آسمان تک یعنی بہت بلندی تک پہنچے گا۔

۲ عون و محمد نے جس جوش، جرات، خلوص اور ذوق کے ساتھ گفتگو کی تھی اس کا اظہار اس سے بہتر پیرایے میں ناممکن ہے۔

۳ نماز جمعہ کے خطبے میں بادشاہ اسلام کا نام داخل کر دیا جاتا تھا اس لیے کسی کے نام کا خطبہ ہونا اس کا بادشاہ اسلام ہونا تسلیم کیا جاتا تھا۔

۴ حضرت زینب امام حسین سے گفتگو کرتی ہیں خود کو انکسار سے کنیز کہتی ہیں۔

(۴۳)
زینب نے عرض کی کہ مجھے ہے یہ آرزو　　دونوں نثار آپ پہ ہوں میرے روبرو
بچ جائے جان آپ کی یا شاہ نیک خو　　میں طالب ثواب یہ خواہان آبرو
بہتر ہے دونوں بیٹوں کی گر سوگوار ہوں[1]　　میں بھی جناب فاطمہ کی ورثہ دار ہوں

(۴۴)
طفلی سے آج تک نہ ہوئے یہ کبھی جدا　　کھیلے تو ایک گھر میں پلے یہ تو ایک جا
بچہ بچہ ہو سارے کنبے میں دونوں کے پیار کا　　بیشک ہیں ایک جان و دو قالب یہ مہ لقا
تڑپے وہ باپ کو جو خفا ہو کے بھائی سے　　وہ کس طرح جیے گا جدا ہو کے بھائی سے

(۴۵)
دم بھر مفارقت ہو تو آنسو بہاتے ہیں　　رونے ہیں اس طرح کہ مجھے بھی رلاتے ہیں
دونوں جب ایک جا ہوں تو کھانا یہ کھاتے ہیں　　مکتب میں ساتھ جاتے ہیں اور ساتھ آتے ہیں
بھائی جو زخم نیزہ و شمشیر کھائے گا　　انصاف آپ کیجئے یہ مر نہ جائے گا

(۴۶)
چھوٹا تنک مزاج ہے یا شاہ بحر و بر　　سن لے تو جان دیدے گلا اپنا کاٹ کر
نو دس برس جہاں میں ہوے جس طرح بسر　　باہم یونہیں جہاں سے کریں آخری سفر
ہر جا بڑے کے ہاتھ میں چھوٹے کا ہاتھ ہو　　میں چاہتی ہوں دونوں کا مرنا بھی ساتھ ہو

(۴۷)
باپ ان کا آج ہوتا جو یا شاہ نامدار　　کرتا قدم پہ سر کو تصدق باافتخار
ایک انکے بدلے آپ کے قدموں پہ ہو نثار　　میرے عوض فدا کرے لیک اپنی جان زار
ان پر ہمارا حق ہو تو ہم پر حق آپ کا　　یہ بھی تو کچھ ادا کریں حق اپنے باپ کا

(۴۸)
کرتے تھے مجھ سے وقت سفر رو کے یہ بیاں　　محروم اس شرف سے ہوں میں زار و ناتواں
بچوں کا ساتھ اور سفر خوف الاماں[2]　　مجبور دشمنوں میں چلے ہیں شہ زماں
وقت آپڑے تو پاس ہمارا نہ کیجیو　　بیٹوں کو تم حسینؑ سے پیارا نہ کیجیو

---

[1] میری ماں فاطمہ کے دو بیٹوں نے انتقال کیا۔ میں بھی ان کی وارث ہوں اس لیے مجھ کو بھی دو بیٹوں کی موت کا غم اٹھانا چاہیئے۔

[2] پناہ۔ خدا کی پناہ۔ اس کلمے سے دلی خوف کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔

گردن جھکا کے کہنے لگے شاہ خاص و عام
تم کو جہاں میں پھر نہ ملیں گے یہ لالہ فام
(۴۹) ملتی ہے نسل جعفر طیار نیک نام
چھاتی سے سر لگا کے وہ بولی کہ یا امام
للہ ان کے باب میں اب کد نہ کیجئے
ہدیہ فقیر کا ہے اسے رد نہ کیجئے

چپ رہ گئے بہن سے بہت خوب کہہ کے شاہ
قاسم نے کی یہ عرض کہ یا شاہ دیں پناہ
(۵۰) بڑھ آئی ہو ادھر سے بہت شام کی سپاہ
فرمایا آپ نے کہ نگہبان ہے اللہ
حملوں[1] سے فوج شام کے جی چھوٹ جائیں گے
جب ہم بڑھے تو سوچیے سب ٹوٹ جائیں گے

زینب کے نور عین بڑھے جب بصد حشم
کھولا سروں پہ حضرت عباس نے علم
(۵۱) ماں کا اشارہ تھا کہ نہ ہے شفقت و کرم
ہاتھوں کو جوڑو جلد جھکو چوم لو قدم
کچھ حد ہو اس بزرگی و جاہ و جلال کی
دیکھیں نہ اذیتیں شہ مرداں کے لال کی

لے کر بلائیں بھائی کی بولی وہ سوگوار
اپنے غلام سمجھو انھیں تم پہ ہیں نثار
(۵۲) پہلے پہل نکلتے ہیں گھر سے یہ گل عذار
ان کی مدد ضرور ہو ہنگام کارزار
صدمے سے جان اب نہیں زہرا کی جائی ہیں
دھڑکا یہ ہے کہ دیکھئے کیا ہو لڑائی میں

سیر آب ادھر ہیں سب انھیں سولہ پہر کی پیاس
کیا ہو جو نہر دیکھ کے ہو جائیں بے حواس
(۵۳) پشتی پہ جب ہو شیر تو بیجا ہے پھر ہراس
رہیو نہ دور[2] ان سے اگر ہے بہن کا پاس
بچے کہاں یہ اور وہ دل فوج شام کا
بھیا مجھے ہو دھیان نہ ننگ و نام کا

زندوں میں آؤں میں جو یہ مقتل سے مر کے آئیں
کنبے میں سرخرو ہوں اگر خوں میں بھر کے آئیں
(۵۴) الٹیں بہادروں کی صفیں نام کر کے آئیں
خیمے میں آئیں اب تو جہاں سے گزر کے آئیں
بھیا مجھے قسم ہے جناب امیرؑ کی
پانی[3] پیا تو بوند نہ بخشوں گی شیر کی

---

[1] ہمارے حملوں سے۔ [2] دور اور پاس میں ایہام تناسب ہے۔ [3] دودھ پلانے کا حق اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ اس کی ادائی محال ہے۔ اس لیے ماں اپنی اولاد کے مرتے وقت اپنے اس حق کو معاف کر دیتی ہے اسی کو دودھ بخشنا کہتے ہیں۔ دودھ نہ بخشنا ماں کی انتہائی ناراضی کی علامت ہے۔

(۵۵)
عباس نے کہا یہ نہ فرمائیے حضور
بچے کسی نے دیکھے ہیں اس طرح کے غیور
ایسے یہ شیر ہیں کہ وغا میں کریں قصور[1]
کوفے کو شام پر جو الٹ دیں تو کیا ہے دور
بچپن میں کافروں سے خدا کے ولی لڑے
یہ یوں لڑیں گے جیسے اُحد[2] میں علی لڑے

(۵۶)
ہے سب عرب میں لیث بنی غالب[3] اُن کا جد
مثل علی وغا میں کریں گے یہ جد و کد
جس دم رجز[4] پڑھیں گے یہ صفدر بہ شد و مد[5]
غل ہوگا گونجتے ہیں لڑائی میں دو اسد
یہ پارۂ جگر ہیں علی سے دلیر کے
سب کھیلتے ہیں شیر کے بچوں میں شیر کے

(۵۷)
کچھ فکر کی جگہ نہ تردد کا ہے مقام
سن لیجیے گا آج یہ جیسے کریں گے نام
ان سے کبھی جدا نہیں رہنے کا یہ غلام
میں عبد سرفروش ہوں اے خواہر امام
بندوں کا حفظ خالق عالم کے ہاتھ ہے
روتی ہیں آپ کیوں مری جان انکے ساتھ ہے

(۵۸)
یہ سن کے مضطرب جو پھری وہ جگر فگار
دیکھا بڑھے ہیں جانب در شاہ نامدار
پھیلا کے ہاتھ کہنے لگے شاہ ذی وقار
زینب گلے سے بھائی کے لپٹو پھر ایک بار
جو حال دل ہو کہہ نہیں سکتا زباں سے میں
چھٹتی نہیں تم آج بچھڑتا ہوں ماں سے میں

(۵۹)
بھائی بہن کے درد کی باتیں لکھوں اگر
بہ جائے آب ہو کے جو پتھر کا ہو جگر
چھاتی سے سر لگائے ہوئے تھی وہ نوحہ گر
رکھے ہوئے تھے دوش پہ منھ شاہ بحر و بر
غم سے جگر لہو تھا شہ مشرقین کا
سیدانیوں میں شور تھا ہے ہے حسینؑ کا

---

[1] کمی۔ [2] اُحد مدینے کے قریب ایک پہاڑ ہے جس کے قریب ۳ھ میں مسلمانوں اور کافروں میں سخت جنگ ہوئی تھی۔ [3] 'لیث' عربی میں شیر کو کہتے ہیں اور 'بنی غالب' کے معنی ہیں غالب کی اولاد۔ لیث بنی غالب' کے معنی ہوئے غالب کے خاندان کا شیر۔ مراد حضرت علی۔ غالب حضرت علی کے ایک بزرگ کا نام ہے۔ ان سے حضرت علی تک گیارہ پشتیں ہوتی ہیں۔
[4] وہ فخریہ اشعار جو سپاہی میدان جنگ میں پڑھتے تھے۔
[5] آواز کا چڑھاؤ اور کھنچاؤ۔ زور و شور۔

بنتِ علی کے پیچھے تھی سیدانیوں کی صف
غل تھا مدد کو آئیے اب یا شہِ نجف
(۶۰) لڑیاں[۱] تھیں چار ایک ہی اشکوں کی دو طرف
شہ کہتے تھے بہن نہ کرو جان کو تلف
غربت میں اور کوئی نہ یاور[۲] نہ عون ہے
تم مر گئیں تو پھر مرے بچوں کا کون ہے

فرما کے یہ بڑھا پسرِ ختمِ مرسلین
مشکل تھا ضبط غش ہوئی وہ بیکسِ حزیں
(۶۱) ماتم کی صف پہ بیبیاں زینب کو لے گئیں
خیمے سے نکلے روتے ہوئے بادشاہِ دیں
دامن علم کا کھول کے عباس رک گئے
صف باندھ کر سلام کو مجرائی[۳] جھک گئے

سب فوج کو سلام کا جب دے چکے جواب
بس جانبِ فرس متوجہ ہوئے جناب
(۶۲) روح الامیں[۴] نے دی یہ صدا تھام کر رکاب
بسم اللہ[۵] اے خدیوِ زماں مالک الرقاب[۶]
نورِ محمدی رخِ انور کی ضو میں ہے
شوکت تری رکاب میں نصرت جلو میں ہے

اس شان سے فرس پہ شہِ انس و جن چڑھے
جس طرح نکلے ابر سے خورشید دن چڑھے
(۶۳) بہرِ جہاد راہِ خدا مطمئن چڑھے
گھوڑوں پہ نوجوانوں سے پہلے مسن چڑھے
سب جاں فشاں سوار تھے راہِ ثواب میں
پیدل مگر تھے ابن مظاہر[۷] رکاب میں

---

۱ یعنی امام حسین اور حضرت زینب دونوں زار زار رو رہے تھے۔ اس لیے آنسوؤں کی چار لڑیاں بن گئی تھیں۔ چار۔ ایک۔ دو میں صنعت سیاق الاعداد ہے۔ ۲ مددگار۔

۳ سلام کرنے والے۔ درباری۔ ۴ امانت دار فرشتہ۔ مراد جبریل۔

۵ بسم اللہ کے معنی ہیں اللہ کے نام سے (شروع کرتا ہوں) جب کوئی کام شروع کرتے ہیں یا کسی معزز آدمی سے کسی کام کی ابتدا کرنے کو کہتے ہیں تو یہ فقرہ بولتے ہیں۔

۶ گردنوں کا مالک۔ جانوں کا مالک۔ غلاموں کا آقا۔ وہ جس کو ہر طرح کا اختیار حاصل ہو۔ رقاب، جمع ہے 'رقبہ' کی۔ جس کے معنی ہیں گردن۔

۷ مظاہر کا بیٹا۔ امام حسین کے بچپن کے دوست حبیب ابن مظاہر۔

بڑھتا تھا خون جوشِ شجاعت سے دمبدم — گردن میں وہ کجی تھی نہ مطلق کمر میں خم
ہر نوجواں سے تھا یہ اشارہ بصد حشم — (۶۴) یعنی یہاں سے جائیں گے سیدھے[1] جناں میں ہم
بر میں زرہ کمانِ کیانی[2] تھی دوش پر — قبضے[3] پہ ایک ہاتھ تھا اک زین پوش پر

ابرو جھکے ہوئے تھے جو پڑتے تھے پلکوں پہ بار بار — رومال پھاڑ کر انھیں باندھا تھا استوار
آنکھوں سے شیرِ نر کی جلالت تھی آشکار — (۶۵) گویا کہ[4] تھی غلاف میں حیدر کی ذوالفقار
جلدی چلے جو چند قدم جھوم جھوم کے — رعشہ وداع ہو گیا ہاتھوں کو چوم کے

اک شور تھا کہ عود کیا پھر شباب نے — یا کی دعا حبیب کے حق میں جناب نے
ریشِ سفید رُخ پہ سیہ کی خضاب نے — (۶۶) پائی یہ آب و تاب کہاں آفتاب نے
لبریز نور سینۂ بے کینہ ہو گیا — یوں جھریاں مٹیں کہ تن آئینہ ہو گیا

کہتے تھے باگ روکے ہوئے شاہِ نامدار — یہ کس لیے پیادہ روی اے نحیف و زار
میں بھی اتر پڑوں گا نہ ہو گے جو تم سوار — (۶۷) کرتے تھے عرض یہ کہ توانا ہے جاں نثار
ہر چند پیر خستہ دل و ناتواں شدم — ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

---

[1] اس کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ بغیر کہیں ٹھہرے ہوئے - دوسرے یہ کہ سیدھے قد کے ساتھ بہشت میں ہر شخص جوان ہو کر جائے گا اس لیے بوڑھوں کی کمر کے خم دور ہو کر ان کا قد بھی سیدھا ہو جائے گا۔ اس جملے سے دو معنی نکلتے ہیں اور دونوں ٹھیک ہیں - یہ ایک صنعت ہے جس کو 'ادماج' کہتے ہیں۔

[2] کیان جمع ہے کَے کی جس کے معنی ہیں بادشاہ۔ ایران کا ایک شاہی خاندان جس کے تمام بادشاہوں کے ناموں کے ساتھ کَے کا لفظ لگا ہوا تھا جیسے کیکاؤس، کیقباد۔ کمان کیانی کے معنی ہوئے - بادشاہوں کے قابل کمان یعنی بہت اعلیٰ درجے کی کمان [3] تلوار کا قبضہ مراد ہے۔

[4] حبیب ابن مظاہر کی آنکھیں دشمنوں کے لیے نہایت خوفناک تھیں - یہاں تک کہ بڑھاپے میں جب بھویں لٹک کر آنکھوں پر آ گئیں تو بھی ان میں اتنی ہیبت باقی رہی جتنی ذوالفقار میں میان کے اندر ہونے کی حالت میں ہوتی تھی - اگر بڑھاپے نے یہ غلاف نہ چڑھا دیا ہوتا تو ان میں وہ ہیبت ہوتی جو ذوالفقار میں اس وقت ہوتی تھی جب وہ میدانِ جنگ میں میان سے باہر حضرت علی کے ہاتھ میں بلند ہوتی تھی۔

فرمایا تم کو دیتا ہوں اس سر کی میں قسم — جو بعد عصر تیغ سے ہو جائے گا قلم

(۶۸)
میں بھی نکالتا ہوں رکابوں سے اب قدم — اچھا تمھارے ساتھ پیادہ چلیں گے ہم
پہنچیں جناں میں ہجر مصیبت کو جھیل کے — ہم تم تو ایک گھر میں پلے ساتھ کھیل کے
وہ لوٹنا[1] بھی خاک کا اب تک ہے یادگار — تم پر بھی گرد تھی مری زلفوں پہ بھی غبار

(۶۹)
دس روز تم پہ مجھ سے سوا تھا نبی کا پیار — فرماتے تھے یہ ہے مرے پیارے کا دوست دار
شبیرؑ کے حبیب کو پہچانتا ہوں میں — لوٹے گا یہ لہو میں یونہیں جانتا ہوں میں
رو کر کہا حبیب نے آخر ہوا وہ دور — اب اُن کا عہد ہے کہ جو ہیں حاکمانِ جور

(۷۰)
یہ وقت اور کچھ ہے وہ ہنگام تھا کچھ اور — مولا کبھی رہا نہیں دنیا کا ایک طور
گردش نئی فلک کی نئے انقلاب ہیں — کوثر ہے جن کا آج وہ محتاجِ آب ہیں
یہ عرض کر کے رہ گئے حبیب وفا شعار — جھک کر کہا یہ پیر غلام آپ کے نثار

(۷۱)
جب تک سمند پر وہ دلاور ہو اسوار — رو کے رہے لجامِ فرس شاہِ نامدار
ہر دوست پر پدر سے زیادہ شفیق تھے — کیا قدرداں وہ شاہ تھا اور کیا رفیق تھے
بس چھیڑ کر فرس کو امامِ زماں بڑھے — آگے جو تھے رکے ہوئے وہ سب جواں بڑھے

(۷۲)
کاندھوں پہ رکھ کے نیزوں کو شیرِ ژیاں بڑھے — مشتاقِ تیغ و خنجر و تیر و سناں بڑھے
یوں طے کیا دلیروں نے اس راہِ خیر کو — جاتا ہے جس طرح کوئی گلشن کی سیر کو
بشاش قتل گاہ میں پہنچے جو وہ دلیر — نیزوں کو گاڑ گاڑ کے گونجے مثالِ شیر

(۷۳)
نعرہ یہ تھا کہ کیجیو ان سرکشوں کو زیر — عرصہ نہ جنگ میں ہو نہ فتح و ظفر میں دیر
تیغوں سے روم و شام کی بستی اجاڑ دو — کوفے کے در پہ جا کے نشانوں کو گاڑ دو

دشمن کی رزم پہ بچوں سے امامِ زماں بڑھے
کس شان سے جلو میں حسینی جواں بڑھے

---

[1] بچپن کے ایک واقعے کی طرف اشارہ ہے۔

(۴۴)
حد سے فزوں تھی کثرت فوج ستم شعار — لکھی ہے راویوں نے چھ لاکھ اور دس ہزار
پیدل تھے بے حساب تو تھے لاتعد[1] سوار — فوجوں کا دست چپ[2] سے بھی ممکن نہ تھا شمار
پیک خیال جا کے پھر آتا تھا راہ سے — پنہاں تھی کربلا کی زمیں سب نگاہ سے

(۴۵)
اکناف[3] بر و بحر میں لشکر کا تھا مقام — سہل[4] و جبل بھرے ہوئے تھے فوج سے تمام
ناکوں پہ چوکیاں[5] تھیں جزیروں میں اہتمام — مسدود ہو گئی تھی سبیل[6] خط و پیام
آیا کبوتر اڑ کے جدھر صید ہو گیا — قاصد جہاں ملا وہ وہیں قید ہو گیا

(۴۶)
ظاہر ہوئی سپاہی[7] لشکر سے دن کو رات — وہ کشمکش کہ موت کے طالب تھے ذی حیات
دنیا پرست دشمن سادات نیک ذات — مقتل سے کوفے تک تھے تشون[8] زبوں صفات
دریا کے صرف آب سے لب خشک ہو گئے — جتنے کنوئیں تھے راہ میں سب خشک ہو گئے

(۴۷)
دنیا میں نیک کم ہیں بہت اور بد ہزار — لکھا ہے فوج شہ کا کتابوں میں یہ شمار
چالیس کل پیادے تھے بتیس سب سوار — طفل ان میں تھے کئی سمن اندام و گلعذار
بوٹا سے قد تھے ایک بھی ان میں جواں نہ تھا — سبزہ بھی جس کے گورے رخوں پر عیاں نہ تھا

(۴۸)
بچوں میں سبزہ رنگ کوئی تھا کوئی صبیح — شیریں سخن لبوں میں نمک رنگتیں ملیح
چاہیں لبوں کو ان کی جو باتیں سنیں فصیح — مُردوں کو دم میں زندہ کریں صورت مسیح
جدّ و پدر کی طرح جری ہیں دلیر ہیں — بچّے ہیں یوں پہ غیظ جب آئے تو شیر ہیں

---

[1] بے گنتی بے شمار۔ [2] حساب کا ایک طریقہ 'عقد انامل' ہے جس میں ہاتھوں کی بعض انگلیاں جھکانے اور سیدھی کرنے سے مختلف عدد بن جاتے ہیں، داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے اکائیاں اور دہائیاں اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے سیکڑے اور ہزار بنتے ہیں اس لیے اس مصرعے کا مفہوم یہ ہوا کہ یزیدی لشکر کے سپاہیوں کی تعداد سیکڑوں اور ہزاروں سے متجاوز تھی، دست چپ سے شمار کرنا کثرت تعداد کو ظاہر کرنا ہے۔ مثلاً

عاشق بکشی بہ تیغ غمزہ — چنداں کہ بدست چپ شماری — (خاقانی)
نہ بود درست چنیں کہ فرسخ شمار — بر نجا نداند ز شمردن بسیار — (غالب)

[3] کنف کی جمع ہے۔ طرف، کنارہ [4] نرم اور ہموار زمین۔ میدان [5] پہرے [6] راہ۔ ذریعہ طریقہ۔ [7] فوجوں کا مجمع [8] لشکر، سپاہی۔ یہ ترکی لفظ ہے۔

وہ نیچے ہلال کے دم خم پہ جن کو فوق — جرأت کا جوش تیغ زنی کا دلوں میں شوق
ہنس ہنس کے زخم کھائیں تو باتوں کو اس کا ذوق — (۷۹) گیسو نہ کانوں میں بُندے گلوں میں طوق
آنکھیں جو نرگسی ہیں تو رخ بھولے بھالے ہیں — نازوں کے منتوں کے مرادوں کے پالے ہیں

ایک ایک خوش بیاں تو ہر اک نکتہ سنج ہے — کچھ پیاس کا نہ غم ہے نہ فاقوں کا رنج ہے
لشکر ہے وہ کہ حسن کی دولت کا گنج ہے — (۸۰) چہرہ ہر اک کا ماہ چہار[1] و دو پنج ہے
انگڑائیاں جو لیتے ہیں سینوں کو تان کے — کہتا ہے حسن خود کہ نثار ان کی شان کے

کم گو کوئی متین کوئی شیریں سخن کوئی — بچپن میں سرو قد کوئی رشک چمن کوئی
نازک مزاج کوئی تو گل پیرہن کوئی — (۸۱) تصویر جد کوئی تو شبیہ حسن کوئی
دولت یہی حسین کے حصے میں آئی تھی — مایہ تھا فاطمہ کا علیؑ کی کمائی تھی

شیران دشت کو جگرا ایسے نہیں ملے — غواص[2] کو کبھی گہر ایسے نہیں ملے
حمزہ کو جنگ کے ہنر ایسے نہیں ملے — (۸۲) جعفر نے پائے بال[3] پر ایسے نہیں ملے
جو تھا نبی کے بعد خدا کے ولی کا تھا — حضرت کو وہ ملا کہ جو حصہ علی کا تھا

پہلے پہل جو نکلے تھے گھر سے وہ گل عذار — تیغیں چمکتی دیکھ کے بڑھتے تھے بار بار
فرماتے تھے یہ روک کے عباس نامدار — (۸۳) ٹھیرو ابھی نہیں ہے تمھیں حکم کارزار
حجت[4] تمام کی نہیں شاہ غیور نے — سبقت نہ کیجو منع کیا ہے حضور نے

عجلت کو جانتے ہیں سبک جو ہیں بردبار — بے وقت دوڑتے نہیں ذی قدر ذی وقار
دیکھو تماشا فوج کی کثرت ہے بے شمار — (۸۴) باجے بجا کے کھولیں گے رایت[5] ستم شعار
جلدی نہ کیجو گو کہ لڑائی میں دیر ہو — تم تو خدا کے شیر کے شیروں کے شیر ہو

---

[1] چار اور دو پنجے چودہ ہوئے۔ اس لیے اس فقرے کے معنی ہوئے چودھویں رات کا چاند۔
[2] غوطہ خور۔ [3] بال اور پر میں ایہام تناسب ہے۔ [4] حجت تمام کرنا۔ کسی عذر یا حیلے کی گنجائش باقی نہ رکھنا۔ [5] نشان۔ جھنڈا۔ علم۔

دستِ ادب کو جوڑ کے بولے وہ نیک نام — کردیجئے ہمیں علی اکبر کے پالے[1] نام
بیٹے سے مسکرا کے یہ کہنے لگے امام — عاشق تمہارے نام کے ہیں یہ فلک مقام
بیٹا یہ سن میں چھوٹے ہیں سب میں بڑے ہو تم — اچھا صف ابھی باندھ کے آگے کھڑے ہو تم
(۸۵)

بکھرے ہوئے ہیں شیر خبردار ہوشیار — کوئی بڑھانے پائے نہ اس صف سے راہوار
عجلت ہر ایک امر میں بچوں کا ہے شعار — بہلا کے روکے رہیو انھیں تم پہ ہیں نثار
جاں اپنی سب دیئے ہیں بزرگوں کے نام پر — گھوڑے اڑا کے جا نہ پڑیں فوجِ شام پر
(۸۶)

تسلیم کرکے شہ کو مرتب جو کی وہ صف — سب جن لڑی میں تھے گہرِ قلزمِ شرف
فرقت میں جن کی چاک رہا سینۂ صدف — زہرا کے رشتہ دار یداللہ کے خلف
ان سے کسے جہان میں عشقِ دلی نہیں — اب تک وہ آبرو تو کسی کو ملی نہیں
(۸۷)

شرمندہ جس سے چاند ہو چہرے وہ تابناک — دل بلبلوں کے خوں تو گریباں گلوں کے چاک
خود وادی السلام[2] جو چھانے نجف کی خاک — ایسے کبھی ملیں نہ گہر ایسے صاف و پاک
تسبیح ہاتھ آئی یہ کس نیک نام کو — دُرِ نجف تھے وہ جو ملے تھے امام کو
(۸۸)

شیرِ خدا کے سات جگر بند نامدار — دونوں نواسے حضرت زینب کے گل عذار
پوتے چچوؤں وحیدِ زماں فخرِ روزگار — یکتائے دہر پانچ بھتیجے فلک وقار
خود جس کی فرع واصلِ علی و رسول تھے — یہ سب اسی درخت کی شاخوں کے پھول تھے
(۸۹)

یوسف تھے ایک مصر میں اور مشتری[3] ہزار — کیفیت و کم[4] ثمن[5] ہے کتابوں سے آشکار
یوسف سے کربلا میں تھے اٹھارہ گل عذار — عالم کی جان فخرِ حسینانِ روزگار
یاں منزلت بھی قدر بھی قیمت بھی موت تھی — زہرا کے یوسفوں کی خریدار موت تھی
(۹۰)

---

۱ پالے نام کردیجئے، یعنی ماتحتی میں دے دیجئے۔

۲ نواحِ نجف میں ایک وسیع میدان جس کی خاک میں زائر دُرِ نجف ڈھونڈھتے ہیں۔ اس میدان میں کئی پیغمبروں کے مزار ہیں اس لیے وہاں دفن ہونا باعثِ نجات سمجھا جاتا ہے۔

۳ خریدار

۴ نوعیت اور مقدار

۵ قیمت

(۹۱)

تیغ و ترنج[1] اگر ہوں ہلال اور آفتاب
سرکاؤں چہرۂ علی اکبر سے پھر نقاب
حوریں گلوں کو کاٹ کے تڑپیں رہے نہ تاب
گر دیکھتیں وہ حسن ملیح اور وہ شباب
پریاں تو انکے سائے کا پیچھا نہ چھوڑتیں
دامن کبھی جناب زلیخا نہ چھوڑتیں

(۹۲)

ناگہ نشاں بڑھائے اُدھر کی سپاہ نے
کھولا ادھر علم کو علمدار شاہ نے
چوما نشاں کو بڑھ کے ہر اک خیر خواہ نے
طوبیٰ[2] لکم کہا شہ عالم پناہ[3] نے
رفعت بڑھی زمین سعادت سرشت کی
ٹھنڈی ہوا ادھر سے آئی بہشت کی

(۹۳)

رایت وہ سبز لشکر سادات کا نشاں
پنجہ[4] مثال پنجۂ خورشید زر فشاں
دامان پاک کشتی امت کا بادباں
پرچم[5] تھا بال کھولے تھی یا حوری جناں
مشک و عبیر و عود کا بازار سرد تھا
مٹی کا عطر خاک کی خوشبو سے گرد تھا

(۹۴)

نقارۂ دغا پہ لگی چوب ناگہاں
گردون[6] دوں سے پار ہوئی طبل کی فغاں
شیپور[7] کے غریو سے ہلتا تھا آسماں
وہ بوق[8] کی ہیبت صدا اٹھی کہ الاماں
نیزوں کو ہر سوار اُدھر تولنے لگا
گونجے ادھر بھی شیر کہ رن بولنے لگا

---

[1] چھری اور لیموں ۔ اس بند میں حضرت یوسف اور زلیخا کے قصے کی طرف اشارہ ہے۔
[2] تمہارے لیے بہتری یا خوشحالی ہے ۔ یہ ایک طرح کی دعا ہے۔
[3] دنیا کو پناہ دینے والا بادشاہ ۔ مراد امام حسین
[4] پیغمبر عرب کا فوجی نشان فولادی پنجہ تھا جو علم پر لگا رہتا تھا۔
[5] سیاہ ریشم کا لچھا جو علم کے پنجے کے نیچے باندھا جاتا ہے۔
[6] "دون" "دوں" کی تکرار سے طبل کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس صنعت کو ایہام صوت کہتے ہیں۔
[7] [illegible]
[8] [illegible] سے پھونک کر بجائے جانے والے فوجی باجے۔

شہنا کا شور سن کے لرزتا تھا بند بند — برچھے ہلے رسالوں میں تیغے ہوئے بلند
صحرا[1]ئے ہولناک کی وحشت ہوئی دوچند (۹۵) — ڈر کر کنوتیوں کو بدلنے لگے سمند
سن کر دہل[2] کا شور کلیجے دہل گئے — صحرا سے دب کے شیر نیستاں نکل گئے

پیاسوں پہ جب اُدھر سے چلے تیر بے شمار — مولا نے غازیوں کو دیا حکم کارزار
نکلے وغا کو قبلۂ عالم کے جاں نثار (۹۶) — جن کی شجاعتیں ہیں زمانے میں یادگار
ہوں گے نہ ہیں نہ ایسے کبھی باوفا ہوئے — سب جان دے کے حق نمک سے ادا ہوئے

حُر و بُریر و وہب و عمیر فلک مقام — وہ مسلم ابن عوسجۂ عرش احتشام
سعد و زہیر[3] قین و حبیب خجستہ کام (۹۷) — وہ شیر جس کا بو عمر نہشلی تھا نام
جس غول پر جھپٹ کے یہ آئے وہ ہٹ گیا — ایک ایک مرتے مرتے پروں کو الٹ گیا

نکلے وغا کو ایلچی[4] شاہ کے پسر — ماتم میں تھے کہ تھا ابھی تازہ غم پدر
فوجوں پہ حملہ ور ہوئے جس دم وہ شیر نر (۹۸) — دم میں تنوں سے کٹ کے گرے کوفیوں کے سر
رن پر چڑھے جو سوگ کے کپڑے اتار کے — مارے گئے وہ شیر ہزاروں کو مار کے

لاشوں کو قتل گاہ سے لے آئے جب حسینؑ — نکلے پرے سے حضرت زینب کے نورِ عین
کی عرض یا امام زماں شاہ مشرقین (۹۹) — رانڈوں میں ہو یتیموں کے ماتم کا شور و شین
کچھ وقت کون سا ہے جو اب ہم فدا نہ ہوں — دل تھرتھرا رہے ہیں کہ اماں خفا نہ ہوں

---

[1] وہ میدان یوں ہی بہت خوفناک تھا فوجی باجوں کی آواز اور ہتھیاروں کی جھنکار نے اسے اور زیادہ خوفناک بنا دیا۔

[2] دُہل اور دَہل میں تجنیس محرف ہے۔ [3] زہیر ابن قین۔

[4] امام حسینؑ کا قاصد۔ مراد حضرت مسلم ابن عقیل جو امام حسین کے چچا زاد بھائی تھے اور امام حسینؑ کا پیغام کوفے والوں کے پاس لے گئے تھے۔

فرمایا کیا نہ جاؤ گے رخصت کو ماں کے پاس دونوں نے ہاتھ جوڑ کے تب کی یہ التماس
اکبر سے آپ پوچھ لیں یا شاہ حق شناس (۱۰۰) فرما چکی ہیں والدۂ آسماں اساس
اب گھر میں آئیو تو وغا کر کے آئیو سر لے کے ابن سعد کا یا مر کے آئیو

فرمایا خیر فوج سے جنگ و جدل کرو جو ماں نے کہہ دیا ہے اسی پر عمل کرو
ہاں خواہش وصال عروس اجل کرو (۱۰۱) بچپن میں اس بقا کو فنا سے بدل کرو
راحت نے اس طرف نہ کیا رخ نہ چین نے دیکھے نہ ماں نے بیاہ نہ سہرے حسینؑ نے

تسلیم کر کے گھوڑوں پہ وہ نازنیں چڑھے غل پڑ گیا جہاد پہ دو مہ جبیں چڑھے
یوں اشہبوں[۱] پہ دلبر ضرغام[۲] دیں چڑھے (۱۰۲) نظروں سے سب اتر گئے گھوڑے زمیں چڑھے[۳]
پریاں نکل کے قاف کی راہوں سے چھپ گئیں دو بجلیاں چمک کے نگاہوں سے چھپ گئیں

پہنچے جو رن میں برج شرف کے وہ آفتاب نیزے زمیں پہ گاڑ دیئے مثل بوتراب
نعرہ کیا کہ او پسر سعد بے حجاب (۱۰۳) ہمراہ لے کے شمر کو آ سامنے شتاب
گو سیکڑوں سوار ہزاروں پیادے ہیں تلوار پہلے تجھ سے چلے یہ ارادے ہیں

ہم نے سنا یہ ہے کہ قریشی نسب ہے تو نیکوں میں بد ہوئے ہیں بدوں میں خجستہ خو
ہم ڈھونڈتے ہیں او سگ ناپاک و کینہ جو (۱۰۴) شیروں سے آ وغا کو جو ہے پاس آبرو
فاقوں میں زور دیکھ جدال و قتال دیکھ دعویٰ ہو کچھ تو ہاشمیوں کا جلال دیکھ

ماں بنت فاطمہ ہیں بنی فاطمہ ہیں ہم دادا ہیں ابن عم[۴] رسول فلک حشم
ہیں اس طرح نسب میں نبی و علی بہم (۱۰۵) دو نام گو ہیں ایک ہیں یہ کعبہ و حرم
بھائی جدا ہیں خویش جدا ہیں وصی جدا ان سے علی جدا نہ خدا سے نبی جدا

۱؎ اشہب۔ سفید رنگ کا گھوڑا۔ ۲؎ شیر۔ ۳؎ تیز دوڑنے کی مشق کیے ہوئے۔ ذوق کا ایک شعر ہے

چڑھ گیا جبکہ زمیں توسن وحشت اپنا دیں گے افلاک پہ ہم خاک بیاباں چڑھا

۴؎ چچا کا بیٹا۔ چچازاد بھائی۔

کہف الوریٰ[1] سراجِ ہدیٰ[2] حجتِ[3] خدا   جس سے فزوں کسی نے نہ کی طاعتِ خدا
خاکی نہاد و آئینۂ قدرتِ خدا   ہر ضرب جس کے ہاتھ کی تھی ضربتِ خدا (۱۰۶)
حق ساتھ ہو حسین کے ہم انکے ساتھ ہیں   پہنچا[4] علی کا زور جنھیں یہ وہ ہاتھ ہیں

چھوٹے نے کی یہ عرض کہ بڑھیے بس اب حضور   مخفی ہوا ہے خیمے میں ڈر کر وہ[5] بے شعور
ہونا ہو اور دھوپ ہے اب پیاس کا وفور   مرنا ہے ہر طرح یہ تامل ہے کیا ضرور (۱۰۷)
دو ہاتھ میں بھگا کے سواروں کو گھاٹ سے   خیمہ گرا دیں اس پہ طنابوں[6] کو کاٹ کے

کھینچے یہ کہہ کے نیمچے[7] دونوں نے یک بیک   پہنچی زمیں سے آئینہ مہر تک چمک
گاؤ[8] زمیں ادھر تھی ہراساں ادھر سمک[9]   دب[10] کر پروں پہ نادِ علی[11] پڑھتے تھے ملک
غل تھا چمک دمک ہی سب آشکار ہو   اک[12] جا ہیں دو یہ نیمچے یا ذوالفقار ہو

---

[1] انسانوں (مخلوقات) کی جائے پناہ۔ [2] رہنمائی کا چراغ۔
[3] خدا کا ثبوت یا دلیل۔ یعنی ایسا مخلوق جس سے خالق کے اوصاف کا پتہ لگتا ہے۔
[4] پہنچا اور ہاتھ میں صنعت ایہام تناسب ہے۔
[5] مراد ابن سعد (دیکھو بند ۱۰۳ مصرع ۳)
[6] رسیاں جن سے باندھ کر خیمے کھڑے کیے جاتے ہیں۔ [7] چھوٹی تلوار۔
[8] وہ گائے جس کی سینگوں پر زمین قائم ہے۔ [9] مچھلی۔ وہ مچھلی جس پر وہ گائے کھڑی ہے جس کے سینگوں پر زمین قائم ہے [10] روایت ہے کہ ایک جنگ میں حضرت علی کی تلوار سے جبرئیل کے پر کٹ گئے تھے۔ اس لیے جب حضرت علی کے نواسوں نے میدان جنگ میں انھیں تیوروں سے تلوار کھینچی تو فرشتوں کو اپنے پر بچانے کی فکر ہوئی اور وہ نادِ علی پڑھ پڑھ کے اپنے پروں پر پھونکنے لگے۔
[11] نادِ علی ایک دعا ہے جس کے پڑھنے سے خوف دور ہو جاتا ہے اور آفتوں سے نجات ملتی ہے۔
[12] ذوالفقار کا پھل دوہرا تھا۔ اس لیے دو نیمچے ایک ساتھ دیکھنے سے ذوالفقار کا دھوکا ہوتا تھا۔

دو بجلیاں سیاہ میں کوندیں فرس بڑھے | جس طرح قافلے سے صدائے جرس بڑھے
اب کون روکے شیر بڑھے جب تو بس بڑھے | (۱۰۹) مقتل میں بیس ہو کے گرے وہ جو دس بڑھے
بچوں نے زورِ حق کے ولی کا دکھا دیا | سب نگ ڈھنگ ضربِ علی کا دکھا دیا

وہ ان کے اشہبوں کی رَد و ارو ادِھر اُدھر | کاوے میں پس کے مر گئے سو سو ادِھر اُدھر
تابندہ تھے جو آٹھ مہِ نو[1] اِدھر اُدھر | (۱۱۰) پھیلی ہوئی زمیں پہ تھی ضَو اِدھر اُدھر
کیلوں سے آشکار تھے جلوے نجوم کے | پریاں تھیں دو کہ پھرتی تھیں جھوم جھوم کے

آئے جدھر خدا کا غضب آ گیا اُدھر | پلٹے جدھر یہ رعبِ علی چھا گیا اُدھر
جھپٹے جدھر شکست عدو پا گیا اُدھر | (۱۱۱) ٹھہرے جہاں کسی سے نہ دیکھا گیا اُدھر
انسان تو کیا ہیں شیروں کے زہرے بھی آب ہیں | آنکھیں ملائے کون کہ دو آفتاب ہیں

کیا دونوں تازیوں[2] کی سبک نازیاں[3] لکھوں | کیونکر روا روی میں خوش اندازیاں لکھوں
کس طرح نیمچوں کی سرافرازیاں لکھوں | (۱۱۲) کیا دونوں شاہزادوں کی جانبازیاں لکھوں
پوتے ہیں کس جری کے خلف کس کے بچے ہیں | اعلیٰ یہ مدح ہو کہ نواسے علیؑ کے ہیں

وہ چھوٹے چھوٹے خود وہ پیشانیوں کی شان | وہ دبدبہ وہ رعب وہ عمرانیوں[4] کی شان
دینداریوں کا نورِ خدا دانیوں کی شان | (۱۱۳) وہ دونوں نیمچوں کی سرافشانیوں کی شان
بیہم چلے یہ زور گھٹا کچھ نہ کس گیا | جب جھکے مینہ سروں کا سراسر برس گیا

جس صف پہ دوڑ سے وہ جلالت قریں بڑھے | غل پڑ گیا کہ دلبرِ ضرغامِ دیں بڑھے
وہ کیا بڑھے کہ دو اسدِ خشمگیں بڑھے | (۱۱۴) شیر دل کا وہ شکار ہوئے جو لعیں بڑھے
زندے بھی کشتۂ خطر و بیم ہو گئے | دو حصے ہو کے موت میں تقسیم ہو گئے

---

[1] مہِ نو۔ نئے چاند۔ یہاں گھوڑوں کے نعل مراد ہیں [2] عربی گھوڑا۔ صفت بول کر موصوف مراد لیا ہے۔
[3] تیز رفتاری۔ [4] حضرت علی کے والد حضرت ابو طالب کا ایک نام عمران تھا۔ عمرانیوں کے معنی ہیں حضرت ابو طالب کی اولاد۔

پھلے[1] سے جس کا تیر ملا تن پہ سر نہ تھا
جز گوشۂ مزار کسی جا مفر نہ تھا
زندہ جو بھاگتے ہیں ادھر تھا اُدھر نہ تھا (۱۱۵)
کشتوں کے پشتے تھے کہ نظر کا گزر نہ تھا
دریا تھا یا سپاہ صفیں تھیں کہ موجیں تھیں
دو بجلیوں کے بیچ میں اعدا کی فوجیں تھیں

نیزوں میں جس طرف وہ گئے بے دھڑک گئے
شیروں کی بو جو آ گئی گھوڑے بھڑک گئے
زندوں کے خوف جاں سے کلیجے دھڑک گئے (۱۱۶)
زخموں میں کیا مزہ تھا کہ بسمل پھڑک گئے
لشکر قدم سپاہ کے دریا سے اٹھ گئے
ہونٹوں کو چاٹتے ہوئے دنیا سے اٹھ گئے

وہ گورے گورے ہاتھ وہ نازک کلائیاں
وہ بازوؤں کا زور وہ تیغ آزمائیاں
وہ پیچوں میں سیفِ علی کی صفائیاں (۱۱۷)
وہ ولولے وہ پھلے پھل کی لڑائیاں
جس غول پر وہ صاحب شمشیر آ پڑے
ثابت ہوا کہ فوج پہ دو شیر آ پڑے

جس پہلواں پہ عون کی تلوار پڑ گئی
چہرہ تو کیا ہے زیست کی صورت بگڑ گئی
چھوٹے کی آنکھ جس سے لڑائی میں لڑ گئی (۱۱۸)
سر تیز اک سناں تھی کہ پتلی میں گڑ گئی
آنکھوں کو روکے صف سے وہ مردک نکل گیا
گویا قضا کو توڑ کے ناوک نکل گیا

اک شور تھا کہ چشم نمائی غضب کی ہے
آفت کا معرکہ ہے لڑائی غضب کی ہے
یہ گھاٹ قہر کا یہ ترائی غضب کی ہے (۱۱۹)
چھوٹے سے پیچوں کی صفائی غضب کی ہے
دونوں ہیں نورِ عین علیؑ سے غیور کے
آنکھیں نکال لیں کوئی دیکھے تو گھور کے

جس پر اڑا کے رخش وہ جاں باز آ پڑا
ثابت ہوا کہ صید پہ شہباز آ پڑا
دو ہو کے تیغ پر وہ فسوں ساز آ پڑا (۱۲۰)
خود منہ کے بل سمند سبک تاز آ پڑا
بڑھتا تھا آپ سے نہ کوئی جنگ کیلئے
لاتی تھی موت گھیر کے چورنگ کیلئے

---

[1] شمشیر بازی کی ایک مشق۔

اللہ کا غضب اُدھر آیا جدھر بڑھے | پہنچا سروں پہ تیغ کا سایا جدھر بڑھے
جلوہ عروسِ فتح نے پایا جدھر بڑھے | (۱۲۱) گھونگھٹ[1] سیاہ شام نے کھایا جدھر بڑھے
گرتی تھی برق لشکرِ ابنِ زیاد پر
گویا چڑھے تھے دینئے دولھا جہاد پر

ماتھے پہ اور وہ پیچ سیاہوں کی لٹ پٹے[2] | گیسو وہ بنتِ فاطمہ کے ہاتھ کے بٹے
وہ ابروؤں کے خم کہ ہلالِ فلک کٹے | (۱۲۲) آنکھیں وہ نرگسی کہ نہ جن سے نظر ہٹے
چہرے کسی نے دیکھے ہیں اس آب و تاب کے
رخسار چار پھول کھلے ہیں گلاب کے

وہ برگِ گل سے لب وہ دہن انکے تنگ تنگ | وہ بھینی بھینی بو کسی غنچے میں نہ وہ رنگ
لعل و گہر ہیں ان لب و دنداں کے آگے دنگ | (۱۲۳) اک منجمد[3] یہ قطرۂ نیساں ہے اور وہ سنگ
تشبیہہ بھی جوان سے نہ دی ناامید ہیں
اس غم سے موتیوں کے کلیجوں میں چھید ہیں

گورے گلے کہ جن سے نمایاں ہے نورِ حق | سرخی نہیں یہ مہرِ منور پہ ہے شفق
وہ نیچے وہ ہاتھ دل کفر جس سے شق | (۱۲۴) سینے ہیں ایک مصحفِ ناطق کے دو ورق
خالی ہیں گو شکم یہ بہتر اسیر ہیں
فاقہ تو وارث ہو کہ یہ شیر دلیر ہیں

ان دونوں اشہبوں کی وہ چلبلی وہ تنگ چال | جو ان کی چال دیکھنے آئے وہ دنگ جائے
صورت کا نہ بناؤ نہ سرعت کا ڈھنگ جائے | (۱۲۵) اڑتے تھے یوں کہ جیسے ہوا پر خدنگ جائے
پریاں تھیں دو وہ اسپ سعادت اثر نہ تھے
سب تھی ہما کی تیز پری اور پر نہ تھے

اسوارِ آفتاب تو گھوڑے بھی ماہ رو | سرعت یہ تھی کہ دوڑتا تھا جسم میں لہو
جاندار و خوش رکاب و سعید و خجستہ خو | (۱۲۶) صاف آتی تھی پسینے سے جن کے وفا کی بو
ڈھالا تھا جوڑ بند کو سانچے میں نور کے
نازک کلائیاں تھیں کہ پہنچے تھے حور کے

---

[1] گھونگھٹ کھانا۔ فوج کا پسپا ہونا۔ پیٹھ دکھانا، شکست کھانا [2] ڈھیلے ڈھیلے بے ترتیبی سے پڑے ہوئے [3] موتی کو حقیر کرنے کے لیے آبِ نیساں کا منجمد قطرہ کہا ہے اور اسی غرض سے لعل کو پتھر کہا ہے۔

دونوں کنوتیاں[1] ہیں کہ پیکان تیر ہیں — چاروں سُم ان کے غیرت بدر منیر ہیں
آنکھوں پہ کیجیے جو نظر بے نظیر ہیں — (۱۲۷) بال ایسی جلد کے پیچ میں پریاں اسیر ہیں
سرعت میں ان سے طیر[2] کو نسبت نہ تیر کو — نرمی یہ جلد میں کہ خجالت حریر کو
آئے اُدھر سے گر تو ادھر سے نکل گئے — پہنچے کنار بحر تو بر سے نکل گئے
مانند برق لشکر شر سے نکل گئے — (۱۲۸) دو تیر آگے تیر نظر سے نکل گئے
یوں پھر رہے تھے بیچ میں فوج غنیم کے — جیسے سحر کو چلتے ہیں جھونکے نسیم کے
غنچے تھے دو ملے ہوئے اک جا کہ اُن کے گوش — پاکھر[3] میں یوں تھا جسم کہ رستم تھا درع[4] پوش
سرعت کو دیکھ لیں تو اُڑیں طائروں کے ہوش — (۱۲۹) کرتا تھا صف شکن تو شجاعت کا تھا یہ جوش
پریاں اڑا سکیں نہ روش انکی چال کی — ہیکل مزاج شیر کا آنکھیں غزال کی
وہ سم وہ نعل[5] اور وہ سینے وہ ترک تاز — بدر و ہلال و آئینہ و کبک و شاہباز
زیور تھا ایک شب کی دلہن کا کہ ان کے ساز — (۱۳۰) وہ کلغیاں کہ تاج لیے سے سرفراز
بن کر گہر پسینے کے قطرے ٹپکتے تھے — ہیکل کی ہمیلوں کے ستارے چمکتے تھے
گو چھوٹے چھوٹے پاؤں نہ جاتے تھے تا رکاب — پر ایڑیاں[6] لگی ہوئی تھیں مثل بوتراب
یوں مرکبوں کو باندھے تھے سر وہ فلک جناب — (۱۳۱) بیجا قدم رکھیں یہ سمند دل کو تھی نہ تاب
غل تھا ہٹے رہو کہ مزاج ان کا آگ ہے — حیدر سے شہسوار کی یہ ران[7] باگ[8] ہے

---

[1] گھوڑے کے چھوٹے چھوٹے کان۔ [2] چڑیا۔ پرندہ۔ [3] گھوڑے کی زرہ۔ پاکھر۔ [4] سپاہی کی زرہ۔
[5] گھوڑے کے سم کو 'بدر' سے، نعل کو ہلال سے، سینے کو آئینے سے اور ترک تاز کو کبک و شہباز سے تشبیہ دی ہے۔ آخری تشبیہ سے مراد یہ ہے کہ گھوڑا اس تیزی سے جھپٹتا ہے جس طرح شہباز کبک پر۔ ان مصرعوں میں صنعت لف و نشر مرتب ہے۔ ترک تاز: تیز حملہ۔ جھپٹ۔ [6] ایڑی جمانا۔ شہسواری کی اصطلاح میں گھوڑے کو رانوں میں دبائے رہنا۔ گھوڑے پر جم کر بیٹھنا۔ [7] شہسواری کی اصطلاح میں گھوڑے کی باگ اس طرح پکڑنا کہ گھوڑا اپنا سر اٹھائے رہے اور ادھر اُدھر جنبش نہ کر سکے۔ [8] گھوڑے پر بیٹھنے اور باگ لینے کا طریقہ۔

گھوڑوں نے کس پرے میں قیامت بپا نہ کی ــــ فاقہ تھا پر کمی تگ و دو میں ذرا نہ کی
وہ کون سی گرہ تھی کہ تیغوں نے وا نہ کی (۱۳۲) ــــ کن سرکشوں کے جسم سے گردن جدا نہ کی
نیزوں[۱] کے بند قطع کمانوں کیا تھے ــــ حلال مشکلات[۲] کے بچوں کے ہاتھ تھے

پیاسوں کے تیغے بھی غضب آبدار تھے ــــ سیل فنا تھے صاعقہ[۳] شعلہ بار تھے
دونوں بہم جو ہو کے اٹھے ذوالفقار تھے (۱۳۳) ــــ سائے کو بھی شریک جو کیجیے تو چار تھے
دو کرتے تھے یہ راکب و مرکب کو زین کو ــــ دو ہاتھ کاٹ دیتا تھا سایہ زمین کو

قبضے وہ تکیہ گاہ ظفر جن کا نام ہے ــــ پھل وہ کہ جن کو کھاتے ہی قصہ[۴] تمام ہے
پانی وہ جس کو کہیے کہ زہر[۵] الشیام ہے (۱۳۴) ــــ کاٹ ایسا سنگ سخت جہاں موم خام ہے
جوہر وہ دم نکلتے ہیں جن کی مثال پر ــــ انشاں چنی ہوئی ہے جبین ہلال پر

فولاد پوش پھینک کے ہتھیار چھپ گئے ــــ گوشوں میں سر جھکا کے کماں دار چھپ گئے
چار آٹھ میں جو قتل ہوئے چار چھپ گئے (۱۳۵) ــــ زخموں کے گل بہت جو کھلے خار چھپ گئے
مشکل وہاں تمیز بد و نیک ہو گئی ــــ غل تھا کہ لو بہار و خزاں ایک ہو گئی

جن کے جمے تھے رنگ وہ بے رنگ ہو گئے ــــ لڑنے کا حوصلہ نہ رہا تنگ ہو گئے
چار آئینے جو پہنے تھے چو رنگ ہو گئے (۱۳۶) ــــ بچوں نے وہ کیا کہ جواں دنگ ہو گئے
مہلت نہ سر اٹھانے کی تھی فوج شام کو ــــ دونا بلند کر گئے جعفر کے نام کو

---

۱ نیزہ بازی کے داؤں۔

۲ مشکلوں کا حل کرنے والا۔ مراد حضرت علی۔

۳ بجلی۔

۴ زندگی ختم ہے۔

۵ زہر ملا ہوا۔

کوئی بچے نہ رومی و رازی[۵۱] جدھر گئے — بچھ بچھ گئیں صفیں وہ نمازی جدھر گئے
غازہ لگایا فتح نے غازی جدھر گئے — (۱۳۷) پس پا تھے یکہ تاز[۵۲] وہ تازی جدھر گئے
دھومیں وغا کی قاف[۵۳] سے تا قاف ہو گئیں — اللہ رے مصاف[۵۴] صفیں صاف ہو گئیں

جا پہنچے تھے خیام بن سعد کے قریں — کتنی طنابیں کاٹ چکے تھے یہ مہ جبیں
ہاں ہاں کا شور کر کے بڑھے سب عدوئے دیں — (۱۳۸) بھاگا عقب سے پھیر کے خیمے کو وہ لعیں
بھاگا اُدھر تو جوش میں وہ اضطراب کے — یہ دونوں بھائی رہ گئے ہونٹوں کو چاب کے

چھوٹے نے عرض کی یہ سراپا ہے مکر و کید — دیکھا حضور چھٹ گیا پنجے میں آ کے صید
چھپنے کی شرم ہے نہ انھیں بھاگنے کی قید — (۱۳۹) فرمایا عون نے یہ ہیں استاد زرق[۵۶] و شید
بھاگا طناب کٹتے ہی کیا حیلہ ساز ہے — سچ ہے حرام زادے[۵۷] کی رسّی دراز ہے

بڑھ کر پکارے حضرت عباس عرش جاہ — کس سمت ابن سعد ہے او شمر روسیاہ
ذلت اٹھا کے بھاگ گیا افسر سپاہ — (۱۴۰) رو کے گئے نہ ایک[۵۸] سے دو طفل واہ واہ
سر سبز ہوتے ہیں ہمیں جب کھیت پڑتے ہیں[۵۹] — یوں لشکروں سے شیروں کے فرزند لڑتے ہیں

---

۵۱ شہر رے کے رہنے والے۔ رے کا قدیم نام راز تھا۔ ۵۲ اکیلا دوڑنے والا۔ تنہا حملہ کرنے والا۔ ایسا شہسوار جس کے برابر کوئی گھوڑا نہ دوڑا سکے۔ ۵۳ قاف ایک فرضی پہاڑ کا نام ہے جو ساری دنیا کو گھیرے ہوئے ہے اس لئے قاف سے تا قاف، کے معنی ہوتے ہیں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک۔
۵۴ مصاف، صفیں، صاف میں صنعت شبہ اشتقاق ہے۔ ۵۵ ہونٹھ چبانا۔ انتہائی غصے کی علامت ہے۔ ۵۶ مکر و فریب۔
۵۷ یہ مثل اس وقت بولتے ہیں جب کوئی بھی آدمی کسی مہلکے سے بچ جاتا ہے۔ معنی اس کے یہ ہیں کہ بروں کی عمر بڑی ہوتی ہے۔
۵۸ کسی سے بھی۔
۵۹ جنگ ہوتی ہے۔ کشت و خون ہوتا ہے۔

ہاں مرد گر ہے سامنے بچوں کے آ تو جائے　　بھاگے گا پھر تو خیر کوئی زخم کھا تو جائے
مخفی کدھر ہے شیروں کو صورت دکھا تو جائے (۱۴۱)　　بگڑی ہوئی لڑائی کو ظالم بنا تو جائے
بپھرے ہیں شیر ہاتھ میں تیغ و سپر تولے　　گرتا ہے وہ جھکا ہوا خیمہ خبر تو لے

بھاگا رئیس خود یہ خبر چار سو گئی　　عزت سبھوں کی آج گئی آبرو گئی
آخر شغال تھا نہ دبکنے کی خو گئی (۱۴۲)　　خلعت پہن کے بھی نہ ذلالت کی بو گئی
جب کچھ کڑی پڑی تو جفا جو نکل گیا　　ضیغم جلال میں ہیں کہ آہو نکل گیا

مرتا ہے بے حیا زر و جاگیر و مال پر　　اک نیچے کا وار بھی رد کا نہ ڈھال پر
آنکھیں چرائیں شیر جب آئے جلال پر (۱۴۳)　　سردار ہو کے چھپ گیا تف اس جدال پر
پائے نہ گر شکار تو جانباز کیا کرے　　کنجشک جب نہاں ہو تو شہباز کیا کرے

باتوں میں اتنا تھم جو گئے وہ فلک پناہ　　خیمے کو لے کے پشت پہ سب جم گئی سپاہ
دریا کی فوج ادھر سے ہوئی بڑھ کے سدِّ راہ (۱۴۴)　　چاروں طرف سے گھر گئے زینب کے رشک ماہ
پتھر بھی تیر ظلم بھی نیزے بھی چل گئے　　سینوں کو توڑ توڑ کے ناوک نکل گئے

یوں تیر کھا کے فوج پہ جاتے تھے وہ دلیر　　غصّے میں جس طرح کہ جھپٹتا ہے زخمی شیر
لشکر کو کر دیا تھا زبردستیوں سے زیر (۱۴۵)　　انبار ادھر سروں کے ادھر زخمیوں کے ڈھیر
دیکھا غضب سے جس کی طرف زرد ہو گیا　　تلوار جس پہ[۱] سن سے چلی سرد ہو گیا

تیغیں قریب سے جو لگاتے تھے اہل شر　　اک بھائی بڑھ کے ہوتا تھا اک بھائی کی سپر
عباس پھر کے دیتے تھے حضرت کو یہ خبر (۱۴۶)　　کیا لڑ رہے ہیں آپ کی ہمشیر کے پسر
نامی جوان بھاگ گئے شام و روم کے　　خیمے پہ جا پڑے پسر سعد شوم کے

۱؎ شعلہ بار تلوار گویا ٹھنڈی ہوا کا جھونکا تھی کہ جس پر چلی اس کو ٹھنڈا کر دیا۔

پھر اب خدا بچائے کہ فوجیں کثیر ہیں — تیغیں ہیں برچھیاں ہیں سنانیں ہیں تیر ہیں
رو کر امام دیں نے کہا اب اخیر ہیں (۱۴۷) کب تک لڑیں کہ تشنہ دہن ہیں صغیر ہیں
نو دس برس ہیں ماں سے بچھڑنے کے دن نہ تھے — یہ کھیلنے کی فصل تھی لڑنے کے دن نہ تھے

زینب کھڑی تھیں پردے کے پیچھے جو بیقرار — فضہ خبر یہ دیتی تھی جا جا کے بار بار
کیا لڑ رہے ہیں جعفر و حیدر کے یادگار (۱۴۸) حضرت سے مدح کرتے ہیں عباس نامدار
جس وقت ذکر معرکہ آرائی ہوتے ہیں — رومال رکھ کے آنکھوں پہ حضرت بھی روتے ہیں

رو کر کہا کہ روتے ہیں کس واسطے امام — میں اک کنیز ان کی وہ دونوں پسر غلام
مجھ کو دکھا تو دے کہ کدھر ہیں وہ لالہ فام (۱۴۹) اس نے کہا کہ چھائی ہے جنگل میں فوج شام
لاکھوں سے معرکہ ہے مگر با حواس ہیں — بی بی وہ[1] ابن سعد کے خیمے کے پاس ہیں

تلوار چل رہی ہے کہ اللہ کی پناہ — ڈھالوں کی بدلیوں میں چھپے ہیں وہ رشک ماہ
کثرت ہے اس قدر کہ پہنچتی نہیں نگاہ (۱۵۰) وہ بھاگتی ہے اور پلٹتی ہے سب سپاہ
آواز دار و گیر[2] کی گردوں پہ جاتی ہے — دونوں کے نیمچوں کی چمک یاں تک آتی ہے

طبل ظفر پہ چوب لگی یک بہ یک ادھر — ڈیوڑھی سے آئیں خیمے میں زینب جھکا کے سر
عباس نے کہا شہ والا سے دوڑ کر (۱۵۱) چلیے حضور لٹ گیا بنت علی کا گھر
گھبرا کے کشمکش میں دم ان کے نکل نہ جائیں — لاکھوں سوار ہیں کہیں بچے کچل نہ جائیں

تلوار لے کے قاسم شیریں سخن بڑھے — عباس کیا بڑھے شہ خیبر شکن[3] بڑھے
مانند شیر اکبر گل پیرہن بڑھے (۱۵۲) فرزند سے یہ کہہ کے امام زمن بڑھے
پردے میں اہل بیت نبی کے خلل نہ آئے — ڈیوڑھی پہ تم رہو کہیں زینب نکل نہ آئے

---

[1] یہ ضمیر نہیں اسم اشارہ ہے۔ [2] دھر پکڑ۔ لینا پکڑنا۔ لڑائی کے وقت کا شور و غل۔
[3] قلعہ خیبر کو توڑنے والا۔ اہل خیبر کو شکست دینے والا بادشاہ۔ مراد حضرت علی۔

پہنچے یہ تین شیر جو مقتل میں ایک بار کیا پیدلوں کا ذکر فراری ہوئے فرار
ریتی پہ شہ کو یوں نظر آئے وہ گل عذار (۱۵۳) بند آنکھیں منہ کھلے ہوئے ہونٹوں پہ جان زار
دنیا سے وقت کوچ بھی دونوں کا ساتھ ہے گردن میں ایک بھائی کی بھائی کا ہاتھ ہے

بچوں کو جانکنی میں جو پایا حسینؑ نے بوسے لئے گلے سے لگایا حسینؑ نے
آنکھوں سے خوں جگر کا بہایا حسین نے (۱۵۴) ہاتھوں سے نیمچوں[1] کو چھڑایا حسین نے
آغوش میں بڑے کو شہنشاہ لے چلے چھوٹے کی لاش قاسم ذی جاہ لے چلے

پہنچے قریب خیمہ جو شاہ فلک سریر تھا غیر حال مر گئے رستے میں وہ صغیر
پردہ الٹ کے خیمے کا با حالت تغیر (۱۵۵) فضہ پکاری اے حرم شاہ قلعہ گیر
دوڑو حسینؑ خیمے میں لاشوں کو لاتے ہیں دولھا بنے ہوئے مرے شہزادے آتے ہیں

دوڑے اُدھر سے چھاتیوں کو پیٹتے حرم ڈیوڑھی سے پہلے آیا لچکتا ہوا علم
رایت کے نیچے بچوں کی تھیں میتیں بہم (۱۵۶) آ پہنچے لڑکھڑاتے ہوئے سرورِ اُمم
لاشوں کے آگے اکبر یوسف جمال تھے کپڑے ہر اک کے خون سے بچوں کے لال تھے

ماتم کی صف سے اٹھ گئیں زینب یہ کہہ کے بات لوگو کہو یہ کون سے دولھا کی ہے برات
لاشوں کو رکھ کے غش ہوئے سلطان کائنات (۱۵۷) دوڑیں[2] لٹا کے بچوں کو بانوے خوش صفات
لڑکے بھی چھاتیوں کو بہم پیٹنے لگے لاشوں کے گرد آ کے حرم پیٹنے لگے

بیٹھی تھیں ایک گوشے میں زینب جو ننگے سر واں جا کے بولیں بانوے ناشاد و نوحہ گر
پُرسے کو لوگ جمع ہیں چلئے ذرا اُدھر (۱۵۸) فرمایا میں نہ جاؤں گی بچوں کی لاش پر
آنچ آتما[3] کی دل کو جلائے تو کیا کروں گر فرق میرے صبر میں آئے تو کیا کروں

---

[1] جنگ میں عون و محمد کی بہادری اور استقلال دکھایا ہے کہ مرتے دم تک نیمچے ہاتھ سے نہیں چھوٹے تھے۔

[2] ان لفظوں سے واقعے کی سچی تصویر کھنچ جاتی ہے۔ [3] سنسکرت لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں نفس، روح، آتما کا آنچ اولاد کے غم میں ماں کی انتہائی بے قراری۔

لاشوں پہ لاشیں لوٹ چکیں کھیت پڑ چکے … بس سن چکی کہ نام کیا خوب لڑ چکے
گودی میں جو پلے تھے وہ بچے بچھڑ چکے … کنبہ تمام ہو چکا دو گھر اُجڑ چکے (۱۵۹)
اب ان کا غم نہ فکر مرے گھر کی چاہیئے
بی بی[۵۱] سلامتی علی اکبر کی چاہیئے

بھائی کے آگے لاشوں پہ جاکر کروں میں بین … بے صبر ہے یہ دل میں کہیں گے مجھے حسین
گر مر گئے تو مر گئے وہ دونوں نور عین … کیونکر چلوں کھڑے ہیں شہنشاہ مشرقین (۱۶۰)
روؤں[۵۲] گی میں تو پھر علی اکبر بھی روئیں گے
صدمہ یہ مجھ کو ہے کہ برادر بھی روئیں گے

بھائی کا حق ادا ہوا احسان کردگار … رونا ہے واں بھی میں یہیں رولوں گی زار زار
لاشوں کو دیکھ کر مرا دل ہوگا بے قرار … کی عرض آپ صاحب[۵۳] ماتم ہیں میں نثار (۱۶۱)
چلیئے نہ ضبط کیجئے فریاد و آہ کو
لاشوں پہ بھانجوں کی غش آیا ہے شاہ کو

لاشوں پہ لائیں بیبیاں زینب کو تھام کر … ماتم کی صف پہ گر پڑی وہ سوختہ جگر
بولیں[۵۴] بڑھا کے دست مبارک اِدھر اُدھر … بچے کدھر ہیں مجھ کو کچھ آتا نہیں نظر (۱۶۲)
کیسی دھڑا[۵۵] دھڑ مچی ہے یہ کیوں بین ہوتے ہیں
لوگو نہ غل مچاؤ مرے لال سوتے ہیں

اس بیکسی میں ماں کی بھی جانب نظر رکھو … ماں صدقے جائے لو مرے زانو پہ سر رکھو
آفت میں ماموں جان کی اپنے خبر رکھو … لازم نہیں کہ ہاتھ سے تیغ و سپر رکھو (۱۶۳)
دیکھو نہ آنچ آئے شہ خوش خصال پر
فوجوں کی پھر چڑھائی ہے زہرا کے لال پر

---

[۵۱] یہ مصرع بتاتا ہے کہ حضرت زینب کو حضرت علی اکبر سے کس درجہ محبت تھی۔

[۵۲] اس بیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زینب کو اپنے بھائی اور بھتیجے سے انتہا کی محبت تھی۔

[۵۳] خاص سوگوار۔ مرنے والے کا سب سے قریبی عزیز۔

[۵۴] اس مصرعے نے واقعے کی کتنی سچی تصویر کھینچ دی ہے۔

[۵۵] غم کی شدت میں سر، سینہ اور زانو پیٹنا۔

کیسی یہ نیند آج ہے پیارو اٹھو اٹھو
ماموں کے ساتھ رن میں سدھارو اٹھو اٹھو
کپڑے لہو بھرے یہ اتارو اٹھو اٹھو (۱۶۴)
گیسو الجھ گئے ہیں سنوارو اٹھو اٹھو
ان پیاری پیاری آنکھوں پہ اماں نثار ہو
انگڑائیاں تو لو کہ جگر کو قرار ہو

سینوں سے تو زمین پہ رکھو ہاتھ اتار کے
باندھو کھلے ہوئے یہ عمامے سنوار کے
اماں نثار گیسوؤں کے تار تار کے (۱۶۵)
چونکو اٹھو کلام کرو ماں سے پیار کے
نخل مراد میں نہ ثمر ہے نہ برگ ہے
اب سمجھی میں یہ نیند نہیں خواب مرگ ہے

لاکھوں سے معرکے میں وغا کر کے آئے ہو
بچپن کی غفلتیں یہ نہیں مر کے آئے ہو
دولھا بنے ہو خون میں سب بھر کے آئے ہو (۱۶۶)
صدقے گئی رلانے کو مادر کے آئے ہو
مجھ سے بچھڑ کے تم اسی منزل میں رہ گئے
ارمان شادیوں کے مرے دل ہی میں رہ گئے

کیونکر ملے گا ماں کو تمھارا سراغ ہائے
لوٹا اجل نے حیدر و جعفر کا باغ ہائے
یوں بجھ گئے ہماری لحد کے چراغ ہائے (۱۶۷)
میرا بڑھاپا اور یہ بچوں کے داغ ہائے
ہے ہے یہ گھر بھرا ہوا ویران کر گئے
اماں کی قبر بننے نہ پائی کہ مر گئے

کس طرح دیکھوں خاک میں چہرے اٹے ہوئے
الجھے ہیں میرے ہاتھ کے گیسو لٹے ہوئے
سینے فگار چاند سے بازو کٹے ہوئے (۱۶۸)
ہے ہے کفن بنے یہی کپڑے پھٹے ہوئے
نہ کچھ تزک نہ غسل شہیدوں کو چاہیئے
مرنا یونہیں جہاں میں سعیدوں کو چاہیئے

تابوت اٹھاتی دھوم سے مرتے وطن میں گر
ہوتا پدر بھی ساتھ جنازے کے ننگے سر
قبریں بناتی ماں کی لحد کے ادھر ادھر (۱۶۹)
کیا حشر ہوگا پہنچے گی یثرب[۱] میں جب خبر
ام البنین[۲] پیٹتی روضے[۳] پہ جائیں گی
صغرا کے پاس بیبیاں پرسے کو آئیں گی

---

[۱] شہر مدینہ کا قدیم نام۔ [۲] حضرت عباس کی والدہ کا نام۔

[۳] روضۂ رسول۔

بچو تمھیں بتاؤ میں غربت میں کیا کروں　　نہ گھر ہے نہ وطن ہے مصیبت میں کیا کروں
بھائی گھرا ہوا ہے اس آفت میں کیا کروں (۱۷۰)　　فاقوں میں تشنگی میں صعوبت میں کیا کروں
راحت نہ روح کو نہ کسی دل کو صبر ہے　　پانی نہ غسل کو نہ کفن ہے نہ قبر ہے

مجبور تم ہو ماں بھی ہے ناچار میں نثار　　تنہائی میں خدا ہے مددگار میں نثار
رستہ برا ہے باندھ لو ہتھیار میں نثار (۱۷۱)　　چھوٹے مرے پسر سے خبردار میں نثار
اللہ اس سفر کی بلاؤں کو رد کرے　　کھٹکا جہاں ہو بھائی کی بھائی مدد کرے

سنتی ہوں اس سفر میں خطر بے شمار ہیں　　جانیں وہی اسے جو میانِ مزار ہیں
پرسش ہے روک ٹوک ہے جنگل ہے خار ہیں (۱۷۲)　　وہ بھی ڈرے ہوئے ہیں جو طاعت گزار ہیں
منزل کا شب کی ماں کو پتا دے کے جائیو　　قربان جاؤں ساتھ مجھے لے کے جائیو

دن ڈھل گیا قریب ہے شام اے مسافرو　　کس بن میں شب کو ہوگا مقام اے مسافرو
کچھ تو کرو زباں سے کلام اے مسافرو (۱۷۳)　　بھیجو گے کب پیام و سلام اے مسافرو
بیٹوں کی پہلوؤں میں جو تم کو نہ پاؤنگی　　میں سب کو ڈھونڈھتی ہوئی جنگل میں آؤنگی

کہتا تھا باپ شب کو نہ بچے نکلنے پائیں　　بھولے ہیں راستہ نہ کہیں گھر کا بھول جائیں
دربار میں بھی ہوں تو سویرے سے گھر میں آئیں (۱۷۴)　　ہے ہے یہ دشت ظلم جو کرتا ہے سائیں سائیں
پہنچوں گی کس طرح میں جو ڈر ڈر کے روؤ گے　　واری اندھیری قبر میں کس طرح سوؤ گے

یہ بین کرکے لاشوں سے لپٹی وہ نوحہ گر　　غش آیا سانس الٹ گئی ٹکڑے ہوا جگر
اک حشر تھا کسی کو کسی کی نہ تھی خبر (۱۷۵)　　بانو پکاری سوئے علمدار دیکھ کر
بچوں کے ساتھ ماں بھی جہاں سے گزر نہ جائے　　لاشے اٹھاؤ شاہ کی ہمشیر مر نہ جائے

بس اے انیسؔ طول سے بہتر ہے اختصار　　ہاں ختم کرکے مرثیہ شاہ نام دار
خالق سے ہاتھ اٹھا کے دعا کر بانکسار (۱۷۶)　　قائم رہے جہاں میں یہ شاہ[1] فلک وقار
ہردم زیادہ حشمت و اقبال و جاہ ہو　　حامی جناب فاطمہ زہرا کا ماہ ہو

---

[1] مرثیے میں شاہ کا لفظ بالعموم امام حسین کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں شاہ سے شاہ اودھ مراد ہے۔

ممکن نہیں، عہد سے عبادت تیری
بذل و کرم و عطا ہے عادت تیری
صحرا صحرا ہیں گو کہ عصیاں میرے
دریا دریا مگر ہے رحمت تیری

ماں باپ سے بھی سوا ہے شفقت تیری
افزوں ہے ترے غضب سے رحمت تیری
جنت، انعام کہہ کے دوزخ میں جلا
وہ رحم ترا ہے یہ عدالت تیری

کیا مرتبہ سلطانِ حجازی کا ہے
کیا عزّ و شرف امام غازی کا ہے
سجدے کا نشان دیکھ کے سب کہتے ہیں
نیزے پہ یہ سر کسی نمازی کا ہے

شہرہ ہر سو جو خوش کلامی کا ہے
باعث مدح امام نامی کا ہے
میں کیا، آواز کیسی، پڑھنا کیسا
آقا یہ شرف تیری غلامی کا ہے

دل کو مرے شغل غم گساری کا ہے
غفلت میں بھی طور ہوشیاری کا ہے
گردوں کو اگر ہے سرکشی کا غرّہ
ہم کو بھی غرور خاکساری کا ہے

گل سے بلبل کی خوش بیانی پوچھو
ذی فہم سے لطف نکتہ دانی پوچھو
توقیر کلام حق سمجھتا ہے کلیم
موسیٰ سے رموزِ لن ترانی پوچھو

ہاں بعد فنا سخن نشاں ہے میرا
دنیا میں یہ باغ بے خزاں ہے میرا
تا حشر رہے گا نام اس سے روشن
ہر شعر چراغِ دودماں ہے میرا

مرثیہ (۳)

جب رن میں سربلند علیؑ کا علم ہوا — فوجِ خدا پہ سایۂ ابرِ کرم ہوا
چرخِ زبرجدی پئے تسلیم خم ہوا — (۱) پنجے پہ سات بار تصدق حشم ہوا
دیکھا نہ تھا کبھی جو علم اس نمود کا
دونوں طرف کی فوج میں غل تھا درود کا

وہ شان اس علم کی وہ عباس کا جلال — نخلِ زمردی کے تلے تھا علی کا لال
پرچم پہ جان دیتی تھیں پریوں کا تھا یہ حال — (۲) غل تھا کہ دوش حور پہ بکھرے ہوئے ہیں بال
ہر لہر آبدار تھی کوثر کی موج سے
طوبیٰ بھی دب گیا تھا پھریرے کے اوج سے

تھا پنجتن کا نور جو پنجے میں جلوہ گر — اعمیٰ کی پتلیوں میں بھی تھا روشنی کا گھر
ذرے نثار کرتے تھے اٹھ اٹھ کے اپنا زر — (۳) تکتے تھے فوق سے تو ملک تحت سے بشر
اللہ ری چمک علمِ بوتراب کی
تارِ نظر بنی تھی کرن آفتاب کی

قربان احتشام علمدار نامور — رخ پر جلالت شہِ مرداں تھی سربسر
چہرہ تو آفتاب سا اور شیر کی نظر — (۴) قبضے میں تیغ بر میں زرہ دوش پر سپر
چھایا تھا رعب لشکرِ ابنِ زیاد پر
غل تھا چڑھے ہیں شیرِ الٰہی جہاد پر

---

۱ وہ فوجی نشان جو کبھی حضرت علی کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ حضرت علی جہاد میں لشکرِ رسولؐ کے علمدار رہے تھے۔
۲ یہ عربی جملہ ہے اللّٰھم صلِ علیٰ محمدٍ و آلِ محمدٍ جس کے معنی ہیں خداوندا محمدؐ اور آلِ محمد پر رحمت نازل کر مسلمان جب کوئی اچھی چیز یا اچھی صورت دیکھتے ہیں اور اچھی خوشبو سونگھتے ہیں تو یہ جملہ کہتے ہیں۔ درود کے لغوی معنی ہیں دعا۔ تعریف، شکریہ، رحمت برکت۔ ۳ لشکرِ اسلام کے علم کا پھریرا سبز تھا۔ اس لیے اس کو استعارے کے طور پر زمردی درخت کہا ہے۔
۴ بہشت کا ایک عظیم الشان درخت ۵ مثلث کی شکل کا بڑا سا کپڑا جو علم کی چھڑ میں لگایا جاتا ہے۔ ۶ اندھا —
۷ حضرت علی کا ایک لقب ابوتراب بھی تھا (دیکھو صفحہ ۱۹ حاشیہ ۵) ۸ علم میں اس حد کی چمک تھی کہ آفتاب بھی اس کو حیرت سے دیکھ رہا تھا اور اس کی ہر کرن ایک تارِ نظر بن گئی تھی۔

وہ اوج وہ جلال وہ اقبال وہ حشم — وہ نور وہ شکوہ وہ توقیر وہ کرم
پنجے کی وہ چمک وہ سرافرازیِ علم — گرتی تھی برق فوجِ مخالف پہ دم بدم (۵)
کیا رفعت نشانِ سعادت نشان تھی — سائے میں جس نشان کے طوبیٰ نشان تھی

پنجہ[۱] اٹھا کے ہاتھ یہ کہتا تھا بار بار — عالم میں پنجتن کی بزرگی ہے آشکار
یہ شش جہت انھیں کے قدم سے ہے برقرار — کیوں ہفتہ دست[۲] ہوتے ہو اے قوم نابکار (۶)
آٹھوں بہشت ملتے ہیں مولیٰ کے نام سے — بیعت کرو حسین علیہ السلام سے

غرفوں سے جھانک جھانک کے بولی ہر ایک حور — صلِ علیٰ[۳] علم کی چمک ہے کہ برق طور
یارب رہے نگاہِ بد اس کی ضیا سے دور — پنجہ ہے یہ کہ ایک جگہ پنجتن کا نور (۷)
جلوے ہیں سب محمد و حیدر کی شان کے — قربان اس جواں کے نثار اس نشان کے

آگے کبھی نہ دیکھی تھی اس حسن کی سپاہ — دنیا بھی خوبیوں کا مرقع ہے واہ واہ
دیکھیں کسے کہ ہے ایک ایک رشکِ ماہ — جاتی ہے جس کے رخ پہ تو پھرتی نہیں نگاہ (۸)
دیکھو انھیں دموں سے ہے رونق زمین کو — چن کر[۴] حسین لائے ہیں کس کس حسین کو

شہرہ بہت تھا حسن میں کنعاں کے ماہ کا — قصہ سنا ہوا ہے زلیخا کی چاہ کا
یاں آفتاب کو نہیں یارا نگاہ کا — یوسف ہے ایک ایک جواں اس سپاہ کا (۹)
سنتے تھے ہم کہ عالمِ ایجاد زشت ہے — ایسے چمن کھلے ہیں تو دنیا بہشت ہے

---

[۱] اس بند میں 'پنجہ'، 'پنجتن'، 'شش جہت'، 'ہفتہ دست'، 'آٹھوں بہشت' کے لفظوں میں صنعت سیاق الاعداد ہے۔ [۲] چند روزہ دوست، بے وفا دوست۔

[۳] یہ کلمہ تحسین ہے اور اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّد کا مخفف ہے جس کے معنی ہیں خداوندا محمدؐ اور آلِ محمد پر رحمت نازل کر۔ اس جملے کو درود کہتے ہیں۔

[۴] 'حُسین' اور 'حَسین' میں صنعت تجنیس محرف ہے۔

ہم شکل مصطفےٰؐ کلہے کیا حسن کیا جمال — صبح جبیں بھی اور شب گیسو بھی بے مثال
یہ لبؔ یہ خط یہ چشم یہ ابرو یہ رُخ یہ خال — (۱۰) یاقوت و مشک نرگس و انجم و مہ و ہلال
اک گل پہ یاں ہزار طرح کی بہار ہے — چہرہ نہ کہیئے قدرتِ پروردگار ہے

تحت دل حسن بھی ہے کس مرتبہ حسین — جس کے چراغ حسن سے روشن ہو سب زمیں
یہ زلف مشک بیز یہ آئینہ جبیں — (۱۱) سرمایۂ خطا و ختن کائنات چیں
رُخ کی بلائیں لیتی ہیں پریاں کھڑی ہوئی — سہرے کی ہر لڑی ہے آنکھیں لڑی ہوئی

نامِ خدا ہیں عون و محمد بھی کیا شکیل — اک مہر بے نظیر ہے اک بدر بے عدیل
افروختہ ہیں رُخ یہ شجاعت کی ہے دلیل — (۱۲) ہمت بڑی ہے گو کہ ہیں عمریں ابھی قلیل
مثل علی ہیں جنگ و جدل پہ تلے ہوئے — دونوں کے نیمچے نکلے ہیں ڈورے کھلے ہوئے

عباس نامور بھی عجب سج کا ہے جوان — نازاں ہے جس کے دوش منوّر پہ خود نشان
حمزہ کا رعب صولت جعفر علی کی شان — (۱۳) ہاشم کا دل حسینؑ کا بازو حسنؑ کی جان
کیونکر نہ عشق ہو شہ گردوں جناب کو — حاصل ہیں سیکڑوں شرف اس آفتاب کو

---

۱ ان مصرعوں میں صنعت لف و نشر کی ایک خاص صورت ہے۔ ہر مصرعے میں چھ چھ چیزیں بیان کی گئی ہیں۔ شروع کی تین تین چیزوں میں لف و نشر مرتب اور آخر کی تین تین چیزوں میں لف و نشر معکوس الترتیب ہے۔

۲ ان مصرعوں میں صنعت لف و نشر مرتب ہے۔ خطا اور ختن کا مشک، اور چین کا آئینہ کسی زمانے میں مشہور تھا۔

۳ "لڑی" دو مرتبہ دو معنوں میں آیا ہے۔ اس سے صنعت تجنیس تام پیدا ہو گئی ہے۔

۴ تلوار یا نیمچے کا قبضہ ایک ڈورے سے میان کے سرے میں باندھ دیا جاتا تھا جب اس کو میان سے نکالنا ہوتا تھا تو وہ ڈورا کھول لیا جاتا تھا۔ اس لیے نیمچوں کے ڈورے کھلے ہوئے ہونے سے عون و محمد کی جنگ پر آمادگی ظاہر ہوتی تھی۔

۵ شرف کے معنی بلندی، بزرگی، برتری، خوبی وغیرہ ہیں مگر یہاں شاعر نے اس لفظ کو آفتاب کے ساتھ لاکر ایک اور معنی کی طرف بھی ذہن کو منتقل کر دیا ہے۔ کسی سیارے کا اپنے اصلی برج میں آنا بھی اس کا شرف کہلاتا ہے۔ چنانچہ برج حمل میں آنا آفتاب کا شرف ہے۔

اُس مہر کو تو دیکھو یہ ذرّے ہیں جس کے سب — سر تاجِ آسمان و زمین و عرش رب
ابرِ کرم ہند و عجم خسرو عرب (۱۴) عالی ہمم امام اُمم شاہ تشنہ لب
جنباں زبانِ خشک ہے ذکرِ الٰہ میں — گویا کھڑے ہیں ختم رُسل رزم گاہ میں

کیا فوج تھی حسینؑ کی اس فوج کے نثار — ایک ایک آبروئے عرب فخرِ روزگار
جرّار و دیں پناہ و نمودار و نامدار (۱۵) لڑکوں میں سبزہ رنگ کوئی کوئی گل عذار
فوجیں کوئی سماتی تھیں ان کی نگاہ میں — وہ سب پلے تھے بیشۂ شیرِ الٰہ میں

ایک ایک ملک جرأت و ہمت کا بادشاہ — کیواں خدم سپہر حشم عرش بارگاہ
آنکھیں غزال[1] رشک مگر شیر کی نگاہ (۱۶) وہ رعب چتونوں میں کہ اللہ کی پناہ
دیکھا تو دل کو توڑ کے برچھی نکل گئی — ابرو ذرا جو بل گئے تلوار چل گئی

وہ اشتیاقِ جنگ میں لڑکوں کے ولولے — بیتاب تھے کہ دیکھیے تلوار کب چلے
چہرے وہ آفتاب سے وہ چاند سے گلے (۱۷) سب فاطمہ کی بیٹیوں کی گود کے پلے
اک اک رسولِ حق کی لحد کا چراغ تھا — جس پر علی نے کی تھی ریاضت وہ باغ تھا

اکبر سے عرض کرتے تھے سینہ سپر کیے — یہ نیمچے نہ لیویں گے دم بے لہو پیے
گر آج مر گئے تو قیامت تلک جیے (۱۸) صدقے ہوں اس قدم پہ یہ سر ہیں اسی لیے
آقا کے آگے لطف ہے تیغ آزمائی کا — آج آپ دیکھیے گا تماشا لڑائی کا

بچپن پہ خادمانِ اولوالعزم کے نہ جائیں — جب چاہیں معرکے میں ہمیں آپ آزمائیں
تن تن کے روکیں برچھیاں ہنس ہنس کے زخم کھائیں (۱۹) بجلی گرے تو منہ پہ جھجک کر سپر نہ لائیں
جھپکے پلک کسی کی تو آنکھیں نکالیے — بڑھ کر ہٹیں جو پانوں تو سر کاٹ ڈالیے

---

[1] اضافت مقلوب ہے۔ یعنی رشکِ غزال۔ جن پر ہرنوں کو رشک ہو۔

کہتے تھے مسکرا کے یہ زینب کے دونوں لال　　کھلتے ہیں خود دلیروں کے جوہر دمِ جدال
ہر وقت چاہیئے مددِ شبیرِ ذوالجلال (۲۰)　　نعرہ ابھی کریں تو لے عرصۂ قتال
اتری ہی تیغ جن کیلئے وہ دلیر ہیں　　سب ہم کو جانتے ہیں کہ شیروں کے شیر ہیں

یہ چہچے جو کرتے تھے باہم وہ گل عذار　　شبیر دیکھتے تھے کنکھیوں[1] سے بار بار
پاس آکے عرض کرتے تھے عباس نامدار (۲۱)　　سنتے ہیں آپ کہتے ہیں جو کچھ یہ جاں نثار
جرأت ٹپک رہی ہے ہر اک کے کلام سے　　یہ نیچے رکیں گے بھلا فوج شام سے

یہ سن یہ زور شور یہ عمریں یہ آن بان　　یہ بھولے بھولے منھ یہ جواں مردیاں یہ شان
باتیں رجز سے کم نہیں اللہ رے خوش بیان (۲۲)　　چلتی ہے ذوالفقار علی کی طرح زبان
کس دبدبے سے کاندھوں پہ نیزے سنبھالے ہیں　　گویا چلن لڑائی کے سب دیکھے بھالے ہیں

زینب کے لاڈلوں کی طرف دیکھیے حضور　　مثل عرق ٹپکتا ہے پیشانیوں سے نور
رخ پر جلال شیر خدا کا ہے سب ظہور (۲۳)　　پرتو گلوں کا ہے کہ چمکتی ہے برق طور
دونوں میں صاف حیدر و جعفر کے طور ہیں　　اللہ کی پناہ یہ تیور ہی اور ہیں

یہ ذکر تھا کہ بجنے لگا طبل اُس طرف　　شکل کتاں کی فوج نے باندھی ادھر بھی صف
تیروں نے رخ کیا سوئے ابنِ شہ نجف (۲۴)　　سینوں کو غازیوں نے ادھر کر دیا ہدف
تھا بسکہ شوقِ جنگ ہر اک رشکِ ماہ کو　　جوش آگیا وغا کا حسینی سپاہ کو

غصے سے آفتاب ہوئے مہ وشوں کے رنگ　　فوجوں پہ جا پڑیں یہ دلوں کو ہوئی امنگ
تن تن کے برچھیاں جو سنبھالے برائے جنگ (۲۵)　　بے چین ہو گئے فرسِ ابلق و سرنگ
پاس ادب سے شاہ کے صف بڑھ کے تھم گئی　　پٹری ہر اک سواری کی گھوڑے پہ جم گئی

---

۱ پوشیدہ نظر کرنا۔ نگاہ بچا کے دیکھنا۔ نیچی نظروں سے کسی کو اس طرح دیکھنا کہ اس کو خبر نہ ہو۔

۲ وہ فخریہ اشعار جو سپاہی میدان جنگ میں پڑھتے تھے۔

۳ خدا اپنی پناہ میں رکھے۔ کلمۂ خوف ہے۔

تنتا ہوا بڑھا کوئی قبضے کو چوم کے
بھالا کسی نے رکھ لیا کاندھے پہ جھوم کے
بولا کوئی یہ غول ہیں کیا شام و روم کے
(٢٦) ٹکڑے اڑائیں گے عمر و شمر شوم کے
نامرد ہیں جو آنکھ چراتے ہیں مرد سے
دونوں کو چار کر کے پھریں گے نبرد سے

دو لاکھ سے نظر کسی غازی کی لڑ گئی
بل کھا کے رخ پہ زلف کسی کی اکڑ گئی
چتون کسی کی شورِ دہل سے بگڑ گئی
(٢٧) منہ سرخ ہو گیا شکن ابرو پہ پڑ گئی
نکلا کوئی سمند کو رانوں میں داب کے
غصے سے رہ گیا کوئی ہونٹوں کو چاب کے

بڑھ کر کسی نے تیر ملایا کمان سے
نیزہ کوئی ہلانے لگا آن بان سے
نعرہ کسی کا پار ہوا آسمان سے
(٢٨) تلوار کھینچ لی کسی صفدر نے میان سے
اک شور تھا کہ تلخ کیا ہے حیات کو
لاشوں سے چل کے پاٹ دو نہرِ فرات کو

سنتے ہی یہ کلام جوانان نامور
لڑکے الگ کھڑے ہوئے غول اپنا باندھ کر
کہتے تھے نیچے لیے وہ غیرتِ قمر
(٢٩) یا رب شکست کوفیوں کو دے ہمیں ظفر
سر کے نہ پھر جو بڑھ کے وغا میں قدم گڑے
جا کر درِ یزید پہ اپنا علم گڑے

عباس شہ سے کہتے تھے بپھرے ہوئے ہیں شیر
تیر اس طرف سے آ چکے اب کس لیے ہے دیر
دو دن کی بھوک پیاس میں ہیں زندگی سے سیر
(٣٠) مولا غلام سے نہیں رکنے کے یہ دلیر
پاسِ ادب سے غیظ کو ٹالے ہوئے ہیں یہ
شیرِ خدا کی گود کے پالے ہوئے ہیں یہ

کس کو ہٹائے کس کو سنبھالے یہ جاں نثار
مرنے پہ ایک دل ہے بہتر وفا شعار
ہو مصلحت تو دیجیے اب اذنِ کارزار
(٣١) ایسا نہ ہو کہ جا پڑیں لشکر پہ ایک بار
برہم ہیں سرکشی پہ سوارانِ شام کی
اکبر کی بات مانتے ہیں نہ غلام کی

جب روکتا ہوں میں انھیں اے آسماں سریر
کہتے ہیں کیوں امام کی جانب لگائے تیر
باندھے ہے سرکشی پہ کمر لشکرِ شریر
(٣٢) ہنگامِ جنگ شیر کے بچے ہوں گوشہ گیر
کس قہر کی نظر سے لعینوں کو تکتے ہیں
بچوں کو ہو یہ غیظ کہ آنسو ٹپکتے ہیں

اک اک جری کو نشۂ جرأت کا جوش ہے   عالم ہے بیخودی کا یہ مرنے کا ہوش ہے
ہر صف میں یا علی ولی کا خروش ہے   (۴۳) کہتے ہیں بار بار کہ سر بار دوش ہے
مشتاق ہیں وہ پیاس میں تیغوں کے گھاٹ[۱] کے   ڈر ہے کہ مر نہ جائیں گلے کاٹ کاٹ کے

حسرت سے کی سوئے رفقا شاہ نے نظر   بولے حبیب نذر کو حاضر ہیں سب کے سر
فرمایا شہ نے ہم بھی ہیں آمادۂ سفر   (۴۴) اچھا بڑھے جہاد کو ایک ایک نام ور
یہ راہ حق ہو جو قدم آگے بڑھائے گا   دربار مصطفےٰ[۲] میں وہی پہلے جائے گا

مژدہ یہ سن کے شاد ہوئے غازیان دیں   اک اک دلیر جانے لگا سوئے فوج کیں
جب نعرہ زن ہوئے صفت شیر خشم گیں   (۴۵) تھرائے آسماں کے طبق ہل گئی زمیں
برپا تھا شور حشر دلیروں کی حرب سے   فوجیں تو کیا جہاں تہ و بالا تھا ضرب سے

اللہ رے جہاد حبیب و زہیر[۳] قین   گویا بپا تھا معرکۂ خندق و حنین
جب مر گئے وہ عاشق سلطان مشرقین   (۴۶) مقتل میں پیٹتے ہوئے دوڑے گئے حسینؑ
یوں جا کے روئے ان کے تن پاش پاش پر   جس طرح بھائی روتا ہے بھائی کی لاش پر

خالی ہوا قدیم رفیقوں کا جب پرا   کانپا سپہر شہ نے دم سرد یوں بھرا
کٹنے لگا عزیزوں کا بھی جب چمن ہرا   (۴۷) گہ روئے آپ ہاتھ جگر پر کبھی دھرا
لڑکے جو یک بیک کئی ہاتھوں سے کھو گئے   ٹکڑے حسنؑ[۴] کی طرح کلیجے کے ہو گئے

---

۱ وہ جگہ جہاں سے تلوار کا خم شروع ہوتا ہے۔

۲ منتخب۔ برگزیدہ۔ رسول عربی کا ایک لقب۔

۳ زہیر ابن قین۔ امام حسین کے ایک وفادار رفیق۔

۴ امام حسنؑ امام حسینؑ کے بڑے بھائی تھے۔ آپ کو زہر پلایا گیا تھا جس نے آپ کے کلیجے کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔

تھی قہر حق عقیلؑ کے پوتوں کی کارزار — شمشیر حیدری کا نمونہ تھے جن کے وار
عزت عرب کی رکھ گئے جعفر کے یادگار (۳۸) تھے تین چار شیر کہ جھپٹے سوئے شکار
فتح و ظفر تھی مثل علیؑ اختیار میں — پنجے میں تھا وہی جسے تاکا ہزار میں

نکلے برادران علمدار صف شکن — دکھلا دیئے علی کی لڑائی کے سب چلن
بے سر تھے مورچوں میں جوانان پیل تن (۳۹) لاشوں پہ لاشیں گرتی تھیں پڑتا تھا ان پہ رن
آنکھوں میں پھر رہی تھی چمک ذوالفقار کی — عباس داد دیتے تھے ایک ایک وار کی

تھا چھوٹے بھائیوں کے لئے مضطرب جو دل — گر شہ کے پاس تھے کبھی لشکر کے متصل
نعرہ یہ تھا کہ شیر ہے ماں کا تمہیں بحل (۴۰) شیر در کے نہ ہاتھ بدن گو ہے مضمحل
یہ وقت آبرو ہے بڑی جد و کد کرو — ہاں بھائیو امام کی اپنے مدد کرو

الٹو پروں کو بڑھ کے صفوں کو بچھا کے آؤ — ساحل کے پاس خون کا دریا بہا کے آؤ
جب باگ اٹھاؤ فوج کے اس پار جا کے آؤ (۴۱) یا مر کے آؤ یا انھیں رن سے بھگا کے آؤ
ہاں صفدر نشاں نہ رہے فوج شام کا — بیٹوں کو پاس چاہیئے بابا کے نام کا

رو کر حسین کہتے تھے بھائی سے دم بدم — دولت پدر کی لٹتی ہے اور دیکھتے ہیں ہم
جینے نہ دیگا آہ ہمیں بھائیوں کا غم (۴۲) عباس عرض کرتے تھے اے قبلۂ امم
اب باپ کی جگہ شہِ عالی مقام ہیں — صدقے نہ کس طرح ہوں کہ ہم سب غلام ہیں

بے جاں ہوئے جو راہ خدا میں وہ شیر نر — حضرت ضعیف ہو گئے خم ہو گئی کمر
ماتم میں تھے کہ موت نے لوٹا حسنؑ کا گھر (۴۳) اک دم میں قتل ہو گئے دو نوجوان پسر
سب چل بسے نبیؐ و علی پاس رہ گئے — ستر دو تن میں اکبر و عباس رہ گئے

---

۴۱ عقیل حضرت علی کے بھائی تھے ان کے دو پوتے جعفر بن محمد اور عبداللہ بن مسلم کربلا میں شہید ہوئے۔

۴۲ حضرت علی اکبر صورت میں رسولؐ سے اور حضرت عباس رعب و شجاعت میں حضرت علی سے مشابہ تھے۔ اس لئے شاعر نے مجازاً ان کو نبیؐ و علی کہا ہے۔

(۴۴)
آیا نظر جو لاشۂ نوشاہ[۱] نیک خو
کی غیظ کی نظر طرفِ لشکرِ عدو
اکبر کی چشمِ تر سے ٹپکنے لگا لہو
پہلو سے آئے روتے ہوئے شہ کے روبرو
نکلی یہ بات جوشِ بکا میں زبان سے
قاسم کے ساتھ جائینگے ہم بھی جہان سے

(۴۵)
بچپن سے ہم سے یہ نہ ہوئے تھے کبھی جدا
طفلی کا ساتھ چھوٹ گیا وا مصیبتا
سوئے تو ایک فرش پہ کھیلے تو ایک جا
مرجائے ایسا بھائی تو جینے کا لطف کیا
حسرت یہ ہو کہ تیغوں سے تن پاش پاش ہو
پہلو میں ابن عم کے ہماری بھی لاش ہو

(۴۶)
شہ نے کہا کہ سچ ہو یہ ایسا ہی ہے الم
بازو کا ٹوٹنا اجل آنے سے کیا ہے کم
خالق جہاں میں بھائی کو بھائی کا دے نہ غم
مر مر کے غم میں بھائی حسن کے جیے ہیں ہم
تازہ تھا غم پدر کا خوشی دل سے دور تھی
عباس نامدار نہ ہوتے تو موت تھی

(۴۷)
بھائی کے بعد ان سے ملی لذتِ حیات
خالی نہ پائی مہر و مروت سے کوئی بات
بیکس کے غمگسار تھے یہ یا خدا کی ذات
سویا جو میں تو ان کو کٹی جاگنے میں رات
صدمے بھلائے دل سے حسنؑ کی جدائی کے
رونے نہیں دیا مجھے ماتم میں بھائی کے

(۴۸)
ہے ان کے اتحاد کا سب سے جدا مزہ
ملتا ہے بات بات میں ہر دم نیا مزہ
بیٹے کا لطف بھائی کا حظ باپ کا مزہ
اوجھل یہ آنکھ سے ہوں تو جینے کا کیا مزہ
قائم رکھے خدا کہ علیؑ کے نشان ہیں
مالک یہی ہیں گھر کے یہی تن کی جان ہیں

(۴۹)
قوت جگر کی تم ہو تو یہ بازوؤں کا زور
ہوتا ہے زخمِ دل پہ نمک آنسوؤں کا شور
بچھڑا جو دو میں ایک تو ہم ہیں کنارِ گور
جب پتلیاں جدا ہوں تو چشمِ بشر ہے کور
تم پہلوؤں میں تھے تو یہ بیکس سنبھل گیا
پھر خانہ ہو جسم سے جب دم نکل گیا

۱؎ حضرت قاسم ابن حسنؑ کا عقد بقول بعض شہادت سے ایک دن قبل امام حسینؑ کی ایک صاحبزادی کے ساتھ ہوا تھا۔

(۵۰)

ان سے نشاں علی کا ہو تم سے ہمارا نام
گھر مٹ گیا نبی کا جو دونوں ہوئے تمام
میت کے دفن کا بھی مقدم ہے اہتمام
مرنے کے بعد کوئی تو آئے ہمارے کام
تربت پہ تم سے گل ہوں تو دل باغ باغ ہو
اندھیری ہی جو قبر پہ بے چراغ ہو

(۵۱)

کیجو نہ ذکر ہجر یہ صدمہ ہے دل خراش
پھر پدر کہ وکفن وگور کی تلاش
ہوگا یہ جسم ظلم کی تیغوں سے پاش پاش
دو شخص چاہیے کہ اٹھائیں ہماری لاش
رونے کو کوئی دوست نیاور سرہانے ہو
فرزند یا بھتیج ہو برادر سرہانے ہو

(۵۲)

اکبر نے سن کے باپ سے یہ اشک خوں بہائے
عباس بول اٹھے نہ خدا وہ گھڑی دکھائے
ہے زندگی یہی کہ نہیں پہلے موت آئے
خاک اس غلام پر کہ جو آقا کی لاش اٹھائے
دستِ قوی ہیں نیزہ و صمصام[1] کیلئے
پائے ہیں کیا یہ ہاتھ اسی کام کیلئے

(۵۳)

بس گر پڑا یہ کہہ کے قدم پر وہ باوفا
جھک کر کہا حسین نے بھائی یہ کیا یہ کیا
قاسم کا ذکر کرتے تھے ہم شکل مصطفےٰ
باتیں تو ان سے تھیں تمھیں کیوں غیظ آ گیا
ہم تم تو ساتھ گلشنِ ہستی سے جائینگے
اچھا ہماری لاش کو اکبر اٹھائینگے

(۵۴)

اٹھیے قدم سے آپ کی الفت کے میں نثار
غصے[2] میں بھول جاتے ہو بھیا ہمارا پیار
آنکھیں قدم پہ مل کے یہ بولا وہ نامدار
بے اذن جنگ سر نہ اٹھائے گا خاکسار
ایسا نہ ہو خجل ہوں رسالتمآب سے
پہلے مروں گا اکبر عالی جناب سے

[illegible]

---

۱ عمدہ قسم کی تلوار جو ٹیڑھی نہ ہو سکے۔

۲ غصے کی حالت میں تمھیں خیال نہیں رہتا کہ ہم کو تم سے کتنی محبت ہے۔ ہم تم کو لڑنے مرنے کی اجازت کیوں کر دے سکتے ہیں۔

صدقہ علی کی روح کا اکبر کو دیجیے
دے کر قسم شبیہ پیمبر[۱] کو دیجیے
نورِ نگاہ بانوئے[۲] بے پر[۳] کو دیجیے
اے آفتاب دیں مہ انور کو دیجیے (۵۵)
پہلے رضا ملے تو بہت نیک نام ہوں
آقا یہ شاہزادہ ہو اور میں غلام ہوں

شہ نے کہا کہ سر تو قدم سے اٹھائیے
لیجیے رضائے جنگ نہ آنسو بہائیے
فرقت میں ہم مریں کہ جئیں خیر جائیے
اپنی سکینہ جان سے جا کر مل آئیے (۵۶)
زوجہ کو پیٹتے ہوئے سر دیکھ لیجیے
بچوں کو اور ایک نظر دیکھ لیجیے

عباس شہ کے گرد پھرے اٹھ کے سات بار
بھائی کو گھر میں لے کے چلے شاہ ذی وقار
بولا یہ پیک شاطر فوج ستم شعار
لو اذن جنگ پا چکے عباس نامدار (۵۷)
خود دیکھ کر یہ حال پھرا ہوں میں راہ سے
ملنے گئے ہیں خیمے میں ناموس[۴] شاہ سے

تھے آگے آگے ہاتھوں سے تھامے کمر امام
نعرہ یہ دمبدم تھا کہ اب ہم ہوئے تمام
تیغوں سے گھاٹ روک لو آیا وہ نیک نام
اب معرکہ ہے قہر کا اے ساکنانِ شام (۵۸)
دیکھو بچے رہو کہ لڑائی ہے شیر سے
چھوٹے گی مشکلوں میں ترائی دلیر سے

دل ہل گئے سپاہ کے سنتے ہی یہ خبر
کانپے مثال بید جوانانِ پرجگر
ہل چل میں اس طرف کے پرے ہو گئے ادھر
ساحل سے ہٹ کے نہر پکاری کہ الحذر (۵۹)
پیچھے ہٹیں صفیں یہ تلاطم عیاں ہوا
دریا[۵] جو باڑھ پر تھا وہ الٹا رواں ہوا

---

۱ امام حسین کے صاحبزادے حضرت علی اکبر جو پیغمبرِ عرب حضرت محمدؐ سے بہت مشابہ تھے۔

۲ حضرت علی اکبر کی مادرِ گرامی کا نام امِ لیلیٰ تھا حضرت شہربانو آپ کی سوتیلی ماں تھیں مگر مرثیوں میں اکثر ان کو حضرت علی اکبر کی حقیقی والدہ قرار دیا گیا ہے۔

۳ بے چارہ۔ مجبور۔ بے بس۔

۴ اہل حرم۔ عزت والی عورتیں۔

۵ یزید کی کثیر فوج جو آگے بڑھتی چلی آتی تھی۔ اس کو بڑھتے ہوئے دریا سے استعارہ کیا ہے۔

(۶۰)

ٹوٹے وہ مورچے جو بندھے تھے پئے جدال — برچھی گری زمیں پہ کسی کی کسی کی ڈھال
اللہ ری ہیبتِ خلفِ شیرِ ذوالجلال — کانپی زمیں کھڑے ہوئے روئیں تنوں کے بال
منھ زرد ہو کے رہ گیا ہر نوجوان کا — دشتِ نبرد کھیت بنا زعفران کا

(۶۱)

تھا کشمکش بہت میں غل کہ یہ روزِ انقلاب — الٹے گا ان میں کا ورق ابنِ بوتراب
اس شیر پر نہ ہوگی کوئی فوج فتح یاب — بس اب بنائے عالمِ ارکاں ہوئی خراب
حملہ غضب ہے بازوئے شاہِ حجاز کا — لنگر نہ ٹوٹ جائے زمیں کے جہاز کا

(۶۲)

ڈر سے ہوا تھی ایک طرف گرد اک طرف — پھرتے تھے خیبری بھی دمِ سرد اک طرف
سمٹے ہوئے تھے کوفے کے نامرد اک طرف — تھے روسیاہ شام کے سب زرد اک طرف
بھاگے تھے نیزہ باز لڑائی کو چھوڑ کے — ضیغم نکل گئے تھے ترائی کو چھوڑ کے

(۶۳)

تھی ابتری سپاہِ ضلالت شعار میں — اس صف میں تھی وہ صف یہ قطار اس قطار میں
سو بار جو لڑے تھے اکیلے ہزار میں — وہ جائے امن ڈھونڈھتے تھے کارزار میں
پھرے تھے زرد خوف سے حیدر کے لال کے — نامرد منھ چھپائے تھے گھونگھٹ[1] میں ڈھال کے

(۶۴)

سرکردہائے فوجِ مخالف تھے بے حواس — کچھ شمر کے قریب گئے کچھ عمر[2] کے پاس
سب کا یہ قول تھا کہ ہوئی زندگی سے یاس — ضربِ علی ہے ضربِ علمدارِ حق شناس
طاقت سے ہیں بھرے ہوئے بازو دلیر کے — خیبر کشا[3] کا زور ہے پنجے میں شیر کے

(۶۵)

اس فوج میں تو ہے یہ تزلزل یہ انتشار — ہتھیار ادھر لگاتے ہیں عباس نامدار
مضطر ہیں بیبیاں شہِ والا ہیں بے قرار — بھائی کے منھ کو دیکھ کے روتے ہیں زار زار
بیٹا کھڑا ہے چاک گریباں کیے ہوئے — روتی ہے سوکھی مشک سکینہ[4] لیے ہوئے

---

[1] ڈھال کی آڑ کو گھونگھٹ کہہ کر شاعر نے یزیدی فوج کے بزدل سپاہیوں کو عورت بنا دیا۔ یعنی جس طرح عورتیں گھونگھٹ میں منھ چھپاتی ہیں اسی طرح وہ ڈھال میں منھ چھپائے ہوئے تھے۔ [2] یزیدی فوج کا سردار عمر ابن سعد [3] خیبر کا قلعہ فتح کرنے والا، مراد حضرت علی [4] حضرت سکینہ امام حسین کی چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ تین برس کا سن تھا اور دو دن کی پیاس۔ مشک اس غرض سے لائی تھیں کہ اپنے چچا سے پانی منگوائیں۔

منھ دیکھتی ہے باپ کا جب وہ بہ چشم تر
کہتے ہیں یہ اشارے سے سلطان بحر و بر
(۶۶)
لٹتا ہے باپ تم کو سکینہ نہیں خبر
جانے نہ دو چچا کو ہمیں چاہتی ہو گر
آنسو بہا بہا کے نہ پانی کا نام لو
دامن قبا کا ننھے سے ہاتھوں سے تھام لو

بھائی کے اضطراب سے زینب کا ہو یہ حال
ڈھلکی ہوئی ہو سر سے ردا اور کھلے ہیں بال
(۶۷)
عباس سے یہ کہتی ہے روکر بصد ملال
چھوڑو نہ شہ کو اے اسد کبریا کے لال
کیا کہتے ہو سکینہ سے منھ موڑ موڑ کے
بھیا کدھر چلے مرے بھائی کو چھوڑ کے

دیکھو تو حال سبط رسول فلک اساس
بیٹے کا غم بھتیجے کا ماتم ہجوم یاس
(۶۸)
ہے کثرت سپاہ میں تنہا وہ حق شناس
قربان جاؤں تم تو رہو بے وطن کے پاس
عاشق ہو دلبر اسد ذوالجلال کے
بازو قوی تمھیں سے ہیں ہر کے لال کے

عباس کہتے ہیں کہ نہ جاؤں تو کیا کروں
کیونکہ نہ حق امام زماں کا ادا کروں
(۶۹)
الٹوں صفیں ہزاروں سے تنہا وغا کروں
یہ سر ہی اس لیے کہ قدم پر فدا کروں
پہنچا ہی فیض سید خوش خو کے ہاتھ سے
دنیا میں کچھ تو کام ہو بازو کے ہاتھ سے

رخصت طلب ہو شاہ سے اکبر سا لالہ فام
شہزادہ مرنے جائے سلامت رہے غلام
(۷۰)
للہ رو کیے نہ اب اے خواہر امام
وہ امر کیجیے کہ بڑھے جس سے میرا نام
بیکس ہوں ساتھ ماں نہیں سر پہ پدر نہیں
میں آپ کا غلام تو ہوں گو پسر نہیں

باتیں یہ سن کے روتی ہیں زینب جھکائے سر
تھرا رہی ہے زوجۂ عباس نامور
چہرہ تو فق ہو گود میں ہے چاند سا پسر
مانع ہو شرم روتی ہے منھ پھیر پھیر کر
موقع نہ روکنے کا ہو نہ بول سکتی ہو
حضرت کے منھ کو نرگسی آنکھوں سے تکتی ہو

ن دو نسخۂ خصال

لہ بھائی سے دل کو جو تقویت رہتی ہو اس کی بنا پر اسے بازو اور قوت بازو کہتے ہیں۔

لہ یہ حسرت بھری نگاہ امید و بیم کی حالت ظاہر کرتی ہے کہ دیکھیے امام حسین میرے شوہر کو جنگ کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں، اس نگاہ میں رحم کی التجا اور اذن جنگ نہ دینے کی درخواست بھی مضمر ہے۔

کہتی ہے رو کے بانوے عالم سے بار بار — ہم کو تباہ کرتے ہیں عباس نامدار
ہے لونڈیوں کے باب میں بی بی کو اختیار — کچھ آپ بولتی نہیں اس وقت میں نثار
کہیے جو روکنے کی کوئی انکو راہ ہو — اب عنقریب ہے کہ مرا گھر تباہ ہو

(۴۳)
اکبر کا واسطہ کوئی تدبیر کیجیے — امداد بہر حضرتِ شبیرؑ کیجیے
کچھ دل کو ہو قرار وہ تقریر کیجیے — پٹکا وہ باندھتے ہیں نہ تاخیر کیجیے
اک دل ہے میرا اور کئی غم کے تیر ہیں — بی بی میں کیا کروں مرے بچے صغیر ہیں

(۴۴)
عباس دیکھتے ہیں جو زوجہ کا اضطرار — ہوتا ہے تیرِ غم جگرِ ناتواں کے پار
روتے ہیں خود مگر یہ اشارہ ہے بار بار — شوہر کے غم میں یوں کوئی ہوتا ہے بیقرار
آؤ ادب سے دلبرِ زہرا کے سامنے — روتی ہیں لونڈیاں کہیں آقا کے سامنے

(۴۵)
کھولا ہے گوندھے بالوں کو صاحب[1] یہ کیا کیا — پیٹو نہ سر کو روتا ہے فرزندِ مہ لقا
خیر النسا[2] کے لال پہ ہوتے ہیں ہم فدا — شادی کا ہے مقام کہ ماتم کی ہے یہ جا
ایذا میں صبر صاحبِ ہمت کا کام ہے — میری بھی آبرو ہے تمھارا بھی نام ہے

(۴۶)
لو پوچھ ڈالو آنسوؤں کو بہرِ ذوالجلال — دیکھو زیادہ رونے سے ہوگا ہمیں ملال
میری مفارقت کا نہ کیجو کبھی خیال — قائم تمھارے سر پہ رہے فاطمہ کا لال
غم چاہیے نہ آہ و بکا چاہیے تمھیں — شہ کی سلامتی کی دعا چاہیے تمھیں

(۴۷)
صدقے ہیں ابنِ فاطمہ پر مجھ سے سو غلام — دیکھو نہ روتے دیکھ لیں تم کو کہیں امام
کیا اشکِ خوں بہا کے بگاڑو گی میرا کام — ہم ہاتھ جوڑتے ہیں یہ ہے صبر کا مقام
پوچھیں حضور گر کہ تمھیں کیا قبول ہے — صاحب یہ کہیو تم کہ رنڈاپا قبول ہے

---

[1] مالک۔ دوست، شوہر اور زوجہ ایک دوسرے کو اس لفظ سے مخاطب کرتے ہیں۔

[2] عورتوں میں سب سے اچھی۔ مراد حضرت فاطمہ۔

دیکھو کہ گھر میں اور بھی رانڈیں ہیں تین چار — آداب شہ سے چپ ہیں نہیں کوئی بیقرار

(۷۸) رہ جائے بات کرتے ہیں وہ امر ہوشیار — دنیا ہے بے ثبات زمانہ ہے بے مدار

کیا کیا نہ تفرقے ہوئے ایک ایک آن میں — صاحب سدا کوئی بھی جیا ہے جہان میں

قاسم کو دیکھو جانب کبرا کرو نگاہ — گزری جو شب تو صبح کو گھر ہو گیا تباہ

(۷۹) دشمن کو بھی دکھائے نہ اللہ ایسا سیاہ — کیا صابرہ ہے دختر شبیر واہ واہ

سہتے ہیں یوں جہاں میں جفا رانڈ ہونے کی — آواز بھی بھلا کوئی سنتا ہے رونے کی

آفت میں صبر کرتی ہیں اس طرح بیبیاں — ہونا ہے صابروں کا مصیبت میں امتحاں

(۸۰) جل جائے دل مگر نہ اٹھے آہ کا دھواں — اف کیجو نہ منھ سے جو پہنچے لبوں پہ جاں

بگڑ جائے ہے کہ وقت پہ کیا کام کر گئی — چھوٹی بہو علی کی بڑا نام کر گئی

شوہر نے یہ کلام سنے جب بچشم تر — چپ ہو گئی وہ صاحب ہمت جھکا کے سر

(۸۱) ہتھیار سج کے حضرت عباس نامور — آئے قریب لخت دل سید البشر[1]

صدمے سے رنگ سبط نبی زرد ہو گیا — کانپے یہ دست و پا کہ بدن سرد ہو گیا

جوں جوں قریب آتے تھے عباس نامور — بیتاب تھے حسین سنبھالے ہوئے جگر

(۸۲) کہتے تھے اضطراب میں جھک کر ادھر ادھر — جینے نہ دے گا آہ ہمیں صدمۂ کمر

ہے زیست تلخ فاطمہ کے نور عین کو — زینب کہاں ہو آکے سنبھالو حسین کو

سب گھر کی بیبیوں سے کہو میرے پاس آئیں — بانو کہاں ہیں زوجۂ عباس کو بلائیں

(۸۳) گودی میں تشنہ کام سکینہ کو جلد لائیں — کوچ اب یہاں سے ہے ہمیں سب آکے دیکھ جائیں

یہ نوجواں سنبھالے گا گھر جب مروں گا میں — عباس سے ہر اک کی سفارش کروں گا میں

---

[1] انسانوں کا سردار۔ مراد پیغمبر عرب حضرت محمدؐ۔

(۸۴)

یہ سن کے ساری بیبیاں آئیں بحالِ زار — بولے قدم پہ جھک کے یہ عباس نامدار
اے افتخار عالمیاں نورِ کردگار — ہل من مبارز[1] کا ادھر غل ہے بار بار
ہیں ذرہ پروری کے چلن آفتاب میں — آقا یہ دیر کس لیے خادم کے باب میں

(۸۵)

لڑکوں نے معرکے میں کیے اپنے اپنے نام — کیا میں غلام خاص نہیں یا شہِ انام
ایسا دن اور بھی کوئی ہوئے گا یا امام — کس کام کا جو آج نہ کام آئے یہ غلام
مشکل ہے ایسے وقت میں رکنا دلیر کا — آخر پسر[2] ہوں شیر الٰہی سے شیر کا

(۸۶)

ہوتا جو سب سے پہلے فدا خادمِ جناب — خوش ہوتی خاکسار سے روحِ ابو تراب
اب ہوں ہر اک کے آگے خجالت سے آب آب — زہرا سے بھی حجاب ہے شبر سے بھی حجاب
اب بھی نہ تیغ و تیر اگر تن پہ کھاؤں گا — مولا بتائیے کسے پھر منہ دکھاؤں گا

(۸۷)

ساتھ آپ کے سہوں گا اگر قتل کی جفا — مجھ سے رسول پاک خوشی[3] ہوں گے یا خفا
بیزار کیا نہ ہوگا دلِ شاہ لافتا[4] — پھر فاطمہ کہیں گی مجھے صاحبِ وفا
مرنے کا حظ نہ جینے کا مطلق مزا رہا — انساں کی آبرو نہ رہی جب تو کیا رہا

---

[1] ہے کوئی مقابلہ کرنے والا۔ قدیم زمانے میں عرب کا دستور تھا کہ ایک ایک سپاہی میدان جنگ میں اترتا تھا اور فوج مخالف سے اپنا مقابل طلب کرتا تھا۔

[2] یعنی میں اور کچھ نہ سہی حضرت علی کا بیٹا تو ہوں ہی جو شجاعت میں بے نظیر تھے اور جنھوں نے راہ خدا میں ایسا جہاد کیا کہ شیر خدا کہلائے۔ مجھ میں باپ کی شجاعت کا کچھ اثر تو ضرور ہی ہوگا۔

[3] خوش کے معنی میں خوشی کا استعمال اب متروک ہے۔

[4] حضرت علی ” لافتا “ سے ایک مشہور عربی جملے کی طرف اشارہ ہے جس میں حضرت علی کی شجاعت کی مدح ہے۔ وہ جملہ یہ ہے۔ لَا فَتیٰ اِلَّا عَلِی لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالفقار۔ (یعنی علی کے سوا کوئی جوان نہیں اور ذوالفقار کے سوا کوئی تلوار نہیں۔

(۸۸)

پالا ہے مجھ کو یا شہ دلگیر آپ نے — کی ہے ہمیشہ پیار سے توقیر آپ نے
بندھوائی ہے کمر سے یہ شمشیر آپ نے — بخشی ہو سب میں عزت و توقیر آپ نے
وقت مدد ہو آج بھی امداد کیجئے
بندہ سمجھ کے اب مجھے آزاد کیجئے

(۸۹)

گردن ہلا کے شہ نے کہا آہ کیا کروں — مشکل ہو سخت اے مرے اللہ کیا کروں
جینے نہ دے گا یہ غم جانکاہ کیا کروں — چھٹتا ہو اب برادر ذی جاہ کیا کروں
دم بھر کی زندگی مجھے دشوار ہو گئی
سب تو خفا تھے موت بھی بیزار ہو گئی

(۹۰)

غازی نے رکھ دیا قدم شاہ دیں پہ سر — بولے گلے لگا کے شہنشاہ بحر و بر
اے تن کی جان اے سبب قوت جگر — یوں ہے خوشی تو خیر جہاں سے کرو سفر
بھائی نہ ہو تو بھائی کی مٹی خراب ہے
اچھا تمہارا کوچ مرا پا تراب[1] ہے

(۹۱)

روتا ہوا جھکا پئے تسلیم وہ جری — سب تشنے مشک دوش مبارک پہ جب دھری
اک آہ سرد زوجہ عباس نے بھری — صدمے سے رنگ زرد تھا اور تن میں تھرتھری
سر سے ردا بھی دوش تلک آ کے گر پڑی
بانو کے پاس خاک پہ غش کھا کے گر پڑی

(۹۲)

نکلا وہ شیر خیمے سے باہر علم لیے — مجرے کو آئی فتح سپاہ حشم لیے
جرأت نے بڑھ کے بوسہ تیغ دودم[2] لیے — نصرت نے چومے ہاتھ ظفر نے قدم لیے
خورشید کا جلال نگاہوں سے گر گیا
اقبال سر کے گرد دُہائی کے پھر گیا

(۹۵)

آیا سجا ہوا وہ سمند براق سیر[3] — تھا جو فلک پہ اڑنے کو تیار مثل طیر
ہوتا تھا اسکے ڈر سے غزالوں کا حال غیر — رن میں سیاہ شر اسے روکے تو یہ بخیر[4]
صرصر قدم کی گرد کو پاتی نہیں کبھی
ڈھونڈھیں بشر یری نظر آتی نہیں کبھی

---

[1] سفر کی تیاری۔ اگر سفر کسی برے دن سے شروع ہونیوالا ہو تو کسی اچھے دن کچھ سامان کسی جگہ پہنچا دیتے ہیں اور اپنے قیام کی جگہ بدل دیتے ہیں گویا اسی دن سے سفر شروع کر دیتے ہیں اس کو پا تراب کرنا کہتے ہیں

[2] دودھاری تلوار [3] وہ تیز رفتار آسمانی جانور جو شب معراج رسول کو لے گیا اور کل عالم بالا کی سیر کرا کے دم بھر میں واپس لے آیا۔ [4] یہ انہونی بات ہو۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔

وہ زیب[1] زین کی وہ نازکی پھبن   زیور سے جیسے ہوتی ہے آراستہ دولہن
چشم سیاہ دیدۂ آہو پہ طعنہ زن   (۹۴) سرعت یہ تھی کہ بھولتے تھے چوکڑی ہرن
جادو تھا معجزہ تھا پری تھا طلسم تھا   پاکھر[2] تھی زرہ میں تہمتن[3] کا جسم تھا

رکھا قدم رکاب میں حیدر کے لال نے   نعلین پا کو فخر سے چوما ہلال نے
بخشی جو سدر[4] زیں کو ضیا خوش جمال نے   (۹۵) دُم کو جھنور کیا فرس بے مثال نے
کس ناز سے وہ رشک غزال ختن چلا   طاؤس تھا کہ سیر کو سوئے چمن چلا

خوشبو سے ارض پاک ریاض جناں بنی   گرد اڑ کے غازۂ رخ لیلیٰ وشاں بنی
جلوے سے راہ دشت بلا کہکشاں بنی   (۹۶) ذرّے بنے نجوم زمیں آسماں بنی
سم بدر تھے تو نعل بھی چاروں ہلال تھے   نقش سم فرس سے ہزاروں ہلال تھے

وہ دبدبہ وہ سطوت شاہانہ وہ شباب   تھرا رہا تھا جس کی جلالت سے آفتاب
وہ رعب حق کہ شیر کا زہرہ ہو آب آب   (۹۷) صولت میں فرد و فرد جرأت میں انتخاب
تیور میں سارے طور خدا کے ولی کے ہیں   شوکت پکارتی ہو کہ بیٹے علی کے ہیں

پہنچے جو دشت کیں میں اڑاتے ہوئے فرس   گھوڑے کو ہاتھ اٹھا کے یہ آواز دی کہ بس
دیکھیں صفیں جمی جو چپ و راست و پیش و پس   (۹۸) نعرہ کیا کہ نہر پہ جانے کی ہے ہوس
روکے گا جو وہ موت کے پنجے میں آئے گا   ہٹ جاؤ سب کہ شیر ترائی میں جائے گا

روکے ہمیں نکل کے جو طاقت کسی میں ہو   لے تیغ میاں سے جو شجاعت کسی میں ہو
گرمائے رخش کو جو حرارت کسی میں ہو   (۹۹) آئے جو حرب و ضرب کی قدرت کسی میں ہو
دو ہاتھ میں علی کے پسر دار پار ہیں   دریا نہیں کہ رک گیا ہم ذوالفقار ہیں

---

[1] زینت۔ سجاوٹ۔ زین اور زیں میں تجنیس محرف ہے۔ [2] گھوڑے کی زرہ۔
[3] طاقت ور۔ رستم کا ایک نام۔
[4] زین کا درمیانی حصہ جہاں سوار بیٹھتا ہے۔

(۱۰۰)

تم کیا پہاڑ بیچ میں گر ہو تو ٹال دیں
شیروں کو ہم ترائی سے باہر نکال دیں
مہلت نہ ایک کو دمِ جنگ و جدال دیں
پانی تو کیا ہے آگ میں گھوڑے کو ڈال دیں
منہ دیکھتے رہیں جو نگہباں ہیں گھاٹ کے
لے جائیں گھر پہ تیغ سے دریا کو کاٹ کے[۱]

(۱۰۱)

سرکش ہیں سب ہماری زبردستیوں سے زیر
دادا شجاع باپ اولوالعزم ہم دلیر
جب رن پڑا ہے کر دیئے ہیں زخمیوں کے ڈھیر
لائے ہیں جا کے آگ سے پانی خدا کے شیر
عفریت[۲] بھاگتے ہیں وہ چوٹیں ہماری ہیں
بیرالعلم[۳] میں کود کے تلواریں ماری ہیں

(۱۰۲)

جرأت جلو میں رہتی ہے نصرت رکاب میں
لیتے ہیں گھاٹ بڑھ کے تیغوں کی آب میں
لکھے ہوئے ہیں شیروں کے حملے کتاب میں
فصلیں ہیں اپنے زور کی خیبر کے باب میں
ناصر ہیں بادشاہ فلک بارگاہ کے
دفتر[۴] الٹ دیئے ہیں عرب کی سپاہ کے

(۱۰۳)

بے مشک کے بھرے ہمیں آتا ہے چین کب
گرمی میں پیاس سے کئی بچے ہیں جاں بلب
اصغر کو گودیوں میں تڑپتے کٹی ہے شب
کیا وقت ہے حسین کے بچوں پہ ہے غضب
لالے پڑے ہوئے ہیں سکینہ کی جان کے
کانٹے مجھے دکھائے تھے سوکھی زبان کے

(۱۰۴)

عبرت کی یہ جگہ ہے کہ ہم اور سوالِ آب
سقا بنے ہیں دیکھ کے بچوں کا اضطراب
اس مشک نے کیا ہمیں عقبیٰ میں کامیاب
اللہ رے آبرو کہ بہشتی ملا خطاب
شہ سے نشانِ فوجِ پیمبر بھی مل گیا
طوبیٰ کے ساتھ چشمۂ کوثر بھی مل گیا

۱؎ تیغ کی مناسبت سے 'کاٹنا' نہایت خوب ہے۔

۲؎ دیو۔

۳؎ ایک کنوئیں کا نام ہے جس میں کافر جنات آباد تھے۔ حضرت علی نے اس کنوئیں میں کود کر جنوں سے جہاد کیا جس کے بعد وہ سب مسلمان ہو گئے۔

۴؎ ہم نے عرب کے فوجی محکمے کے دفتر کے دفتر جن میں سپاہیوں کے نام درج تھے بیکار کر دیئے ہیں یعنی جنگ میں پوری فوجیں کاٹ کے ڈال دی ہیں۔

(۱۰۵)

یہ ذکر تھا کہ فوج کی جانب سے تیر آئے
نیزے اٹھا کے شیر کے منہ پر شریر آئے
یہ بھی جھپٹ کے مثل شہ قلعہ گیر آئے
گیتی ہلی غضب میں جناب امیر[1] آئے
گھوڑا اڑا پروں کو سوار و تیغ توڑ کے
پلکی صفوں پہ سیف بھی کاٹھی کو چھوڑ کے

(۱۰۶)

آمد تھی تیغ کی کہ اجل کا پیام تھا
یہ صف اخیر تھی وہ رسالہ تمام تھا
بجلی سا ہر جگہ فرس تیز گام تھا
ششدر تھی موت چار طرف قتل عام تھا
اس غول پر کبھی تھی کبھی اس قطار پر
پڑتا تھا ایک تیغ کا سایہ ہزار پر

(۱۰۷)

وہ تیغ کی چمک وہ تڑپ راہوار کی
رفرف[4] کی اک شبیہ تو اک ذوالفقار[5] کی
شوکت سوار میں شہ دلدل[6] سوار کی
حملوں میں شان سب اسد کردگار کی
چتون وہی غضب وہی بیباکیاں وہی
پھرتی وہی جھپٹ وہی چالاکیاں وہی

(۱۰۸)

توڑا یہ مورچہ وہ صف الٹی ادھر پھرے
تلوار خوں میں آپ پسینے میں تر پھرے
یوں خاک پر گرا کے لعینوں کے سر پھرے
جیسے شکار کھیلے ہوئے شیر نر پھرے
تھی قہر کی نگاہ غضب کا جلال تھا
آنکھیں بھی سرخ سرخ تھیں چہرہ بھی لال تھا

(۱۰۹)

منہ پھر گیا سپاہ کا رخ جس طرف کیا
یاں آئے واں گئے اسے مارا اسے لیا
باقی رہے ہزار میں دس سو میں اک جیا
اللہ رے دم لہو یہ لہو تیغ نے پیا
اس پر بھی تشنگی میں نہ تسکین ذری ہوئی
گویا تھی آگ پیٹ میں اس کے بھری ہوئی

---

۱ حضرت علی۔ حضرت عباس کو جوش شجاعت و حالت غیظ میں حضرت علی قرار دیا ہے۔

۲ تلوار۔ ۳ تلوار کا میان۔

۴ وہ سواری جس پر رسول شب معراج سدرۃ المنتہیٰ سے بارگاہ ایزدی تک تشریف لے گئے۔

۵ حضرت علی کی تلوار جو آسمان سے اتری تھی۔

۶ حضرت علی کے ایک گھوڑے کا نام۔

بیشک تھا ان کا ہاتھ امیر عرب[1] کا ہاتھ — پہنچا وغا میں سو طرف اک تشنہ لب کا ہاتھ

آئی اجل اٹھا جو کسی بے ادب کا ہاتھ — (۱۱۰) شیر خدا کے شیر نے مارا غضب کا ہاتھ

بازو پہ آئی تیغ دو دم شانہ کاٹ کے — پہنچے کو بھی قلم کیا دشانہ کاٹ کے

چلتا[2] تھا مثل برق یمین و یسار ہاتھ — ڈرڈر کے جوڑتے تھے ضلالت شعار ہاتھ

ان کی نہ ایک ضرب نہ ان کے ہزار ہاتھ — (۱۱۱) کافی تھے سب کو تیغ دو دستی[3] کے چار ہاتھ

آواز شش جہت میں بگیر و بزن کی تھی — اللہ کا کرم تھا مدد پنجتن کی تھی

نعرہ جدا صدائے بگیر و بدہ جدا — گوشے کماں سے دور تو گوشوں سے زہ جدا

بکتر جدا زمیں پہ ٹکڑے زرہ جدا — (۱۱۲) نیزوں کو دیکھیے تو گرہ سے گرہ جدا

اللہ رے فرق گردن و سر بھی بہم نہ تھے — کشتوں کا ذکر کیا ہو کہ تیغوں میں دم نہ تھے

جس کی طرف نظر دم جنگ و جدل پھری — کچھ ہٹ کے تیغ سے اسی جانب اجل پھری

رہوار یوں پھرا کہ اشارے میں کل پھری — (۱۱۳) تلوار بھی گلوں کی طرف برمحل پھری

ایسے جری سے کس کو مجال مصاف تھی — یوں پھر کے صف کی صف کو جو دیکھا تو صاف تھی

چل پھر کے کاٹتی تھی وہ تلوار ہاتھ پاؤں — ڈر سے بڑھا نہ سکتے تھے خونخوار ہاتھ پاؤں

سر بچ گیا تو ہو گئے بیکار ہاتھ پاؤں — (۱۱۴) بجلی گری تو آٹھ ہوئے چار ہاتھ پاؤں

دو صیں بکاریں تیغ پھر آئی نکل چلو — بولی اجل اب اٹھ کے تو پنجے کے بل چلو

نیزے ادھر قلم تو ادھر برچھیاں قلم — ترکش دو نیم ٹکڑے کمانیں نشاں قلم

ہر ہاتھ میں قلم کی طرح استخواں قلم — (۱۱۵) منھ تیغ کا خراب سناں کی زباں قلم

جب سن سے آئی سر پہ کسی بد خصال کے — گویا سموم چل گئی پھولوں پہ ڈھال کے

---

[1] حضرت علی۔

[2] اس بند کے آخری چار مصرعوں میں صنعت سیاق الاعداد ہے۔

[3] ایسی تلوار جو دونوں ہاتھ سے پکڑ کر چلائی جائے۔

کی جس نے سرکشی وہیں فتنہ فرد ہوا ‏ ظالم ہزار میں تھا جو یکتا وہ دد ہوا
(۱۱۶) افشاں لہو سے شیر کا دستِ نکو ہوا ‏ ٹھنڈا وہی تھا جنگ میں سرگرم جو ہوا
تھا خاتمہ سیاہ جہنم مقام کا ‏ شعلے بجھائے دیتا تھا پانی حسام کا

وہ تیغ کھول دیتی تھی لوہے کا بھی حصار ‏ تھا اسکے ہاتھ سے دل چار آئینہ فگار
(۱۱۷) آری تھیں منھ پہ تیغوں کے ایسے پڑے تھے وار ‏ خود اپنے سر پٹکتے تھے گر گر کے بار بار
پانی وہ زہر تھا کہ پیا اور فنا ہوا ‏ ہو آج تک زرہ کا کلیجہ چھنا ہوا

ن: تھا اس کی ضرب سے دل فولاد بھی فگار

جاتی تھی ہر پرے کی طرف سَن سے بار بار ‏ چڑھ کر سوار گرتے تھے توسن سے بار بار
(۱۱۸) اٹھتی تھی الاماں کی صدا رن سے بار بار ‏ ہر سر کا بار اترتا تھا گردن سے بار بار
غارت ہوئے تباہ ہوئے بے ترک موئے ‏ ضربِ گراں جو اٹھ نہ سکی کیا بیک موئے

ثابت رہی نہ ڈھال نہ مغفر نہ سر بچا ‏ سینے میں دل کو کاٹ گئی گو جگر بچا
(۱۱۹) دو ٹکڑے ہو گیا وہ اُدھر جو اِدھر بچا ‏ بے زخم کھائے ایک نہ بیداد گر بچا
تلوار سے کوئی کوئی ڈر سے ہلاک تھا ‏ سالم تھا جسکا جسم جگر اس کا چاک تھا

سر سے کمر میں تھی تو کمر سے تہِ فرس ‏ آفت کا منھ تھا قہر کا دم خم ستم کا کس
(۱۲۰) کشتے تڑپ رہے تھے جہاں اس میں پیش و پس ‏ دو تھے اگر تو چار ہوئے پانچ تھے تو دس
غل تھا وہی لڑے جسے سر تن پہ بار ہو ‏ آفت بپا ہو کون اجل سے دوچار ہو

غل تھا شرارتوں سے اس آتش زبان کی ‏ پریاں پکارتی تھیں کہ ہو خیر جان کی
(۱۲۱) دنیا میں شعلہ بار ہو آگ اس جہان کی ‏ بدلی ہوئی ہے آج ہوا آسمان کی
بجلی خجل ہو نار یہ اس شعلہ خو کے ہیں ‏ بوچھار ہو سروں کی تریڑے لہو کے ہیں

---

۱ ایک طرح کی زرہ۔

۲ جان کے معنی جنات کے بھی ہیں۔ پریاں اور جان میں ایہام تناسب ہے۔

۳ ماڈ کا ٹڑے زرہ سے گزرنا رہتا

جب بڑھ کے تن سے صورت تیغ علی چلی ثابت ہوا کہ ضربت دست ولی چلی
دل پر خفی چلی تو گلوں پر جلی چلی (۱۲۲) تن سے نکل کے روح پکاری چلی چلی
دی تیغ نے صدا کہ ارادہ کدھر کا ہے
چلائی موت چل یہی رستہ سفر کا ہے

خشکی میں تھی جو آب تو آتش تری میں تھی ہمنام ذوالفقار علی صفدری میں تھی
تلوار تھی کہ برق لباس پری میں تھی (۱۲۳) بیباک اس لیے تھی کہ دست جری میں تھی
خوں بھی اسے حلال دیت[1] بھی معاف تھی
کاٹا تھا سو گلوں کو مگر پاک صاف تھی

سارے رسالدار تباہی میں پڑ گئے اب منہ کسے دکھائیں کہ چہرے بگڑ گئے
نامی جو تھے جواں قدم ان کے اکھڑ گئے (۱۲۴) بھاگے جو سب نشاں بھی تجالت سے گڑ گئے
علموں کے پاس ٹوٹ کے پھریرے پڑے رن میں تھے
ریتی پہ بیرقیں تھیں کہ مردے کفن میں تھے

پہنے ہوئے تھے جسم میں زرہیں جو چست چست چوٹیں کڑی پڑیں تو ہوئے وہ بھی سخت سست
خوف اجل سے بھول گئے وعدۂ نخست (۱۲۵) ٹوٹی صفوں میں ہوش کسی کے نہ تھے درست
اک شور تھا کہ جان گئی اس لڑائی میں
گھوڑے بھگاؤ آگ لگی ہے ترائی میں

مغفر نہ سر کے پاس نہ خنجر کمر کے پاس بیٹے کے پاس باپ نہ بیٹا پدر کے پاس
قبضے کے پاس تیغ نہ دستہ تبر کے پاس (۱۲۶) کڑیاں زرہ کے پاس نہ دامن سپر کے پاس
بوڑھی سنان[2] پہ تھی نہ پرچم نشان پر
پیکاں[3] نہ تیر پر تھا نہ چلہ کمان پر

---

[1] خوں بہا۔ وہ رقم جو کسی کی جان کے معاوضے میں دی جائے۔

[2] برچھی یا نیزے کا پھل۔ ایک قدیم سلام کا مطلع ہے۔

مجرائی پھر تو بڑھ گئی اکبر کو جان کی
سینے سے جب گزر گئی بوڑھی سنان کی

[3] تیر کی بھال۔ نوک دار لوہا جو تیر کے سرے پر لگا ہوتا ہے۔

نہ وہ علم سیاہ[1] نہ وہ روسیاہ تھے — تیغ و سپر بھی پاس نہ تھی بے پناہ تھے
بے سر تھے وہ جو فوج میں صاحب کلاہ تھے — (۱۲۷) سب چھاؤنی[2] اجاڑ محلے تباہ تھے
دکھلا دیا تھا خالق عادل کے قہر کو — گویا غنیم لوٹتا پھرتا تھا شہر کو

بولی سپر سے تیغ کہ تجھ میں پناہ ہے — اس نے کہا کہ بھاگ زمانہ سیاہ ہے
ہر جا یہ برق شعلہ فشاں سدِّ راہ ہے — (۱۲۸) اس معرکے میں کوہ بھی گر ہو تو کاہ ہے
جنات ڈر کے ہاتھوں سے منہ ڈھانپتے ہیں آج — میں کیا ہوں جبرئیل[3] کے پر کانپتے ہیں آج

ڈر ڈر کے پچھلے پاؤں سپاہِ لعیں ہٹی — یہ صف گئی پرا وہ سوے کمیں ہٹی
سر کے جبال نہر کہیں سے کہیں ہٹی — (۱۲۹) دہشت سے آسماں ہوا اونچا زمیں ہٹی
بھاگڑ پڑی کہ ایک سے ایک آگے بڑھ گیا — دریا لہو کا کشتی گردوں پر چڑھ گیا

اللہ ری جنگ شیرِ نیستانِ کربلا — چیونٹی بھی مورچوں[4] میں نہ تھی آدمی تو کیا
پہنچے جو گھاٹ پر تو یہ اعدا کو دی صدا — (۱۳۰) کیوں اب یہ نہر کس کی ہے اے قوم اشقیا
اک آن میں شکست ہزاروں کو دیتے ہیں — دیکھو اسد ترائی کو یوں چھین لیتے ہیں

رستے کھلے ہوئے ہیں کدھر ہے وہ بندوبست — کس نے یہ روم و شام کی فوجوں کو دی شکست
کیا ہو گئے ترائی سے وہ سب ہوا پرست[5] — (۱۳۱) کیوں سربلند کون ہے اب اور کون پست
فوجوں میں یوں کسی نے بھی گھوڑے اڑائے ہیں — دیکھو تو ہم کہاں سے کہاں لڑتے آئے ہیں

---

[1] بنی امیہ کے لشکر کے نشان سیاہ رنگ کے ہوتے تھے۔ [2] فوج کے ٹھہرنے کی جگہ۔ پڑاؤ۔
[3] اشارہ ہے اس روایت کی طرف کہ ایک جنگ میں حضرت علی کے ایک وار سے جبرئیل کے تین پر کٹ گئے۔
[4] مٹی کا ٹیلہ یا دیوار جو فوج مخالف کے حملوں سے بچنے کے لیے بنائی جائے۔ مورچہ کے معنی چھوٹی چیونٹی بھی ہیں اس لیے 'چیونٹی' اور 'مورچہ' میں صنعت ایہام تناسب ہے۔
[5] نفس پرست۔ مغرور۔ بے جا امیدیں باندھنے والا۔

دریا جو اک طرف ہو تو ہم پر ظفر نہ پائے
فاقوں میں شیر بھی ہو مقابل تو منہ کی کھائے

(۱۳۲)
کس دن بدے سے جوہر تیغ علیؑ دکھائے
اب کچھ الم نہیں اجل آئے کہ جان جائے
بس ہم نے گھاٹ چھین لیا مشک بھر چکے
شیرؑ نے جو زباں سے کہا تھا وہ کر چکے

(۱۳۳)
لب تشنہ تین دن سے ہیں اور ہے فرات پاس
چاہیں کبھی تو ہاتھ بڑھا کر بجھالیں پیاس
پر زہر ہے بغیر شہ آسماں اساس
مرتے ہیں آبرو پہ غلامانِ حق شناس
آقا کی تشنگی پہ جگر چاک چاک ہے
بے اُن کے آبِ خضر بھی گر ہو تو خاک ہے

(۱۳۴)
فرما کے یہ سمند کو ڈالا فرات میں
گویا خضر اُتر گئے آبِ حیات میں
دریا دل ایسا کون ہوا کائنات میں
تسمہ پکڑ کے مشک بھری ایک بات میں
سیراب جب تلک کہ شہ بحر و بر نہ ہوں
منظور تھا کہ ہاتھ بھی پانی سے تر نہ ہوں

(۱۳۵)
گرمی میں تشنگی سے کلیجہ تھا آب آب
تڑپا رہا تھا قلب کو موجوں کا پیچ و تاب
اچھلتے تھے قریب جو ساغر بکف حباب
کہتا تھا منھ کو پھیر کے وہ آسماں جناب
عباس آبرو میں تری فرق آئے گا
پانی پیا تو نامِ وفا ڈوب جائے گا

(۱۳۶)
دریا سے مشک بھر کے جو نکلا وہ تشنہ کام
اُمڈی سیہ گھٹا کی طرح سب سپاہ شام
یوں ڈوب کر نکلتا تھا وہ آسماں مقام
ظاہر ہو جیسے ابر میں چھپ کر مہ تمام
موجیں تھیں پر وہ نیل کی فوجوں کا دل نہ تھا
پر واہ رے حواس کہ ابرو پہ بل نہ تھا

(۱۳۷)
چلتی تھی بڑھ کے چار طرف تیغ برق دم
کاندھے پہ مشک آب تھی پیچھے میں تھا علم
دامن سے لگ کے ہاتھ الجھتا تھا دمبدم
کرتا تھا جا بجا تگ و دو اسپ خوش قدم
اُڑ اُڑ کے برچھیوں جو اترتا تھا کھیت میں
گھوڑے کے چاروں پاؤں درآتے تھے ریت میں

(۱۳۸)
گھیرے تھے ایک جان کو دو لاکھ اہل شر
ٹھہریں کہاں قرار کہاں لیں تھمیں کدھر
چھاتی کے پاس برچھیاں تیغیں قریب سر
پہلو میں اس طرف تو سنانیں اُدھر تبر
ملتی نہ تھی اماں سپہ تیرہ بخت سے
گوشوں سے تیر چلتے تھے پتھر درخت سے

جب مشک کی طرف کوئی آتا تھا سن سے تیر — کہتے تھے یا حفیظ کبھی گاہ یا قدیر

چلا رہا تھا شمر بصد غیشہ و شریر — (۱۳۹) بڑھنے نہ پائے لخت دل شاہ قلعہ گیر

رخ اس جری کا خیمے کی جانب سے موڑ دو — ہاں برچھیوں سے شیر کے سینے کو توڑ دو

سن کر زباں درازی شمر ستم شعار — عباس مثل شیر جھپٹتے تھے بار بار

تلواریں سیکڑوں تھیں ہزاروں تھے نیزہ دار — (۱۴۰) توڑی اگر یہ صف تو جمی دوسری قطار

تنہا سنبھالے مشک و علم یا وغا کرے — بلوہ ہو ساری فوج کا جس پر وہ کیا کرے

مشہور ہے کہ ایک پہ بھاری ہیں دو بشر — پیاسے تھے ان کے خون کے دو لاکھ اہل شر

کھائے ادھر سے زخم جو کی اس طرف نظر — (۱۴۱) کس کس کا وار رد کریں تکیں کدھر کدھر

جب دم لیا تو سینے پہ سو تیر چل گئے — پہلو کو توڑ توڑ کے نیزے نکل گئے

سینہ سپر تھا مشک پہ رکھے ہوئے تھے ڈھال — لڑنے میں بھی حسینؑ کے بچوں کا تھا خیال

کہتا تھا ڈگمگا کے فرس پر وہ خوش خصال — (۱۴۲) فرزند کو سنبھالیے یا شیر ذوالجلال

جا پہنچوں مشک لیکے جو تھوڑی سی راہ ہو — ایسا نہ ہو کہ پیاسوں کی کشتی تباہ ہو

یہ کہتے تھے کہ ٹوٹ پڑا لشکر کثیر — بس چور ہو گیا پسر شاہ قلعہ گیر

آکر لگا میان دو ابرو جو ایک تیر — (۱۴۳) تیورا گیا علی ولی کا مہ منیر

چھوٹی جو باگ پاؤں فرس کے بھی رک گئے — پھیلا کے ہاتھ مشک سکینہ پہ جھک گئے

اب یاں تو خاتمہ ہے سنو اس طرف کا حال — ڈیوڑھی پہ ننگے سر ہے رسول خدا کا لال

غم سے کمر جھکی ہوئی رخ زرد جی نڈھال — (۱۴۴) یہ کرب ہے کہ ہوتا ہے جو وقت انتقال

گر گر اٹھے تڑپ کے ادھر سے ادھر گئے — جب آہ کی تو سننے یہ جانا کہ مر گئے

فریاد کر کے دل کبھی تھاما جگر کبھی — پکڑی طناب خیمہ کبھی اور کمر کبھی

گھبرا کے پیارے بھائی کی پوچھی خبر کبھی — (۱۴۵) رونے پسر کے دوش پہ رکھ رکھ کے سر کبھی

کی آہ سامنے کبھی زہرا کی جائی کے — رو کر کبھی لپٹ گئے بیٹے سے بھائی کے

(۱۴۶)

فرماتے تھے کراہ کے بیٹے سے بار بار
کیسا یہ درد ہے کہ جگر کو نہیں قرار
شانے دبا دو اے علی اکبر پدر نثار
بازو کا زور لے گئے عباس نامدار
واحسرتا کہ بے کس و بے یار ہو گئے
سر پیٹیں کس سے ہاتھ تو بیکار ہو گئے

(۱۴۷)

چلاتے تھے کہ جان برادر بس اب پھر آؤ
بھیا خدا کے واسطے اب برچھیاں نہ کھاؤ
پہنچا ہے دم لبوں پہ ہمیں آکے دیکھ جاؤ
عباس ہم اخیر ہیں تشریف جلد لاؤ
پیاری تمہاری ننھے سے ہاتھوں کو ملتی ہے
لو تم کو ڈھونڈھنے کو سکینہ نکلتی ہے

(۱۴۸)

حضرت تو پیٹتے ہیں یہ کہہ کر بصد ملال
ڈیوڑھی پہ اہلبیت ہیں سب کھولے سر کے بال
خیمے میں غش ہے زوجۂ عباس خوش خصال
پردے سے منہ نکالے ہیں اطفال خورد سال
لب ان کے اودے اودے ہیں منہ گورے گورے ہیں
آنکھوں میں اشک ہاتھوں میں خالی کٹورے ہیں

(۱۴۹)

کہتے ہیں سب لبوں پہ زبانوں کو پھیر کر
حضرت سے پوچھتی ہے سکینہ بچشم تر
اب پانی لے کے آتے ہیں عباس نامور
میرے چچا کب آئیں گے یا شاہ بحر و بر
کیا میں سفر کروں گی جہاں سے تب آئینگے
بہلاتے ہیں حسین کہ بی بی اب آئینگے

(۱۵۰)

گھیرے ہیں ان کو لاکھ ستمگار ہائے ہائے
وہ کہتی ہے میں پانی سے گزری نہ مشک آئے
مانگو دعا کہ بھائی کو میرے خدا بچائے
ہے ہے بس اب چچا کو مرے کوئی پھیر لائے
رکھے خدا جہاں میں علی کی نشانی کو
میں کیا کروں گی آگ لگے ایسے پانی کو

(۱۵۱)

یہ ذکر تھا کہ فتح کے باجے بجے ادھر
چلائے بڑھ کے فوج سے وہ چار اہل شر
تڑپے زمیں پہ گر کے شہنشاہ بحر و بر
حضرت کہاں ہیں مر گئے عباس نامور
کیا کیا علی ہیں تیغوں پہ تیغیں لڑائی میں
وہ زخم کھائے شیر پڑا ہے ترائی میں

(۱۵۲)

افشاں ہے سر کے خون کے چھینٹوں سے سب نشاں
نام آوروں نے آج مٹایا عجب نشاں
عباس کانپ جاتے تھے جھکتا تھا جب نشاں
کیوں اے حسین کون اٹھائے گا اب نشاں
لاش ان کی پامال ہوئی زخم پھٹ گئے
جن میں علی کا زور تھا وہ ہاتھ کٹ گئے

(۱۵۳)
آئی صدا یہ نہر کی جانب سے ایک بار — آقا تمام ہوتا ہے یہ عبد جاں نثار
تن سے نکل کے آنکھوں میں اٹکی ہے جان زار — اب ہے فقط حضور کے آنے کا انتظار
بابا کے ساتھ خلد سے تشریف لائی ہیں — حضرت کی والدہ مرے لینے کو آئی ہیں

(۱۵۴)
شہ دوڑ کر پکارے کہ آتا ہوں بھائی جان — گھر لٹ گیا ہے خاک اڑاتا ہوں بھائی جان
طاقت بدن میں اب نہیں پاتا ہوں بھائی جان — اک اک قدم پہ ٹھوکریں کھاتا ہوں بھائی جان
دست شکستہ بیٹے کی گردن میں ڈالے ہیں — بھیّا ہمیں تو اکبر مہ رو سنبھالے ہیں

(۱۵۵)
دیکھا جو در سے بنت علی نے یہ شہ کا حال — ڈیوڑھی سے نکلی چند قدم کھولے سر کے بال
چلائی کون قتل ہوا اے علی کے لال — مڑ کر کہا حسین نے عباس خوش خصال
دریا پہ فوج شام نے مارا دلیر کو — زینب اجل نے چھین لیا میرے شیر کو

(۱۵۶)
خورشید مشرقین زمانے سے اٹھ گیا — سید کا نور عین زمانے سے اٹھ گیا
وہ عاشق حسین زمانے سے اٹھ گیا — زینب ہمارا چین زمانے سے اٹھ گیا
آتا نہیں قرار دل بے قرار کو — دریا پہ روتے جاتے ہیں خدمت گزار کو

(۱۵۷)
اکبرؑ کو ہاتھ اٹھا کے پکاری وہ سوگوار — ہے ہے حسینؑ ہو گئے بے یار و غمگسار
ہا تم جوان بھائی کا ہے تم پہ میں نثار — اکبرؑ خدا کے واسطے بابا سے ہوشیار
گرنے لگیں تو حیدر صفدر کا نام لو — بیٹا پدر کے ہاتھ کو مضبوط تھام لو

(۱۵۸)
اکبرؑ پدر کو تھامے ہوئے نہر پر جو لائے — غلطاں لہو میں بازوئے سرور کے ہاتھ پائے
چلائے شاہ لاش کدھر ہے کوئی بتائے — فرق آ گیا ہماری بصارت میں ہائے ہائے
رولیں گلے لگا کے تن پاش پاش کو — اکبر ہمیں دکھا دو برادر کی لاش کو

(۱۵۹)
اکبر نے شہ کے ہاتھ پکڑ کر بصد بکا — رکھے چچا کے سینے پہ اور رو کے یہ کہا
لیجیے یہی ہے لاش علمدار باوفا — چلائے جھک کے لاش پہ سلطان کربلا
ٹوٹی ہوئی کمر ہے سنبھالو حسین کو — بھیّا ذرا گلے سے لگا لو حسینؑ کو

عباسؑ ہاتھ کٹ گئے شانوں سے ہے غضب ‏(۱۶۰)‏ رتی پہ دو طرف یہ تمہارا لہو ہے سب
لوٹا ہمیں رسولؐ کی اُمت نے بے سبب — بھیا ہماری جان نکلتی ہے تن سے اب
مرجائیں گے جلا دو ہمیں منہ سے بول کر — دو باتیں کر لو بھائی سے آنکھوں کو کھول کر

کیوں خاک پر دھرے ہو یہ رخسار خوں میں تر ‏(۱۶۱)‏ آؤ ہم اپنے زانو پہ رکھیں تمہارا سر
لیتے ہو کیوں کراہ کے کروٹ ادھر اُدھر — ثابت ہوا کہ جلد ہے دنیا سے اب سفر
ہے ہے دلیل مرگ ہے لکنت زبان کی — ہچکی نہیں یہ جسم سے رخصت ہے جان کی

غش میں سنی جو گریۂ شبیرؑ کی صدا ‏(۱۶۲)‏ چونکے تڑپ کے حضرت عباسؑ باوفا
آہستہ کی یہ عرض کہ اے سبط مصطفٰؐ — اس پیار کے نثار اس الطافؔ کے فدا
زیبا ہے نکلے جان اگر پیشوائی کو — گویا رسولؐ آئے ہیں مشکل کشائی کو

یہ کہہ کے روئے شہ کی طرف کی نظر بغور ‏(۱۶۳)‏ جھک کر پکارے شاہ کہ بھیا کہو کچھ اور
تڑپا قدم پہ شہ کے وہ مقتول ظلم و جور — بس ہچکیاں بگڑنے لگے تیوروں کے طور
پتھرا کے چشم اشک فشاں بند ہوگئی — تھرائے دونوں ہونٹھ زباں بند ہوگئی

اکبر نے عرض کی کہ چچا جان مر گئے ‏(۱۶۴)‏ جھک کر پکارے شاہ کہ بھیا کدھر گئے
منہ تو اٹھاؤ خاک سے رخسار بھر گئے — وا حسرتا حسین کو بے آس کر گئے
اب کون دیگا دکھ میں نبیؐ کے پسر کا ساتھ — دم بھر میں تم نے چھوڑ دیا عمر بھر کا ساتھ

ہاں روؤ مومنو یہ بکا کا مقام ہے ‏(۱۶۵)‏ تم میں شریک روح رسولؐ انام ہے
اب رخصت حسین علیہ السلام ہے — تاریخ آٹھویں ہے محرم تمام ہے
موت آئی تو شریک عزا کون ہوئیگا — جو سال بھر جیئے گا وہ بھر شہ کو روئیگا

؎ الطاف۔ لطف کی جمع۔ مہربانیاں۔ عنایتیں۔ اِلطاف۔ مہربانی کرنا۔

بس اے انیسؔ روک لے اب خامے کی عناں ۔ یہ غم ہے جاں گزا نہ کبھی ہوئے گا بیاں
آنکھوں سے سامعین کے بھی اشک ہیں رواں (۱۶۶) خالق سے کر یہ عرض کہ خلّاق انس و جاں
آنکھوں سے مس کروں میں مزارِ بتول کو
دکھلا دے جلد مرقدِ سبطِ رسول کو

پرساں کوئی کب جوہرِ ذاتی کا ہے ۔ ہر گل کو گلہ کم التفاتی کا ہے
شبنم سے وجہ گریہ پوچھی تو کہا ۔ رونا فقط اپنی بے ثباتی کا ہے

دل میں غمِ یارانِ وطن لے کے چلے ۔ اس باغ سے داغوں کا چمن لے کے چلے
نقصاں کے سوا کچھ نہ ہوا حاصل آہ ۔ جاں لے کے یہاں آئے تھے تن لے کے چلے

کیوں زر کی ہوس میں دربدر پھرتا ہے ۔ جانا ہے تجھے کہاں، کدھر پھرتا ہے
اللہ ری پیری میں ہوس دنیا کی ۔ تھک جاتے ہیں جب پاؤں تو سر پھرتا ہے

دنیا دریا ہے اور ہوس طوفاں ہے ۔ مانند حباب ہستی انساں ہے
لنگر ہے جو دل تو ہر نفس بادِ مراد ۔ سینہ کشتی ہے ناخدا ایماں ہے

دولت نہ عطا کر نہ جہاں میں زر دے ۔ جو باعث آبرو ہے وہ گوہر دے
شاہوں کو نصیب بحر و بر کی تحصیل ۔ یارب مجھے نانِ خشک و چشمِ تر دے

مرثیہ (۴)

کیا غازیانِ فوجِ خدا نام کر گئے — لاکھوں سے تشنہ کام لڑے کام کر گئے
امت کی مغفرت کا سرانجام کر گئے — فیض اپنا مثلِ ابرِ کرم عام کر گئے (۱)
پڑھتے ہیں سب درود جو ذکر ان کے ہوتے ہیں — ایسے بشر وہ تھے کہ ملک جن کو روتے تھے

دیندار و سرفروش و شجاع و خوش اعتقاد — ہاتھوں میں تیغیں اور دلوں میں خدا کی یاد
زخموں کو نخلِ قد پہ وہ سمجھے گلِ مراد — مردانگی پہ پیاس میں فاقوں میں یہ جہاد (۲)
تیغوں سے بند کون سا ان کا کشادہ تھا — ہر معرکے سے پاؤں کسی کا ہٹا نہ تھا

برسوں رہے گا چرخ میں گر آسمان پیر — لیکن نظر نہ آئے گا ان کا کہیں نظیر
گورے نہ ان کے پاؤں نہ روئے مہِ منیر — خورشید جن کے سامنے اک ذرۂ حقیر (۳)
پر خوں قبائیں جسم میں سینے تنے ہوئے — پہنچے ریاضِ خلد میں دولھا بنے ہوئے

رستم اٹھا نہ سکتا تھا سر ان کے سامنے — شیروں کے کانپتے تھے جگر ان کے سامنے
پھیکی تھی روشنیٔ قمر ان کے سامنے — اڑتا تھا رنگ روئے سحر ان کے سامنے (۴)
بخشا تھا نورِ حق نے ہر اک خوش صفات کو — ہوتا تھا دن جو گھر سے نکلتے تھے رات کو

پیشانیوں پہ جلوہ نما اخترِ سجود — دیکھیں جو ان کا نور تو قدسی پڑھیں درود
رخ سے عیاں جلال و جواں مردیٔ نمود — شیدائے آل[1] شیفتۂ واجب الوجود (۵)
جینے کی شاہِ دیں کو دعا دے کے مر گئے — ایماں کے آئینہ کو جلا دے کے مر گئے

---

[1] آل۔ اولاد۔ یہاں آلِ رسول مراد ہیں۔

(۶)
تا شیر کر گئی تھی انھیں صحبت امام — تھا نزع میں بھی خشک لبوں پر خدا کا نام
لبریز تھے محبت حیدر سے دل کے جام — ذی قدر و ذی شعور دلاور خجستہ کام
لشکر جواں پہ ٹوٹ پڑے شام و روم کے — تلواریں کھائیں جسم پہ کیا جھوم جھوم کے

(۷)
لاکھوں میں انتخاب ہزاروں میں لاجواب — تھا خشک شہ نزہ پہ جن کا کرم صورت سحاب
وہ نور وہ جلال وہ رونق وہ آب و تاب — زہرا کے گھر کے چاند زمانے کے آفتاب
لیکن کیا [illegible] جہاں میں اندھیرا سا چھا گیا — دن بھی ڈھلا نہ تھا کہ زوال ان پہ آ گیا

(۸)
گل ہو گئے عقیل[1] کی تربت کے جب چراغ — جعفر[2] کے لاڈلوں نے دیئے شہ کے دل کو داغ
ہاتھ سے کیا بھتیجوں کے ہوا تھا نہ انفراغ — پامال ہو گیا حسن مجتبیٰ کا باغ
لاشے اٹھائے جنگ [illegible] یا بکا کرے — جس پر گریں یہ کوہ مصیبت وہ کیا کرے

(۹)
صدمہ یہ تھا کہ لٹنے لگی دولت پدر — نکلے نبرد کو اسد اللہ کے پسر
مارے گئے جہاد میں جس دم وہ شیر نر — رخصت ہوئے حسینؑ سے عباس نامور
دریا بہے لہو کے بڑا کشتہ خوں ہوا — ڈھلتی تھی دوپہر کہ علم سرنگوں ہوا

(۱۰)
پیری میں قہر ہے خبر مرگ نوجواں — ریتی پہ تھرتھرا کے گرے شاہ انس و جاں
نکلیں سروں کو پیٹتی خیمے سے بی بیاں — تھا خانۂ علی میں تلاطم کہ الاماں
یوں گھر لٹ پلٹ تھا امام حجاز کا — جس طرح ٹوٹ جاتا ہے لنگر جہاز کا

(۱۱)
غل تھا کہ خوں میں بھر گیا سقائے اہلبیت[3] — دنیا سے کوچ کر گیا سقائے اہلبیت
ہم لٹ گئے گزر گیا سقائے اہلبیت — فریاد ہے کہ مر گیا سقائے اہلبیت
بچے [illegible] سے اپنے بہشتی کو لائیں گے — سوکھی زبان اب کسے بچے دکھائیں گے

---

[1] عقیل کی اولاد۔ حضرت عقیل کے پوتے جعفر ابن محمد اور عبداللہ ابن مسلم کربلا میں شہید ہوئے تھے، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے کئی بیٹوں نے بھی کربلا میں شہادت پائی۔ [2] جعفر طیار کے پوتے عون و محمد جو حضرت زینب کے بیٹے اور امام حسینؑ کے بھانجے تھے [3] ایک گھر کے رہنے والے رسول کے گھرانے والے۔

(۱۲)

ہلتا[1] تھا خیمہ روتے تھے اہل بیت شاہ
صدمے سے حال زوجۂ عباسؑ تھا تباہ
چلاتی تھی کہ نہر کی مجھ کو بتاؤ راہ
لوٹی گئی میں دشت پر آفت ہیں آہ آہ
غم سے گرا تھا کوہ مصیبت حسینؑ پر
ماتم تھا بی بیوں میں سکینہ کے بین پر

(۱۳)

ماتم ادھر تھا جشن میں تھے اہل شر ادھر
بجتے تھے شادیانۂ[2] فتح و ظفر ادھر
انعام بانٹتا تھا ہر اک کو عمر ادھر
روتے تھے دیکھ دیکھ کے حضرت ادھر ادھر
غل تھا کہ بس حسین بہت لٹئے بھائی کو
کوئی جواں ہو اور تو بھیجو لڑائی کو

(۱۴)

باقی نہیں کوئی تو وغا کو خود آئیے
حیدر کی ذوالفقار کے جوہر دکھائیے
زخم سنان و خنجر و شمشیر کھائیے
گرمی بڑی ہے آج لہو میں نہائیے
آمادہ ہم تو دیر سے بہر ستیز ہیں
تیغیں بھی ہیں اپنی[3] ہوئی خنجر بھی تیز ہیں

(۱۵)

کاٹے ہیں جس نے بازوے لخت دل امیر
ہے خوب آب دار وہ شمشیر بے نظیر
چھیدا ہے جس سے مشک کو موجود ہے وہ تیر
یہ گرز وہ ہے ضرب سے جس کی ہوئے اخیر
تڑپے تھے جس سے مشک کو دانتوں سے چھوڑ کر
برچھی یہ ہے جو نکلی تھی پہلو کو توڑ کر

(۱۶)

صابر بڑے ہیں آپ تو یا شاہ انس و جاں
اک بھائی کے فراق میں یہ نالہ و فغاں
رونے سے جی اٹھیں گے نہ عباس نوجواں
حضرت پکارتے ہیں کسے بھائی اب کہاں
ملتا ہے کب جہاں میں بھلا جو گزر گیا
اب فکر اپنی کیجئے وہ شیر مر گیا

(۱۷)

اکبر نے کی غضب کی نظر سوئے فوج شام
کانپے یہ غیظ سے کہ اگلنے[4] لگی حسام
کی عرض ہاتھ جوڑ کے اے قبلۂ انام
سنتے ہیں آپ لشکر اعدا کے یہ کلام
خوں تن میں جوش کھاتا ہے ہنگام جنگ ہے
مولا بس اب تو حوصلۂ صبر تنگ ہے

---

[1] جس مکان میں بہت شور ہوتا ہے وہ ہلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ [2] خوشی کے باجے۔

[3] سان پر چڑھی ہوئی۔ تیز کی ہوئی۔

[4] تلوار میان سے خود بخود نکلنے لگی۔

ان کے کلام سننے کی کس کے جگر میں تاب　　خادم زبان تیغ سے دے گا انھیں جواب
کیا اپنے دل میں سمجھے ہیں یہ خانماں خراب　　(۱۸) نعرہ کروں تو شیر کا زہرہ ہو آب آب
آداب شاہ سے نہیں ہم بول سکتے ہیں　　زخم جگر پہ اب تو نمک یہ چھڑکتے ہیں

ہم کو یہ طعن و طنز کی باتیں نہیں پسند　　کوفے میں لیں گے دم جو اٹھائیں گے پھر سمند
ہونٹوں پہ غم سے اب ہے یہاں جان دردمند　　(۱۹) کاٹیں تبر سے تیغ سے خنجر سے بند بند
ہنس ہنس کے تبسم پہ تبر و تیر کھائیں گے　　تیغ زباں کے زخم اٹھائے نہ جائیں گے

گھبرا کے دیکھنے لگے بیٹے کے منھ کو شاہ　　فرمایا خیر کہہ لیں جو کہتے ہیں روسیاہ
کیوں کانپتے ہو غیظ سے اے میرے رشک ماہ　　(۲۰) لازم ہے صبر و شکر کہ راضی رہے اللہ
غصہ اسی طرح اگر آئے گا آپ کو　　خنجر کے نیچے دیکھو گے کس طرح باپ کو

برہم نہ ہو تمہیں سر شبیر کی قسم　　(۲۱) لو گھر میں جاؤ خیر سمجھ لیں گے ان سے ہم
دیکھو ہمیں کہ بھائی کے بازو ہوئے قلم　　تلوار دل پہ چل گئی مارا نہ ہم نے دم
سب جل کے خاک ہوں جو ابھی بددعا کروں　　پر امت نبی ہے بجز صبر کیا کروں

یہ سن کے زرد ہو گئے ہم شکل مصطفا　　رو رو کہ کہا یہ کرتے ہیں ارشاد آپ کیا
وہ وقت وہ گھڑی نہ دکھائے ہمیں خدا　　(۲۲) بابا نہ ہو تو بیٹے کے جینے کا کیا مزا
آمادۂ فنا ہیں تو ستی دل سے فوت ہے　　پھر خضر کی حیات ملے گر تو موت ہے

کیا پہلے سر کٹائے گا یا شہ زماں　　کس اشتیاق سے شہ دیں نے کہا کہ ہاں
آگے جو کچھ رضائے خدا اے پدر کی جاں　　(۲۳) جیتے ہیں پیر سامنے مرتے ہیں نوجواں
دیکھو کہ چھوٹے بھائی کے ماتم میں روتے ہیں　　پالا تھا جن کو ہم نے وہ دریا پہ سوتے ہیں

یہ کہہ کے اٹھ کھڑے ہوئے سلطان بحر و بر　　پٹکے سے باندھنے لگے ٹوٹی ہوئی کمر
قدموں پہ گر پڑے علی اکبر بچشم تر　　کی عرض رحم کیجیے مر جائے گا پسر

آگے مرے جو ہو گی شہادت امام کی
دنیا میں آبرو نہ رہے گی غلام کی

چھوٹے تھے جو کہ سن میں بڑے کر گئے وہ کام
یا شاہ کیا لڑائی کے قابل نہیں غلام

(۲۵)
عمو کے خوں کا لیں گے لعینوں سے انتقام
ہم نے بھی تیغ باندھی ہے بچپن سے یا امام
عزت ملی ہے خلق میں صدقے سے آپ کے
بیٹا وہی جو رنج میں کام آئے باپ کے

انصاف آپ کیجئے یا سرور عرب
بیٹا تو گھر میں بیٹھے لڑے باپ تشنہ لب

(۲۶)
مارا گیا[۱] آج تو کل یہ کہیں گے سب
کیسا لہو سفید ہے دنیا کا ہے غضب
سر کو کٹا کے باپ جہاں سے گزر گیا
بیٹا جوان باپ کے آگے نہ مر گیا

بہر رسول رن کی رضا دیجئے مجھے
صدقہ علی کا اذن وغا دیجئے مجھے

(۲۷)
مرتا ہوں یا امام جلا دیجئے مجھے
یاد خدا میں دل سے بھلا دیجئے مجھے
کھولیں کمر حضور تو دل کو قرار ہو
کہہ دیجئے کہ جا علی اکبر نثار ہو

شہ نے کہا تمہیں مرے دل کی نہیں خبر
پیارے کہاں سے لاؤں میں اس طرح کا جگر

(۲۸)
ہے باپ کا عصائے ضعیفی جواں پسر
جب تم نہ ہوگے پاس تو مر جائے گا پدر
ایسے ہنسے نہ تھے کہ ہمیں تم رلاتے ہو
شادی کے دن جو آئے تو مرنے کو جاتے ہو

راتیں یہ عیش کی ہیں مرادوں کے ہیں یہ دن
پورے جواں نہیں ابھی کیا ہے تمہارا سن

(۲۹)
اکبر! تری جوانی پہ روئیں گے انس و جن
کیونکر قرار آئے گا ماں کو تمہارے بن
کیسی ہوا چلی چمن روزگار میں
سید کا باغ لٹتا ہے فصل بہار میں

دیتا اگر تمہیں کوئی فرزند ذوالجلال
ہوتی پدر کی قدر سمجھتے ہمارا حال

(۳۰)
رخصت کا آپ سے یوں نہیں کرتا وہ جب سوال
تب جانتے کہ دیتے اسے رخصت جدال
کیا جانتے وہ مزا جسے اس کا ملا نہیں
اچھا سدھارو تم سے ہمیں کچھ گلا نہیں

---

[۱] مروت اور محبت معدوم ہے۔

(۳۱)
تسلیم کرکے بولے علی اکبر غیور — لاکھوں برس جہاں میں سلامت رہیں حضور
فرمایا شہ نے خیر اجل بھی نہیں ہے دور — برچھی لگا کے دل پہ خوشامد یہ کیا ضرور
تقریر میں پدر کو نہ اب بند کیجئے — خیمے میں جاکے ماں کو رضامند کیجئے

(۳۲)
ہیں مبتلائے رنج بھلا کیا ہمارا پیار — تم سے جو سو پسر ہوں تو اس راہ میں نثار
ہر دم غذائے خیر کا ہوں میں امیدوار — ہاں ماں نہ جانے دے تو مرا کیا ہے اختیار
سینے میں دل ہلے گا بدن تھرتھرائے گا — رخصت کا نام سنتے ہی غش اس کو آئے گا

(۳۳)
سب جانتے ہیں جو ہے پھپھی کو تمہاری چاہ — معلوم ہوگا جاؤ گے جب سوئے خیمہ گاہ
باہیں گلے میں ڈالے گی زینب باشک و آہ — قدموں پہ گر کے آپ کے ماں ہوگی سدِ راہ
یہ مرحلہ[1] بھی کم نہیں زنجیر و طوق سے — دونوں رضا جو دیں تو چلے جاؤ شوق سے

(۳۴)
روتے ہوئے چلے علی اکبر سوئے خیام — کانپا یہ دل کہ بیٹھ گئے خاک پر امام
روتا ہوا جو ڈیوڑھی سے آیا وہ نیک نام — دوڑی پسر کو دیکھ کے بانوئے تشنہ کام
دامن سے آ کے بالی سکینہ چمٹ گئی — زینب بلائیں لے کے گلے سے لپٹ گئی

(۳۵)
ماں گرد پھر کے بولی کہ اے میرے گلعذار — تم صبح سے گئے تھے اب آئے ہو ماں نثار
در پر تڑپ تڑپ کے میں جاتی تھی بار بار — کھولو بس اب کمر کہ مرا دل ہے بیقرار
گرمی یہ اور قحط کئی دن سے آب کا — رخ تمتما گیا ہے مرے آفتاب کا

تر ہے قبا پسینے میں پنکھا کوئی ہلاؤ — سنولا گئے ہو دھوپ میں واری ہوا میں آؤ
جھاڑوں ردا سے گرد میں زلفوں کی بیٹھ جاؤ — گھٹ جائے گا لہو مرا آنسو نہ تم بہاؤ
صدمہ جو دل پہ ہو اسے کچھ منھ سے کہتے ہیں
کیا ہے جو اشک نرگسی آنکھوں سے بہتے ہیں

---

[1] تمہاری ماں اور پھپھی کے لیے سب سے زیادہ سخت مرحلہ یہ ہے کہ میری شہادت کے بعد ان کو قیدیوں کی صورت میں شہر بہ شہر پھرنا ہوگا۔ لیکن تم کو مرنے کی اجازت دینا بھی ان کے لیے اس مرحلے سے کم نہیں ہے۔

صغرا کی تو وطن سے کچھ آئی نہیں خبر؟	جلدی کہو کہ منھ سے نکلتا ہے اب جگر
(۳۷) اکبر نے عرض کی کہ ہیں سب خیر سے مگر	لٹتا ہے کوئی آن میں خیر النسا کا گھر
ملتی نہیں رضا ہمیں آنسو بہاتے ہیں	بابا گلا کٹانے کو میداں میں جاتے ہیں
اس وقت کس سے درد دل اپنا کہوں میں آہ	تم بھی ہو سد راہ پھپھی بھی ہیں سد راہ
(۳۸) چھائی ہے واں گھٹا کی طرح شام کی سپاہ	اماں مدد کرو کہ کمر باندھتے ہیں شاہ
اب زندگی ہے تلخ بہت دق ہیں جان سے	الفت نے آپ کی ہمیں کھویا جہان سے
دیتے نہیں رضا جو امام فلک اساس	خاطر فقط یہ آپ کی ہے اور پھپھی کا پاس
(۳۹) اب غیر یاس کوئی نہیں ان کے آس پاس	نا طاقتی ہے ضعف ہے فاقہ ہے اور پیاس
کیونکر لڑیں گے وہ کہ سراپا ضعیف ہیں	پیری میں دل ضعیف ہے اعضا ضعیف ہیں
عباس جب سے مر گئے روتے ہیں دمبدم	رخ زرد ہے کماں کی طرح ہو گئے ہیں خم
(۴۰) چلوں میں تیر جوڑے ہیں واں بانیٔ ستم	قرباں ہوں کس طرح پسر فاطمہ پہ ہم
سب روکتے ہیں رن کی طرف جائیں کس طرح	ماں کو پھپھی کو بہنوں کو سمجھائیں کس طرح
بابا کا حکم ہے کہ رضا جا کے ماں سے لاؤ	راضی پھپھی ہوں جب تو لڑو اور زخم کھاؤ
(۴۱) مرضی ہے آپ کی کہ مرے پاس سے نہ جاؤ	یا فاطمہ تمہیں علی اکبر کے کام آؤ
چلنے لگیں نہ تیر شہ مشرقین پر	نرغہ ہے ظالموں کا تمہارے حسین پر
دیکھی گئی نہ ماں سے یہ بے تابیٔ پسر	وارث کی بے کسی پہ لگا کانپنے جگر
(۴۲) ہاتھوں سے دل کو تھام کے بولی وہ نوحہ گر	دولت پہ فاطمہ کی تصدق تمام گھر
پہلے نہ کچھ کہا تھا نہ اب روکتی ہوں میں	روتے ہو کس لیے تمہیں کب ٹوکتی ہوں میں
زہرا کے لال پر مرے مادر پدر نثار	عابد نثار اصغر تشنہ جگر نثار
(۴۳) جائیں ہزار ہوں تو فدا لاکھ سر نثار	قربان گھر کنیز تصدق پسر نثار
کسرائی[1] کو کہ ہوں پہ بہو میں علی کی ہوں	مانگو گے [illegible] کہ لونڈی نبی کی ہوں

[1] کسرائی ایران کے بادشاہ کی اولاد۔ حضرت شہربانو ایران کے آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد سوم کی بیٹی تھیں۔

مجھ پر حوالہ کرتے ہیں گر شاہ خوش خصال
رخصت نہ تم کو دوں یہ بھلا ہے مری مجال
صدقہ انھیں کا ہے کہ ملا تم سا نونہال (۴۴)
رخصت کا صدقے جاؤں پھپھی سے کرو سوال
ہم سب کنیزیں بنت امیر عرب کی ہیں
اصغر ہو یا کہ تم وہی مختار سب کی ہیں

کہنے کو یوں ہیں چاہنے والے تمہارے سب
لیکن ہے ان کے عشق سے نسبت کسی کو کب
دن کو انھوں نے دن کبھی جانا نہ شب کو شب (۴۵)
لیجے انھیں سے آپ کو جس شے کی ہے طلب
مجھ سے نہ کچھ نہ سید عالی سے پوچھئے
گر پوچھئے تو پالنے والی سے پوچھئے

روتے ہوئے گئے علی اکبر پھپھی کے پاس
دیکھا کہ غش پڑی ہیں زمیں پر وہ حق شناس
زانو پہ سر لیے ہوئے کبریٰ ہے بے حواس (۴۶)
اس حال میں بھی لب پہ یہی ہے کلام یاس
اب تاب و طاقت جسد و روح و دل گئی
کیوں صاحب رضا علی اکبر کو مل گئی

اکبر سے مجھ کو یہ نہ توقع تھی ہے غضب
اتنا نہیں خیال کہ ہے کون جاں بلب
اس تحمل نے ہائے مری ریاضت بھلا دی سب (۴۷)
نام خدا جواں ہوئے کیا ہم سے کام اب
ہیں محو رن کے شوق میں رخصت کے دھیان میں
سچ ہے کسی کا کون ہوا ہے جہان میں

یا بے ہمارے چین نہ آتا تھا کوئی دم
مالک اب اور ہو گئے کوئی ہوئے نہ ہم
کیا دخل تھا جو ڈیوڑھی سے باہر رکھیں قدم (۴۸)
ہے ہے وہ میرا درد وہ مصیبت وہ رنج و غم
جاگی ہوں میں یہ چونک کے راتوں کو روئے ہیں
پوچھو تو کس کی چھاتی پہ بچپن میں سوئے ہیں

کنگھی کسی کے ہاتھ کی بھاتی نہ تھی کبھی
بے میرے لیٹے نیند انھیں آتی نہ تھی کبھی
بے ان کے ماں کی قبر پہ جاتی نہ تھی کبھی (۴۹)
روئیں پسر پہ ان کو رلاتی نہ تھی کبھی
میرے سوا کسی کو کبھی جانتے نہ تھے
جو تھی سو میں تھی ماں کو تو پہچانتے نہ تھے

ہرچند دونوں تھے مرے فرزند خرد سال
پر ان کے آگے ان کا مجھے کچھ نہ تھا خیال
راتوں کو جب لپٹتے تھے مجھ سے وہ نونہال (۵۰)
میں کہتی تھی ہٹو علی اکبر ہے میرا لال
وہ دونوں مرنے والے[۱] تو پہلو میں ہوتے تھے
پھیلا کے پاؤں یہ مری چھاتی پہ سوئے تھے

لہ مرنے والے اسم فاعل اسم مفعول کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

چھوٹا تو ضد بھی کرتا تھا راتوں کو بار ہا — پر عون کیا عقیل تھا بخشے اسے خدا
دن رات تھی خوشامد ہم شکل مصطفےٰ (۵۱) — سینے پہ جب یہ سوئے تو اس نے یہی کہا
آقا کے نورِ عین ہیں عالی مقام ہیں — اماں یہ شاہزادے ہیں اور ہم غلام ہیں

رہتے تھے پاس باپ کے وہ غیرتِ قمر — الفت میں ان کی مجھ کو کچھ ان کی نہ تھی خبر
قرآن پڑھنے بیٹھتی تھی جب دمِ سحر (۵۲) — صورت پہ تھی انھیں کی تلاوت میں بھی نظر
غافل نہ ان کے پیار سے میں ایک آن تھی — قرآں تو رحل[۱] پہ تھا حمائل[۲] میں جان تھی

میں نے انھیں پہ صدقے کیے اپنے دونوں لال — تسکین تھی کہ باقی ہے اکبر سا نونہال
مانگے تو آ کے مجھ سے بھلا رخصتِ جدال (۵۳) — نکلوں گی ساتھ خیمے سے بکھرا کے سر کے بال
کیا خوب جیتے جی مرے جائیں گے مرنے کو — تلوار باندھ لی ہے انھیں ذبح کرنے کو

بچپن میں تھا نہ ہم سے زیادہ کسی کا پیار — اب کیا غرض گزر گئی وہ فصلِ وہ بہار
بھیگیں مسیں نمود ہوا سبزۂ عذار (۵۴) — مالک ہیں خود بھلا مرا اب کیا ہے اختیار
ثابت ہوا ادھر سے ادھر مرنے جائیں گے — میں مر بھی جاؤں گی تو وہ یاں تک نہ آئیں گے

باہر سدھارے یا ابھی ہیں ماں سے کچھ کلام — بھابھی نے کیوں لیا تھا ابھی رو کے میرا نام
سینے پہ منہ کو رکھ کے یہ بولا وہ لالہ فام (۵۵) — آنکھیں تو آپ کھولیے حاضر ہے یہ غلام
خادم جدا نہ تھا شہِ گردوں سریر سے — کس جرم پر حضور خفا ہیں حقیر سے

کیا ہے قصور جس پہ یہ غصہ ہے یہ عتاب — کرتا ہوں بات میں کوئی بے مرضیِ جناب
روتا ہوں اب کہ صبر کی مجھ کو نہیں ہے تاب (۵۶) — شکوہ یہ خاکسار کا اے بنتِ بوتراب
ہر دکھ میں ہر بلا میں مددگار آپ ہیں — پالا ہے مجھ کو مالک و مختار آپ ہیں

---

[۱] لکڑی کی دو تختیوں سے بنی ہوئی ایک قینچی دار چیز جس پر رکھ کر قرآن پڑھا جاتا ہے۔

[۲] کوئی چیز جو گلے میں پہنی جائے۔ چھوٹی تقطیع کا قرآن جو اکثر گلے میں ڈالا جاتا ہے یہاں مراد ہیں حضرت علی اکبر جو بچپن میں ہر وقت حضرت زینب کے گلے کا ہار رہتے تھے۔

پیدا ہوا تو آپ کی صحبت مجھے ملی
کرتی ہے روح شکر وہ راحت مجھے ملی
یوسف کو کب ملی تھی جو دولت مجھے ملی (٥٧)
رکھا عزیز آپ نے عزت مجھے ملی
صدقہ ہے اس قدم کا جو سر تا فلک گیا
کی مہر آفتاب نے ذرہ پہ جھک گیا

مرضی نہ ہو تو رن کو کبھی جائے نہ یہ غلام
بندے ہیں ہم اطاعت مالک سے ہم کو کام
تکرار کی مجال نہ اصرار کا مقام (٥٨)
مرتے اگر تو اس میں بھی تھا آپ ہی کا نام
روتی ہیں آپ کس لیے اچھا نہ جائیں گے
پر یاد رکھیے منہ نہ کسی کو دکھائیں گے

یہ کہہ کے جھک گیا جو قدم پر وہ ذی وقار
بس ہو گئیں محبت قلبی سے بے قرار
پھیلا کے دونوں ہاتھوں کو اٹھیں بحال زار (٥٩)
شکوے کے بدلے منہ سے یہ نکلا کہ میں نثار
اتنا یہ دل کہ چشم کے ساغر چھلک پڑے
دیکھا جو آفتاب کو آنسو ٹپک پڑے

لے کر بلائیں بولیں کہ واری خفا نہ ہو
صدقے ہے تم پہ جان ہماری خفا نہ ہو
باتیں تھیں یہ تو پیار کی ساری خفا نہ ہو (٦٠)
روتے ہو کیوں منگاؤ سواری خفا نہ ہو
آئے بلا حسینؑ پہ جو اس کو رد کرو
اچھا سدھارو دکھ میں پدر کی مدد کرو

الفت کے جوش میں تو یہ منہ سے کہا مگر
اٹھا یہ دل میں درد کہ تھرا گیا جگر
کبریٰ کو روتے دیکھ کے بولی وہ نوحہ گر (٦١)
کیا ماجرا ہوا مجھے مطلق نہیں خبر
میں روکنے نہ پائی کہ داران کا چل گیا
کیا میں نے کہہ دیا کہ کلیجہ نکل گیا

کیا جانے اب نہ آئے گا گھر میں یہ نونہال
ہے ہے مری کمائی پہ آ جائے گا زوال
جس وقت سے شہید ہوئے رن میں دو لال (٦٢)
بے ہوش ہوں حواس میں ہو میرے اختلال
ایسا ہے اضطراب کہ کچھ جس کی حد نہیں
جو آپ میں نہ ہو سخن اس کا سند نہیں

میں ہوش میں نہ تھی یہ قدم پر گرے تھے جب
میں بھی کہوں یہ پاؤں پہ گرنے کا کیا سبب
وجہ یہ اب کھلا کہ یہ رخصت کی تھی طلب (٦٣)
اکبر کو میں نے ہاتھ سے کھویا تھا ہے غضب
اچھا مجھے نہیں مرے دلبر نے کیا کہا
میں نے جواب کیا دیا اکبر نے کیا کہا

کیا کہہ دیا تھا مرنے کو جائے یہ گل بدن | راضی ہوئی تھی میں کہ خزاں ہو مرا چمن

بے خود ہوں جب سے رن میں سدھارے شہ زمن (۶۴) | کہتی ہوں کچھ زباں سے نکلتا ہے کچھ سخن

اتنی خبر نہیں علی اکبر کے پیار میں | قابو میں ہے نہ دل نہ زباں اختیار میں

زندوں میں ہوتی گر تو یہ کہتی کہ کرنے جائیں | اس پیاس میں شہید ہوں فاقوں میں زخم کھائیں

اٹھارواں برس ہے دلہن تو مجھے دکھائیں (۶۵) | بالا ہے منتوں سے مرادیں مری بر آئیں

مرتی ہوں اشتیاق میں سہرا تو دیکھ لوں | سہرے کے نیچے چاند سا چہرہ تو دیکھ لوں

رخصت کے نام سے مرا پھٹتا ہے اب جگر | ایسا نہ ہو کہ بانوئے بیکس کو ہو خبر

گر سن لیا تو دل میں کہے گی وہ نوحہ گر (۶۶) | پیارا ہوا نہ بنتِ علی کو مرا پسر

سمجھی تھیں کیا جو دی اسے رخصت جدال کی | زینب نے ہائے قدر نہ کی میرے لال کی

سچ ہے کہ اس کی چاہ سے نسبت مجھے کہاں | ہوں لاکھ ان کی چاہنے والی وہ پھر ہے ماں

آنکھوں کا نور قلب کی طاقت بدن کی جاں (۶۷) | آنچ آتما[1] کی ہے وہ قیامت کہ الاماں

کیا سوچتے ہو صاحبو کچھ[2] تم کو خیر ہے | ماں ہے تو ماں ہے خلق میں پھر غیر غیر ہے

ماں کی نہ کم تو جی اور نہ کسی کا پیار | غصہ ہو یا کہ سخت کہے دل میں ہے نثار

بلبل فدا ہے گل پہ شکایت کرے ہزار (۶۸) | دنیا میں عاشقوں کے دلوں کو کہاں قرار

دیں ماں کا ساتھ نام خدا اب جوان ہیں | میرا ہو جب یہ حال پھر اسکی تو جان ہیں

جس دم سنے یہ درد سے بانو نے سب کلام | آئی قریب حضرت زینب وہ نیک نام

کی عرض ہاتھ جوڑ کے اے خواہر امام (۶۹) | میں ہوں کنیز آپ کی اور یہ پسر غلام

کس کی مجال ہے جو کہے گا یہ کیا کیا | بی بی نے دی غلام کو رخصت بجا کیا

---

[1] مادری محبت کا جوش، آتما سنسکرت لفظ ہے اس کے معنی ہیں نفس یا روح۔ انیس نے اس کو ماں کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ "آتما کی آنچ سے دل سینے میں مچھلی کی طرح تڑپتا ہے"۔ (آزاد۔ قصص ہند ۲ سنہ ۱۹ ص ۲۰)

[2] تمھارا دھیان کدھر ہے؟ تم حواس میں ہو؟ یہ فقرہ عورتوں کی زبان سے مخصوص ہے۔

لونڈی ہے فاطمہ کی کنیزوں میں باوفا ہو قطع وہ زباں جو کرے آپ کا گلا
حضرت کو ان کے سر پہ سلامت رکھے خدا (۷۰) مالک ہیں آپ اس میں کسی کو ہے دخل کیا
کچھ جائے گفتگو ہو نہ ماں کو نہ باپ کو
ہی دخل اذن دینے نہ دینے کا آپ کو
غم کھائیے نہ خون جگر آپ پیجیئے عابد کو بھیج دیجئے اصغر کو بھیجیئے
ہے اختیار دیجئے رخصت نہ دیجئے (۷۱) قربان جاؤں جو ہو مناسب وہ کیجئے
شادی ہو یا کہ غم ہو شریک ثواب ہوں
میں ہر طرح سے تابع حکم جناب ہوں
گھر میرا جب سے لٹ گیا اس گھر میں آئی ہوں شکوے کا کوئی حرف کبھی لب پہ لائی ہوں
کسریٰ کی گو کہ پوتی ہوں سلطاں کی جائی ہوں (۷۲) لونڈی ہوں آپ کی علی اکبر کی دائی ہوں
صدقہ یہ آپ کا ہی جو شہ کو عزیز ہوں
بھاوج نہ جانیے مجھے ادنیٰ کنیز ہوں
آپ اس کی ماں ہیں آپ کا فرزند ہی یہ لال دخل اس معاملے میں کوئی دے یہ کیا مجال
پھر عازم جدال ہے اور آپ کا یہ حال (۷۳) قدموں کو چھوڑتا نہ کبھی یہ نکو خصال
آپ اس کو چاہتی ہیں تصدق ہو آپ پر
پر کیا کرے کہ آج مصیبت ہی باپ پر
قسمت بری ہے اس میں کسی کا قصور کیا اچھا رہیں کہ جائیں ہمارا ابھی ہے خدا
پروا ہماری ہے نہ خیال ان کو آپ کا (۷۴) تابع ہم آپ کے بھی ہیں ان پر بھی ہیں فدا
عابد ہوں یا کہ یہ بھی آنکھوں کے تارے ہیں
پر اب یہ نہ آپ کے ہیں نہ ہمارے ہیں
یہ سن کے کانپنے لگی زینب جگر فگار آئی صدا کے فاطمہ بیٹی یہ ماں نثار
اللہ یہ محبت فرزند اور یہ پیار (۷۵) تنہا ستم کی فوج میں ہے میرا گل عذار
رخصت نہ دے گی تو اگر اس نور عین کو
کون اب بچائے گا مرے بیکس حسین کو
آواز سن کے کانپ گئی بنت مرتضیٰ بانو کے منہ کو دیکھ کے اکبر سے یہ کہا
داری سدھارو خیر جو کچھ مرضی خدا (۷۶) ترک ادب ہے تم کو اگر اب نہ دوں رضا
یاں والدہ بہشت سے تشریف لائی ہیں
بنت نبی تمھاری سفارش کو آئی ہیں

تسلیم کرکے خیمے سے وہ سیم بر چلا　　پیچھے حرم کا قافلہ سب ننگے سر چلا
بانو پکارتی تھی کہ پیارا پسر چلا (۷۷)　　چلاتی تھی پھپھی مرا لخت جگر چلا
لٹتے ہیں اہلبیت دہائی امام کی　　تصویر گھر سے جاتی ہے خیر الانام کی

بھائی کے غم سے عابد بے کس تھے بے قرار　　اٹھتے تھے اور زمین پہ گرتے تھے بار بار
بہنیں پکارتی تھیں کہ بھیا ترے نثار (۷۸)　　سینوں کو پیٹتی تھیں خواصیں بحال زار
اک حشر تھا جدا علی اکبر جو ہوتے تھے　　جھولے میں پھوٹ پھوٹ کے اصغر بھی روتے تھے

ہلتا تھا خیمہ رانڈوں میں تھی یہ دھڑا دھڑی　　آہوں کی بجلیاں تھیں تو اشکوں کی تھی جھڑی
کوئی ادھر کو غش تھی کوئی تھی ادھر پڑی (۷۹)　　آفت کا وقت تھا تو قیامت کی تھی گھڑی
ماتم تھا یہ حسین کے تازہ جوان کا　　جاتا ہے گھر سے جیسے جنازہ جوان کا

نکلا حرم سرا سے جو وہ نور حق کا نور　　خادم نے دی صدا کہ برآمد ہوئے حضور
حضرت کھڑے تھے خیمے کی ڈیوڑھی سے کچھ جو دور (۸۰)　　دست ادب کو جوڑ کے بولا وہ ذی شعور
رخصت ہوں اب جو حکم شہ نامدار ہو　　رو کر کہا حسین نے اچھا سوار ہو

گھوڑے پہ شاہزادۂ عالم ہوا سوار　　گویا چلے جہاد کو محبوب کردگار
تھا ثانی براق فلک سیر راہوار (۸۱)　　صرصر سے تند و تیز تو بجلی سے بے قرار
یوں سامنے سے وہ دم جولاں نکل گیا　　گویا ہوا پہ تخت سلیمان[۱] نکل گیا

حضرت تو یاں زمیں پہ گرے تھام کر جگر　　جاسوس نے یہ لشکر اعدا کو دی خبر
آتا ہے اک جوان حسین غیرت قمر (۸۲)　　چہرے پہ جس کے نور محمدؐ ہے جلوہ گر
شان و شکوہ سب اسد کبریا کی ہے　　کہتے ہیں سب بشر نہیں قدرت خدا کی ہے

۱۔ تخت سلیماں ۔ حضرت سلیمان کا تخت یا بساط جس کو ہوا ان کی مرضی کے موافق ہر طرف لے جاتی تھی ۔

ہے دھوم ذرّے ذرّے میں اس آفتاب کی　　خوشبو ہے زلف و جسم میں مشک و گلاب کی
سر تا قدم ہے شان رسالت مآب کی (۸۳) تصویر ہے رسول خدا کے شباب کی
گھوڑے کے گرد جن و ملک کا ہجوم ہے　　صلو علی النبی کی بیاباں میں دھوم ہے[1]

روشن کیا ہے روئے منوّر نے راہ کو　　رخ پر نہیں ٹھہرنے کا یارا نگاہ کو
حیراں ہے عقل دیکھ کے زلف سیاہ کو (۸۴) آغوش میں لیے ہے شب قدر ماہ کو
چہرے کے نور سے شب مہتاب ماند ہے　　خالق گواہ ہو کہ اندھیرے کا چاند ہے

یہ ذکر تھا کہ نور خدا جلوہ گر ہوا　　گویا رسول پاک کا رن میں گزر ہوا
چلائے اہل شام کہ طالع قمر ہوا (۸۵) ہنگام ظہر تھا پہ گمان سحر ہوا
جلوہ دکھایا برق تجلی طور نے　　خورشید کو چھپا دیا چہرے کے نور نے

غش ہو گیا کوئی کوئی گر کر سنبھل گیا　　صل علیٰ کسی کی زباں سے نکل گیا
خجلت سے آفتاب کا نقشہ بدل گیا (۸۶) چمکا جو نور دھوپ کا جوبن بھی ڈھل گیا
دریائے نور حق کا فقط اوج موج تھا　　سب پست تھے زمیں کے ستارے کا اوج تھا

صحرا کو شمع حسن نے تابندہ کر دیا　　جو مردہ دل تھے دم میں انھیں زندہ کر دیا
ذرّوں کو آفتاب درخشندہ کر دیا (۸۷) گردوں کو اس زمین نے شرمندہ کر دیا
پایہ زمیں کا عرش سے ہم دست ہو گیا[2]　　جادے سے اوج کاہکشاں پست ہو گیا

اللہ رے نبیرۂ مشکل کشا کی شان　　تھی جس کے عضو عضو سے پیدا خدا کی شان
حیراں تھے لوگ دیکھ کے اس مہ لقا کی شان (۸۸) حمزہ کا رعب زور علیؑ مصطفےٰ کی شان
پاکیزگی نسب میں بزرگی صفات میں　　شیرینی کلام حسنؑ بات بات میں

---

[1] نبیؐ (حضرت محمدؐ) پر درود بھیجو۔ حضرت علی اکبر نبی عربی سے صورت میں اس قدر مشابہ تھے کہ لوگ ان کو نبی سمجھ رہے تھے یا ان کو دیکھ کر نبی یاد آ رہے تھے۔

[2] ہم دست۔ ہم مرتبہ۔ برابر۔

کچھ حسن بچپنے کا تو کچھ آمدِ شباب — وہ گُل سا جسم اور وہ چہرے کی آب و تاب
اپنی جگہ پہ خال کے نقطے ہیں انتخاب (۸۹) پتلی کا نور جس کی سیاہی سے بہرہ یاب
گردن کی ضو میں طُور[۲] تجلی طور[۱] کے — سب عضو تن ڈھلے ہوئے سانچے میں نور کے

دل پاک روح پاک نظر پاک جسم پاک — طینت میں آبِ خلد تھا اور کربلا کی خاک
غرفوں سے جس کے حسن کی حوروں کو جھانک تاک[۳] (۹۰) یوسف جو دیکھ لیں تو کہیں روحنا فداک
نام اس کا لوح پر جو قلم نے رقم کیا — سو بار پڑھ کے سورۂ نور اس پہ دم کیا

کیا دخل چار ہو جو کسی بے ادب کی آنکھ — رکھتی تھی رعب یہ نہ عجم نہ عرب کی آنکھ
لاکھوں تھے اس طرف پہ جھپکتی تھی سب کی آنکھ (۹۱) غصّہ ستم کا قہر کی چتون غضب کی آنکھ
پانی تھا خوفِ جاں سے جگر ہر دلیر کا — آہو شکار کرتے تھے میداں میں شیر کا

غل تھا رسولِ پاک کے ثانی کو دیکھنا — حسنِ بہارِ باغِ جوانی کو دیکھنا
کھلتے ہیں گل شگفتہ بیانی کو دیکھنا (۹۲) یہ سب تو ہے یہ غنچہ دہانی کو دیکھنا
نازک لب اس صفت کے دہن اس طریق کا — خاتم پہ جڑ دیا ہے نگینہ عقیق کا

کچھ عمر بھی نہیں ابھی اٹھارواں ہے سال — یہ باغ کس بہار میں ہوتا ہے پائمال
قامت ہے یہ کہ سروِ گلستانِ اعتزال (۹۳) ماں باپ دیکھ دیکھ کے کیونکر نہ ہوں نہال
آنکھوں کے سامنے جو یہ قامت نہ ہووے گی — بتلاؤ ماں کے دل پہ قیامت نہ ہووے گی

زخمی جو ہوگی تیر سے یہ چاند سی جبیں — پٹکے گی سر کو خاک پہ بانوے دل حزیں
تیغوں سے جب کٹیں گے یہ رخسارِ نازنیں (۹۴) بیٹھیں گے دونوں ہاتھوں سے منھ اپنا شاہِ دیں
سینہ چھدے پسر کا تو کیا دل کو کل پڑے — ایوبؑ بھی جو ہوں تو کلیجہ نکل پڑے

۱؎ 'طور' اور 'طُور' میں تجنیس محرف ہے۔ ۲؎ طور سریانی زبان میں پہاڑ کو کہتے ہیں۔ اردو میں اس سے طور سینا یعنی کوہ سینا مراد لیتے ہیں۔ جہاں حضرت موسیٰ نے نور ایزدی کی تجلی یعنی روشنی دیکھی تھی۔ اس مناسبت سے طور کے ساتھ تجلی کا لفظ اکثر لاتے ہیں۔ ۳؎ ہماری روح تم پر نثار۔

ناگاہ فوج کیں سے عمر نے کیا کلام ۔۔۔ یہ وقت کارزار ہے اے ساکنان شام
بس ہے یہی بساط شہنشاہ خاص و عام (۹۵) مارا گیا یہ شیر تو مرجائیں گے امام
لوٹو جناب فاطمہ زہرا کے باغ کو ۔۔۔ ٹھنڈا کرو حسین کے گھر کے چراغ کو

تصویر مصطفٰے کی مٹائے گا آج جو ۔۔۔ کہتا ہوں میں کہ صاحب جاگیر ہوگا وہ
محبوب کبریا کے مشابہ ہے گر تو ہو (۹۶) اب مصلحت یہی ہے کہ مہلت اسے نہ دو
ہو اس سے کیا مراد حسین ہو کہ نیک ہو ۔۔۔ دو لاکھ اس طرف ہیں دلاور وہ ایک ہو

دنیا نہ جائے دین کا گو ہو تو ہو ضرر ۔۔۔ ٹکڑے کرو اسے کہ یہ دشمن کا ہے پسر
تم آبدیدہ ہو لب خشک اس کے دیکھ کر (۹۷) قطرہ نہ دو میں گھٹنوں اصغر بھی آئے گر
غیر از یزید اور کوئی حکمراں نہ ہو ۔۔۔ اولاد مرتضٰی میں کسی کا نشاں نہ ہو

ہاں غازیو نہ اس کی جوانی کا غم کرو ۔۔۔ نیزے پہ نیزے مارو ستم پر ستم کرو
برچھے اٹھاؤ ہاتھوں میں تیغیں علم کرو (۹۸) نخل مراد سبط نبی کو قلم کرو
بٹیا نہ جب ہاتو کدھر جائیں گے حسینؑ ۔۔۔ گھوڑے سے یہ گرے گا تو مرجائیں گے حسینؑ

پھد جائے گا سناں سے جو اس شیر کا جگر ۔۔۔ تڑپیں گے کیا زمیں پہ شہنشاہ بحر و بر
ڈیوڑھی سے ماں پکارے گی ہے ہے مرا پسر (۹۹) نکلے گی خیمہ گاہ سے زینب برہنہ سر
حضرت تو پیٹتے ہوئے لاشے پہ آئیں گے ۔۔۔ ہم لوٹنے کو خیمۂ اقدس میں جائیں گے

یہ گل عذار دختر حیدر کی جان ہے ۔۔۔ بہنوں کی زندگی ہے برادر کی جان ہے
بابا کی روح ہے تنِ مادر کی جان ہے (۱۰۰) بے جاں کرو اسے کہ یہ سب گھر کی جان ہے
جوشن[۱] بھی ہے بازوے برنا[۲] و پیر کا ۔۔۔ بعد اسکے خاتمہ ہو صغیر[۳] و کبیر کا

---

[۱] جوشن ایک طرح کی زرہ ۔ آفتوں سے محفوظ رہنے کی ایک دعا ۔ بازو پر باندھنے کا ایک زیور ۔
[۲] جوان ۔ [۳] چھوٹا بڑا ۔ جوشن صغیر اور جوشن کبیر دو دعائیں بھی ہیں ۔

یہ سن کے فوج کیں ہوئی آمادہ نبرد — درد دل حسین کا تھا ایک کو نہ درد
غل سن کے ہوگیا شہ والا کا رنگ زرد — (۱۰۱) کانپے جو پانوں بیٹھ گئے بھر کے آہ سرد
ماں گر پڑی زمیں پہ پھپھی بلبلا گئی — بدلی ستم کی واں علی اکبر پہ چھا گئی

قرنا پھنکی سپاہ میں طبل وغا بجا — باندھے پرے سواروں نے بڑھ بڑھ کے جا بجا
پیدل چلے نبرد کو باجے بجا بجا — (۱۰۲) چلائے اہل بیت کہ ہے ہے یہ کیا بجا
حضرت پکارے لال پہ اعدا کے ریلے ہیں — رانڈو دعا کرو علی اکبر اکیلے ہیں

لڑنے کو اس طرف سے عدو سب کے سب بڑھے — تنہا ادھر سے اکبر عالی نسب بڑھے
چومے قدم نہیب نے جھک کر یہ جب بڑھے — (۱۰۳) گویا پئے جہاد امیر عرب بڑھے
دہشت سے فوج شام کی بدلی سمٹ گئی — قدرت خدا کی دن چڑھا رات گھٹ گئی

ڈھالوں کو رکھ کے چہروں پہ گر گر پڑے حسود — گو تھے کئی ہزار پہ کیا ان کی ہست و بود
تھرا گیا تمام جنود سقر ورود — (۱۰۴) نور خدا کے سامنے ظلمت کی کیا نمود
عبرت سپاہ شام پہ وہ چند ہوگئی — باجوں کی فوج کیں کے صدا بند ہوگئی

جرار کی زرہ پہ لگے جب کئی خدنگ — صفدر نے بڑھ کے فاتحہ لی تیغ شعلہ رنگ
چمکا اک آئینہ کہ ہوئی فوج شام دنگ — (۱۰۵) دکھلائے تیغ تیز نے بجلی کے رنگ ڈھنگ
تھی کس کو تاب صاعقۂ شعلہ بار کی — یاد آگئی ہر اک کو چمک ذوالفقار کی

تھم تھم کے یوں گیا صف اعدا پہ وہ دلیر — جاتا ہے داؤں کر کے غزالوں پہ جیسے شیر
غازی کہ جو بھوک پیاس میں تھا زندگی سے سیر — (۱۰۶) کشتوں کے پشتے ہوگئے دم میں سروں کے ڈھیر
اک سیل زور و شور سے آئی گزر گئی — ثابت نہ یہ ہوا صف اول کدھر گئی

جب یہ بڑھے لہو تن اعدا کا گھٹ گیا — باقی تھا جو حباب وہ لاشوں سے پٹ گیا
لشکر میں فرد فرد کا چہرہ[1] جو کٹ گیا — (۱۰۷) بس دفعتاً سپاہ کا دفتر الٹ گیا
سر داخل خزانۂ سرکار ہوگئے — پہلا ہی جائزہ[2] تھا کہ بیکار ہوگئے

۱؎ فوج کے دفتر میں ہر سپاہی کا چہرہ یعنی حلیہ لکھ لیا جاتا تھا۔ چہرہ کٹ جانا۔ دفتر سے نام خارج ہوجانا۔ ۲؎ معائنہ جانچ۔ فوج کی حاضری۔

پھرے پہ ایک کے نہ بحالی نظر پڑی — جو صف بھری ہوئی تھی وہ خالی نظر پڑی
سر پر سبھوں کے تیغ ہلالی نظر پڑی (۱۰۸) — سوئے جنوب فوج شمالی نظر پڑی
غل تھا کہ تیغ تیز نہیں موت آتی ہے — کیونکر قدم تھمیں کہ زمیں سرکی جاتی ہے

ٹکڑے پڑے تھے خاک پہ بھالے ادھر ادھر — چھپتے تھے ڈر کے برچھیوں والے ادھر ادھر
پیش نظر تھے خون کے تھالے ادھر ادھر (۱۰۹) — اترے تھے دشت کیں میں رسالے ادھر ادھر
ملتا تھا فصل کا نہ ٹھکانا نہ باب کا — شیرازہ کھل گیا تھا ستم کی کتاب کا

بڑھ کر کسی نے وار جو روکا سپر کٹی — چار آئینہ کٹا زرہ خیرہ سر کٹی
نیزے کی ہر گرہ صفت نیشکر کٹی (۱۱۰) — سینہ کٹا جگر ہوا زخمی کمر کٹی
رہوار بھی دو نیم میان مصاف تھا — اس سب کے بعد منہ کو جو دیکھا تو صاف تھا

وہ گھاٹ باڑھ اور وہ اس کی چمک دمک — کانپی کبھی زمیں کبھی تھرا گئے فلک
شعلے میں یہ چمک تھی نہ بجلی میں یہ لپک (۱۱۱) — ہر ضرب میں سما سے تلاطم تھا تا سمک
کونین میں حواس بجا تھے نہ ایک کے — گاؤ زمیں سمٹتی تھی گھٹنوں کو ٹیک کے

سیدھی چلی وہ جب صف دشمن الٹ گئی — باقی تھی جتنی عمر تہ تیغ کٹ گئی
آکر زمیں پہ جب سوئے گردوں پلٹ گئی (۱۱۲) — بجلی سے رعد رعد سے بجلی لپٹ گئی
گرتے تھے جن زمین پہ منہ ڈھانپ ڈھانپ کے — ہٹتے تھے جبرئیل امیں کانپ کانپ کے

ملتا نہ تھا صفوں میں علم کا نشاں کہیں — چلے کہیں تھے شست[1] کہیں اور کماں کہیں
نیزے کہیں تھے ڈانڈ[2] کہیں اور سناں[3] کہیں (۱۱۳) — جمدھر[4] کہیں کمند[5] کہیں برچھیاں کہیں
اک اک سیاہ رو کا جگر داغ داغ تھا — جنگل تمام ڈھالوں کے پھولوں سے باغ تھا

---

[1] شست۔ چمڑے کا انگشتانہ جو تیر انداز انگوٹھے میں پہن لیتے ہیں [2] ڈانڈ۔ بانس یا کسی دوسری لکڑی کا ڈنڈا جس پہ برچھی کا پھل لگا لیتے ہیں [3] سناں۔ نیزے اور برچھی کا پھل [4] جمدھر۔ ایک ہتھیار جو خنجر سے مشابہ ہوتا ہے۔ [5] کمند۔ وہ رسی جس سے جنگ میں سپاہی اپنے مقابل کو پھانس لیتے تھے۔ اسی کے ذریعے سے مکان کی چھت اور قلعے کی دیوار پر چڑھ جاتے تھے۔

بجلی گری اٹھی ادھر آئی ادھر گئی — خالی کیے پرے تو صفیں خوں میں بھر گئی
کاٹے کبھی قدم کبھی بالائے سر گئی (۱۱۴) — ندی غضب کی تھی کہ چڑھی اور اتر گئی
اک شور تھا یہ کیا ہے جو قہر صمد نہیں — ایسا تو رود نیل میں بھی جزر و مد نہیں

سر خود سروں کے چنبر[1] گردن سے اڑ گئے — ہاتھ آستیں سے اڑ گئے سر تن سے اڑ گئے
ڈر ڈر کے سب پرند نشیمن سے اڑ گئے (۱۱۵) — یانی جو ماہ طائر جاں تن سے اڑ گئے
تھے قتل عام پر علی اکبر تلے ہوئے — بہتے تھے بند زخموں کے کوچے[2] کھلے ہوئے

اللہ رے دو زبانی تیغ دو دم کا کاٹ — آفت تھی جس کی باڑھ قیامت تھا جس کا گھاٹ
مقتل سے تا بہ نہر تھا دریائے خوں کا پاٹ (۱۱۶) — ہر دم تھی اس کو تازہ لہو چاٹنے کی چاٹ
سختی کو جوڑ بند کی کب مانتی تھی وہ — ہر استخواں کو مغز قلم[3] جانتی تھی وہ

آئی جدھر پلٹ کے صفوں کو بچھا گئی — تن سے اڑا دیا وہیں سر جس کو پا گئی
ہر اک کڑی کو نرم سمجھ کر چبا گئی (۱۱۷) — فولاد کی زرہ کو اشارے میں کھا گئی
چار آئینے[4] کا کاٹ بھی اس پر حوالہ تھا — ذکر اس کا کیا ہے خود تو منھ کا نوالہ تھا

یارا قرار کا تھا نہ صورت فرار کی — پیدل کی موت تھی تو خرابی سوار کی
روئیں تنوں کو تاب نہ تھی ایک وار کی (۱۱۸) — ٹکڑے تھے دو کے ہاتھ یہ گھاٹی تھی چار کی
آگے بڑھے تو منھ وہیں کٹ جائے گیو[5] کا — بجلی کی تھی کڑک کہ طمانچہ تھا دیو کا

---

[1] چنبر۔ حلقہ۔

[2] زخم کا کوچہ۔ زخم کا شگاف یا منھ۔

[3] کلک کے قلم کے ریشے جو بہت نازک ہوتے ہیں اور نہایت آسانی سے کٹ سکتے ہیں۔

[4] شمشیر بازی کی ایک مشق جس میں چار معین مقامات پر ضرب لگائی جاتی ہے۔

[5] ایران قدیم کا ایک نامی پہلوان۔

اتری زمیں پہ وہ سرِ دشمن پہ جب چڑھی — دم بھر میں آبِ تیغ کی ندی غضب چڑھی
اک شور تھا صفوں میں کب اتری یہ کب چڑھی (۱۱۹) — سب کو بخار[۱] تیغ سے لرزے کی تپ چڑھی
مقتل سے بھاگنے پہ تنک ظرف تل گئے — کانپے یہ نیزہ باز کہ سب بند[۲] کھل گئے

زندہ[۳] کسی کو تیغِ دو دم[۴] چھوڑتی نہ تھی — پیاسی یہ تھی کہ جسم میں دم چھوڑتی نہ تھی
بے دم لیے گلا کوئی دم چھوڑتی نہ تھی (۱۲۰) — بھاگیں کہاں کہ موت قدم چھوڑتی نہ تھی
خود وہ دبے جو لڑتے تھے گھوڑوں کو داب کے — بیڑی قدم میں بن گئے حلقے رکاب کے

قوسیں کشتۂ ضربِ نخست تھے — بے سر ہوئے بہت جو لڑائی میں چست تھے
قبضے میں تھا نہ زور نہ بازو درست تھے (۱۲۱) — کھنچیں کسے کمانوں کے بازو[۵] بھی سست تھے
ہر ہیچ نہاد تیر اجل کا نشانہ نہ تھا — شانے بھی تھے قلم پہ بنا شاخسانہ تھا

تیغوں کو ڈر کے عربدہ جو پھینکنے لگے — مغفر سروں سے مثل سبو پھینکنے لگے
حلقے کماں کے سب لب جو پھینکنے لگے (۱۲۲) — تنکا سمجھ کے تیر عدو پھینکنے لگے
ترکش بھی اہلِ ظلم کے آفت رسیدہ تھے — چلّے بھی کشمکش میں کماں سے کشیدہ[۶] تھے

کرتے تھے فتح جنگ کو جو ایک آن میں — رعشہ تھا ان کے ہاتھ میں لکنت زبان میں
الجھاتے تھے کمند کمینے کمان میں[۷] (۱۲۳) — ترکش میں تیغیں رکھتے تھے تیروں کو میان میں
تلوار رکھ کے ہاتھ سے منھ ڈھانپ لیتے تھے — آتی تھی تیغ جب تو سپر پھینک دیتے تھے

---

۱ یہاں 'بخار' سے گرمی، دشمنی یا غصہ مراد ہے۔ ۲ بند، جوڑ۔ نیزے کے داؤں۔ ہڈیوں کے جوڑ۔

۳ اس بند میں 'دم' کی تکرار ہے۔ ۴ تیغ دو دم۔ دو دھاری تلوار۔

۵ کمان کے بیچ کا حصہ چھوڑ کر دونوں طرف کے باقی حصے اس کے بازو ہیں۔

۶ کھنچے ہوئے۔ ناراض۔

۷ اس مصرع میں تین لفظ ایسے ہیں جو کاف میم سے شروع ہوتے ہیں اور جن میں نون بھی کسی نہ کسی جگہ موجود ہے۔ اس التزام سے کلام میں ایک خاص صنعت پیدا ہو گئی ہے۔

بڑھتے تھے جو پرے سے بڑے بول بول کے
پہلے انھیں کو مار لیا رول رول کے
حملہ کیا جو تیغ دو دم تول تول کے
(۱۲۴) ہتھیار سب نے پھینک دیئے کھول کھول کے
اس شان سے کبھی نہ عجم نہ عرب لڑے
دو دن کی پیاس میں علی اکبر غضب لڑے

دہشت سے کتنے ڈوب کے دریا میں مر گئے
اس گھاٹ[1] پر جو آئے سر ان کے اتر گئے
رستہ تھا ایک ادھر وہ گئے یا ادھر گئے
(۱۲۵) ہر پھر کے ہر طرف سے میان سقر گئے
نار انکے اشتیاق میں آب ان کی لاگ میں
بھیگا ہوا نہ پانی میں تپی نہ آگ میں

وہ حرب وہ شکوہ وہ شان پیمبری
نعرے وہ زور شور کے وہ ضرب حیدری
وہ تیغ خوں چکاں وہ جلال غضنفری
(۱۲۶) راکب جو رشک حور تو رہوار بھی پری
چالاک آہوان ختن اس قدر نہ تھے
اڑ جاتا تھا ہما کی طرح اور پر نہ تھے

باریک جلد وہ کہ نظر آئے تن کا خوں
کنڈلے[2] کو دیکھ کر مہ نو ہوئے سرنگوں
رفتار میں وہ سحر کہ پریوں کو ہو جنوں
(۱۲۷) غنچے بھی کچھ بڑے ہیں کنوتی کو کیا کہوں
قرباں ہزار جاں فرس بے نظیر پر
سوفار[3] دو چڑھے ہوئے ہیں ایک تیر پر

کوتاہ[4] و گرد و صاف کنوتی کمر کفل
کیا خوش نما کشادگی سینہ و بغل
سیماب کی طرح نہیں آرام ایک پل
(۱۲۸) پھرتا تھا اس طرح کہ پھرے جس طرح سے کل
رک کے نہ سانس لی کہ وہ کوسوں رواں نہ تھا
تار نفس بھی اس کے لیے تازیانہ تھا

---

[1] گھاٹ دریا کا بھی ہوتا ہے اور تلوار کا بھی۔ سر اترنا کے معنی ہیں سر کٹنا لیکن 'اترنا' دریا کو عبور کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ گھاٹ' اور اتر گئے سے کلام میں ایہام پیدا ہو گیا ہے۔

[2] گھوڑے کی گردن کا خم۔

[3] گھوڑے کے کان اتنے چھوٹے اور ایسے سیدھے کھڑے ہوئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک تیر پر دو سوفار چڑھا دیے گئے ہیں۔

[4] پہلے تین صفتیں بیان کی گئی ہیں۔ پھر ترتیب وار ہر صفت کا موصوف لایا گیا ہے۔ یعنی کوتاہ کنوتی گرد کمر۔ صاف کفل: گرد کے معنی گول اور کفل کے معنی پٹھا

وہ چُست و خیز و سرعت و چالاکی سمند — سانچے میں تھے ڈھلے ہوئے سب اسکے جوڑ بند
سُم قرصِ ماہتاب سے روشن ہزار چند (۱۲۹) — نازک مزاج و شوخ و سیہ چشم و سربلند
گر ہل گئی ہوا سے ذرا باگ اڑ گیا — پتلی سوار کی نہ پھری تھی کہ مڑ گیا

آہو کی جست شیر کی آمد پری کی چال — کبکِ دری خجل دلِ طاؤس پائمال
سبزہ سبک روی میں قدم کے تلے نہال (۱۳۰) — اک دو قدم میں بھول گئے چوکڑی غزال
جو آگیا قدم کے تلے گردِ راہ[1] تھا — چھل بل غضب کی تھی کہ چھلاوا بھی گرد تھا

بجلی کبھی بنا کبھی رہوار بن گیا — آیا عرق تو ابرِ گہربار بن گیا
گہہ قطب گاہ گنبدِ دوّار بن گیا (۱۳۱) — نقطہ کبھی بنا کبھی پرکار بن گیا
حیراں تھے اسکی گشت پہ لوگ اس ہجوم کے — تھوڑی سی جا میں پھرتا تھا کیا جھوم جھوم کے

جب اس جری نے قتل کیے پانچ سو جواں — ہر صف سے ہر پرے سے اٹھا شورِ الاماں[2]
چلایا ابنِ سعد یہ قلب و سخت جاں (۱۳۲) — نکلیں وہ دس ہزار کماندار ہیں کہاں
برچھی کا اب ہے کام نہ تلوار چاہیے — اس نوجواں پہ تیروں کی بوچھار چاہیے

یہ سن کے تشنہ لب پہ چلے چار سو سے تیر — پھر عقب سے پڑنے لگے روبرو سے تیر
آتے تھے فوج فوج سیاہ عدو سے تیر (۱۳۳) — سب سرخ تھے شبیہ نبی کے لہو سے تیر
مقتل میں کیا ہجوم تھا اس نورِ عین پر — پروانے گر رہے تھے چراغِ حسین پر

سینے پہ تیر کھا کے اٹھایا جو راہوار — بجلی چمک کے ہو گئی گویا فلک کے پار
سر خاک پر گرانے لگی تیغِ آبدار (۱۳۴) — تیروں کو پھینک پھینک کے بھاگے خطا شعار
حملہ کیا تھا جن پہ رخ انکے تو پھر گئے — پر پلٹ کے برچھیوں والوں میں گھر گئے

---

[1] خاک میں مل گیا تھا۔

[2] پناہ ۔ میدانِ جنگ میں دشمن سے رحم کی درخواست کرتے وقت ’الاماں‘ ’الاماں‘ پکارتے تھے۔

یوں آگیا سناؤں میں وہ آسماں جناب | ہو جس طرح خطوط شعاعی میں آفتاب
سوکھی زباں میں پڑ گئے کانٹے بغیر آب | طاقت بھی فرط ضعف سے دینے لگی جواب (۱۳۵)
آمد ہوئی جو غش کی سر پاک جھک گیا
واحسرتا کہ ہاتھ بھی لڑنے سے رک گیا

اس حال میں بھی تیغ سے کیں برچھیاں قلم | لیکن جگر پہ لگ گیا اک نیزۂ ستم
زخم جگر سے بہنے لگا خون دمبدم | نکلے ہوئے رکابوں سے تھرّاتے تھے قدم (۱۳۶)
کھینچا جو اس نے سینے سے نیزہ نکل گیا تھا
دو پارۂ جگر نکل آئے سناں کیا تھا

نیزہ لگا کے بھاگ چلا تھا وہ نابکار | قربان جرأت پسر شاہ نامدار
زخم سناں تھا سینۂ انور کے وار پار | ماری شقی کو دوڑ کے اک تیغ آبدار (۱۳۷)
پہنچوں سے اسکے ہاتھ قلم ہو کے گر پڑے
لیکن فرس سے آپ بھی خم ہو کے گر پڑے

گرنا تھا بس کہ سر پہ لگا گرز ہے ستم | یوں جھک گئے کہ ہوتے ہیں سجدے میں جیسے خم
رکھ دی گلے پہ شیث[۲] نے شمشیر تیز دم | تلوار اک پڑی کہ ہوئیں پسلیاں قلم (۱۳۸)
غل تھا کہ دو نہ رحم تن پاش پاش پر
دوڑا دو گھوڑے اکبر مہرو کی لاش پر

حضرت کھڑے تھے خیمے کی پکڑے ہوئے طناب | سن کر یہ غل رہی نہ دل ناتواں کو تاب
ناگاہ آئی رن سے صدائے فلک جناب | بیٹا جہاں سے جاتا ہے اب آئیے شتاب (۱۳۹)
لاشے پہ ظلم و جور بدافعال کرتے ہیں
گھوڑے سے اہل کیں ہمیں پامال کرتے ہیں

---

[۱] اسی مفہوم کو انیس نے ایک دوسری بیت میں یوں ادا کیا ہے ؎

یوں برچھیاں تھیں چار طرف اس جناب کے
جیسے کرن نکلتی ہے گرد آفتاب کے

اس تشبیہہ کے ذریعے سے انیس نے ایک بیکسی اور بیچارگی کی حالت میں عظمت اور شان پیدا کر دی ہے۔

[۲] یزیدی فوج کا ایک نامی سپاہی۔

سُن کر یہ استغاثہ[1] فرزندِ خوش خصال   سیّد[2] نے آہ کی کہ ہلا عرشِ ذوالجلال
کھولے جنابِ فاطمہ کی بیٹیوں نے بال (۱۴۰)   بانو پکاری خیر تو ہے اے علی کے لال
ہے ہے پسر سے کون سی ماں چھوٹ گئی   صاحب بتاؤ کیا مری بستی اجڑ گئی

نیزے سے کس کے لال کا زخمی ہوا جگر   کرتے ہیں کس کی لاش کو پامال اہلِ شر
کہتا ہے کون رن میں تڑپ کر پدر پدر (۱۴۱)   اب گھر سے میں نکلتی ہوں ہو ہو مرا پسر
پردہ نہ مجھ سے کیجیے سب جانتی ہوں میں   آواز یہ اسی کی ہے پہچانتی ہوں میں

بانو کو قسمیں دے کے چلے شاہِ نامدار   وہ پیاس اور وہ دھوپ کا صدمہ وہ اضطرار
دل تھا الٹ پلٹ تو کلیجہ تھا بے قرار (۱۴۲)   اٹھتے تھے اور زمین پہ گرتے تھے بار بار
چلاتے تھے شبیہِ پیمبر ہم آتے ہیں   گھبرائیو نہ اے علی اکبر ہم آتے ہیں

بیٹا پکارو پھر کہ بصارت میں فرق ہے   اے نورِ عین جسم کی طاقت میں فرق ہے
تم یہ نہ جانیو کہ محبت میں فرق ہے   زخمی ہے قلب روح کی راحت میں فرق ہے (۱۴۳)
داغِ جگر ہیں لاگودی میں پال کے   کس کو دکھاؤں اپنا کلیجہ نکال کے

آؤں کدھر کو اے علی اکبر جواب دو   چلا رہی ہے ڈیوڑھی پہ مادر جواب دو
اکبر برائے خالقِ اکبر جواب دو (۱۴۴)   بیٹا جواب دو مرے دلبر جواب دو
گرتے ہیں ہم ثواب کا ہاتھوں سے کام لو   بیٹا ضعیف باپ کے بازو کو تھام لو

کچھ سوجھتا نہیں میں کدھر جاؤں کیا کروں   اے نورِ چشم[3] تجھ کو کہاں پاؤں کیا کروں
مضطر ہے جانِ دل کسے سمجھاؤں کیا کروں (۱۴۵)   کیونکر پسر کو ڈھونڈ کے میں لاؤں کیا کروں
پایا تھا مدتوں میں جسے خاک چھان کے   وہ لعل ہم نے کھو دیا جنگل میں آن کے

---

۱ مدد کے لیے پکارنا۔

۲ سردار۔ مراد امام حسین۔

۳ آنکھوں کا نور مجازاً بیٹا۔ یہاں دونوں معنی مراد ہیں۔ یہ صنعتِ ادماج کی ایک مثال ہے۔

بس اب خبر حسین کی لے جلد اے اجل ۔ اے جسم زار زیست کا باقی نہیں محل
اے جان ناتواں تن مجروح سے نکل[۱۴۶] ہاں اے نفس چھری کی طرح سے گلے پہ چل
چھوٹے نہ اسکا ساتھ جو پیری کی آس ہو
لاشہ بھی لاشۂ علی اکبر کے پاس ہو

جنگل سے بے حواس پھرے نہر پر گئے ۔ واں بھی جو وہ گہر نہ ملا سوئے بر گئے
دوڑے کسی طرف تو کسی جا ٹھہر گئے[۱۴۷] ہٹالے لے لہو کے برابر جدھر گئے
ٹپکا ہوا زمیں پہ جگر کا لہو ملا
لیکن کہیں نہ وہ پسر ماہ رو ملا

جا کر صفوں کے پاس پکارے باشکِ آہ ۔ ہے کس طرف مرے علی اکبر کی قتل گاہ
اے ظالمو یہ شب ہے کہ دن ہو گیا سیاہ[۱۴۸] کس ابر میں چھپا ہے مرا چودھویں کا ماہ
بتلاؤ جان ہو کہ نہیں جسم زار میں
زخمی پڑا ہے شیر مرا کس کچھار میں

لاشِ پسر کو ڈھونڈتے تھے شاہ بحر و بر ۔ سر پیٹنے کی جا ہے کہ ہنستے تھے اہل شر
کہتا تھا شمر اے پسر سیّد البشر[۱۴۹] کس کو حضور ڈھونڈھتے ہیں مر گیا پسر
خود ڈھونڈھ لیجیے جسدِ پاش پاش کو
بتلائیں گے نہ ہم علی اکبر کی لاش کو

یہ سُن کے کھینچ لی شہ والا نے ذوالفقار ۔ چمکی جو برق تیغ تو بھاگے ستم شعار
شہ کو نظر پڑا علی اکبر کا راہوار[۱۵۰] چلائے اے عقابؔ کدھر ہے ترا سوار
دکھلادے مجھ کو لاش مرے نورِ عین کی
کس دشت میں پڑی ہے بضاعت حسین کی

ملنے دے ان رکابوں کے حلقوں سے چشم نم ۔ ہے ہے اسی میں تھے مرے فرزند کے قدم
بوسے تری لگام کے لوں میں اے عقیم[۱۵۱] اکبر کے ہاتھ میں تھی یہی باگ ہے ستم
ہے ہے وہ ہاتھ پاؤں مرے آفتاب کے
قرباں تری لگام کے صدقے رکاب کے

لے حضرت علی اکبر کے گھوڑے کا نام۔

گھوڑے نے ہنہنا کے کہا دشت کی نظر · یعنی کہ لاش آپکے پیارے کی ہے ادھر
جاتا تھا آگے آگے وہ تازی بچشم تر · (۱۵۲) گھوڑے کے پیچھے پیچھے تھے سلطان بحر و بر
جنگل میں لاشۂ پسر نوجواں ملا · وہ مہ لقا ملا تو مگر نیم جاں ملا

دیکھی عجیب حالت فرزند نوجواں · پیکاں گلے میں ہونٹوں پہ نکلی ہوئی زباں
تن پر جراحت تبر و خنجر و سناں · (۱۵۳) گردن تھی کج پھری ہوئی آنکھوں کی پتلیاں
ٹاپوں سے مرکبوں کی جراحت پھٹے ہوئے · چہرہ سفید خاک میں گیسو اٹے ہوئے

ہچکی کے ساتھ کہتے ہیں واکرکے چشم تر · اے جان جسم زار میں اور ایک دم ٹھہر
اے موت بے وطن کی جوانی پہ رحم کر · (۱۵۴) اے درد تھم ذرا کہ پھٹا جاتا ہے جگر
پھر ایک بار سید والا کو دیکھ لوں · مہلت بس اتنی دے کہ میں بابا کو دیکھ لوں

دشمن کو بھی نہ بیٹے کا لاشہ خدا دکھائے · حضرت زمیں پہ گر کے پکارے کہ ہائے لئے
زندہ رہے یہ پیر جواں یوں جہاں سے جائے · (۱۵۵) اے لال تین روز کے فاقے میں زخم کھائے
شاید جگر کے زخم سے تم بے قرار ہو · زخمی تمہاری چھاتی پہ بابا نثار ہو

کیوں کھینچتے ہو پاؤں کو اے میرے گل عذار · کیوں ہاتھ اٹھا اٹھا کے پٹکتے ہو بار بار
آنکھیں تو کھول دو کہ مرا دل ہے بے قرار · (۱۵۶) بیٹا تمہاری ماں کو تمہارا ہے انتظار
بہنیں کھڑی ہیں در پہ بڑے اشتیاق میں · اکبر تمہاری ماں نہ جیے گی فراق میں

غش میں سنا جو ہیں علی اکبر نے ماں کا نام · کس یاس کی نگاہ سے دیکھا سوئے خیام
سوکھی زباں دکھا کے یہ بولا وہ تشنہ کام · (۱۵۷) شدت یہ پیاس کی ہے کہ دشوار ہے کلام
اب اور کوئی دم کا پسر میہمان ہے · امداد یا حسین کہ پانی میں جان ہے

فرمایا شہ نے اے علی اکبر میں کیا کروں · پانی نہیں ہے مجھ کو میسر میں کیا کروں
گھیرے ہیں نہر کو یہ ستمگر میں کیا کروں · (۱۵۸) کچھ بس نہیں مرا اے دلبر میں کیا کروں
اعدا نہ دیں گے بوند اگر لاکھ کد کریں · بیٹا تمہاری ساقی کوثر مدد کریں

حضرت یہ کہتے تھے کہ چلا خلق سے پسر — اتنی زباں ہلی کہ خدا حافظ اے پدر
ہچکی جو آئی تھام لیا ہاتھ سے جگر [۱۵۹] — انگڑائی لے کے رکھ دیا شہ کے قدم پہ سر
آباد گھر لٹا شہِ والا کے سامنے — بیٹے کا دم نکل گیا بابا کے سامنے

لکھا ہے ایک راوی غمگین و پر ملال — یعنی ادھر ہوا علی اکبر کا انتقال
نکلی حرم سے ایک زنِ فاطمہ جمال [۱۶۰] — گویا جناب سیّدہ کھولے ہوئے تھیں بال
تھی اس طرح سے رُخ پہ ضیا اس جناب کے — حلقہ ہو جیسے نور کا گردِ آفتاب کے

چلاتی تھی ارے مرا پیارا ہے کس طرف — اے آسماں وہ عرش کا تارا ہے کس طرف
اے ابرِ شام چاند ہمارا ہے کس طرف [۱۶۱] — اے ارضِ کربلا وہ سدھارا ہے کس طرف
ہے ہے سناں سے جان گئی میہمان کی — میت کدھر کو ہو مرے کڑیل جوان کی

اے میرے لمبے گیسوؤں والے کدھر ہے تو — ہے ہے مرے غریبی کے پالے کدھر ہے تو
واری کہاں لگے تجھے بھالے کدھر ہے تو [۱۶۲] — کیونکر پھپھی جگر کو سنبھالے کدھر ہے تو
اٹھارواں برس تھا کہ موت آگئی تجھے — اے نورِ عین کس کی نظر کھا گئی تجھے

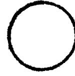
ہے ہے مرے سعید و رشید و متیں جواں — خوش رو جواں غریب جواں مہ جبیں جواں
صفدر جواں شکیل جواں نازنیں جواں [۱۶۳] — کس نے تجھے مڑوڑ لیا اے حسیں جواں
آغاز تھیں مسیں ابھی ایسے سن نہ تھے — بچے مرے ابھی ترے مرنے کے دن نہ تھے

یہ بین کرتی جاتی تھی وہ سوختہ جگر — سیدانیوں کا غول تھا پیچھے برہنہ سر
جاتی تھی بے حواس ادھر سے وہ نوحہ گر [۱۶۴] — آئے اُدھر سے لاش لیے شاہ بحر و بر
دیکھا لہو رواں جو تنِ پاش پاش سے — سب بیبیاں لپٹ گئیں اکبر کی لاش سے

ہاں شاہِ دیں کے تعزیہ دارو بکا کرو — ہاں اے خدا کے دوست کے پیارو بکا کرو
ماتم میں ہاتھ سینے پہ مارو بکا کرو [۱۶۵] — اکبر جہاں سے اٹھ گئے یارو بکا کرو
سمجھو شریک بزمِ شہِ مشرقین کو — دو نوجوان بیٹے کا پرسا حسین کو

ہے ہے حسینؑ آپ کا دلبر بچھڑ گیا ۔۔۔ فریاد ہے شبیہ پیمبر بچھڑ گیا
واحیف وادریغ دلاور بچھڑ گیا (۱۶۶) ۔۔۔ دردا و حسرتا علی اکبر بچھڑ گیا
مظلومیت پہ تشنہ دہانی پہ روئیں گے ۔۔۔ جب تک جئیں گے اسکی جوانی پہ روئیں گے

آقا انیسؔ ہند میں کب تک پھرے تباہ ۔۔۔ گھٹتی ہے عمر بڑھتے چلے جاتے ہیں گناہ
ضعف اس برس بہت ہے اجل آنہ جائے آہ (۱۶۷) ۔۔۔ بلوائیے غلام کو اے میرے بادشاہ
قرب مزار شاہ دوعالم نصیب ہو
بس کربلائیں اب کی محرم نصیب ہو



زر کے لیے حق نے کیمیا پیدا کی ۔۔۔ جو درد دیا اس کی دوا پیدا کی
عصیاں کے مرض کا جو نہ تھا کوئی علاج ۔۔۔ اس کے لیے یہ خاک شفا پیدا کی

راحت کیا حاسدوں سے حاصل ہوتی ۔۔۔ لذت دنیا کی زہر قاتل ہوتی
اس وقت میں گر خضرؑ و مسیحا ہوتے ۔۔۔ دو چار گھڑی بھی زیست مشکل ہوتی

مضموں گوہر ہیں اور صدف سینا ہے ۔۔۔ ہے صاف تو یہ کہ قلب بے کینا ہے
آئینہ سا روشن ہے کلام اپنا انیسؔ ۔۔۔ ہم اس کو نظر آئیں گے جو بینا ہے

ناقدری احباب سے حیراں ہوں میں ۔۔۔ آئینہ فروش شہر کوراں ہوں میں
ہے اک نظر لطف ہماری قیمت ۔۔۔ بینا ہو خریدار تو ارزاں ہوں میں

مرثیہ (۵)

جب نوجواں پسر شہ دیں سے جدا ہوا — روشن قمر سپہر بریں سے جدا ہوا
نور نظر امام مبیں سے جدا ہوا — (۱) لخت جگر حسین حزیں سے جدا ہوا
دل داغ ہو گیا دل و جان بتول کا — گھر بے چراغ ہو گیا سبط رسول کا

برچھی سے ٹکڑے ہو گیا لخت جگر کا دل — خود باپ نے چھدا ہوا دیکھا پسر کا دل
ہوتا ہے آبگینے سے نازک بشر کا دل — (۲) پتھر کا دل نہیں ہے یہ دل ہو پدر کا دل
ایوب بھی اگر ہوں تو دم بھر نہ کل پڑے — آنسو تھمیں تو منھ سے کلیجہ نکل پڑے

پیری میں آفت غم اولاد الاماں — دل اور زخم خنجر بیداد الاماں
وہ اضطراب خاطر ناشاد الاماں — (۳) وہ اشک شور اور وہ فریاد الاماں
بیٹا نہ ہو تو زیست کا پھر کیا مزا رہا — جب گھر اجڑ گیا تو زمانے میں کیا رہا

بسمل کے لوٹنے کی کسی دل کو کیا خبر — غربت میں کون لٹ گیا منزل کو کیا خبر
کشتی کے ڈوب جانے کی ساحل کو کیا خبر — (۴) کس پر چھری یہ چل گئی قاتل کو کیا خبر
خاروں سے پوچھیے نہ کسی گل سے پوچھیے — صدمہ چمن کے لٹنے کا بلبل سے پوچھیے

بچھڑا وہ لال جس کا گوارا نہ تھا فراق — فرماتے تھے کہ لوٹ لیا تو نے اے عراق
اے موت جلد آ کہ بس اب زندگی ہے شاق — (۵) خنجر کی آرزو ہے شہادت کا اشتیاق
برباد اس طرح کوئی آباد گھر نہ ہو — کیا زندگی کا لطف جب ایسا پسر نہ ہو

بچھڑے پدر سے اکبر مہرو ہزار حیف — اب[1] رو ہے سامنے نہ وہ ابرو ہزار حیف
کیا خوشنما تھے دوش پہ گیسو ہزار حیف — (۶) وہ بھینی بھینی جسم کی خوشبو ہزار حیف
وہ زلف و رخ وہ پیار کی باتیں کدھر گئیں — وہ دن کہاں ہیں آہ وہ راتیں کدھر گئیں

---

[1] ’اب رو‘ اور ’ابرو‘ میں تجنیس تام مرکب ہے۔

سب چاہیں جس کی زیست وہ شیرِ ژیاں[1] مرے
پیدا تو کس جگہ ہوئے آ کر کہاں مرے
(۷) افسوس نیم جاں جیسے بجان جہاں مرے
قدرت خدا کی پیر جیے نوجواں مرے
اس عمر میں جہاں سے گزرنے کے دن نہ تھے
کہتا ہو خود شباب کہ مرنے کے دن نہ تھے

پھولے پھلے نہ وہ چمن روزگار میں
دیکھا کبھی نہ ایک گل ایسا ہزار میں
(۸) جھونکا چلا ہوائے خزاں کا بہار میں
کیا زور ہے امانت پروردگار میں
بے بس تھے وہ کہ ساتھ پدر کو نہ لے گئے
جس دم طلب ہوئی تو اکیلے چلے گئے

روتے ہوئے حرم میں گئے قبلۂ انام
[2]رخ زرد دل میں درد بدن سرد تشنہ کام
(۹) تر تھی لہو سے لختِ جگر کے قبا تمام
طاقت نہ قلب میں نہ بدن میں لہو کا نام
یہ درد تھا بکا میں کہ دل ٹکڑے ہوتے تھے
یہ حال تھا کہ رونے پہ دشمن بھی روتے تھے

پیارے نہ تھے حسین علیہ السلام کے
تھراتے تھے پاؤں شہ تشنہ کام کے
(۱۰) لائی حرم سرا میں بہن ہاتھ تھام کے
سر دوش پر تھا زینب عالی مقام کے
فرماتے تھے بہن علی اکبر گزر گئے
ہم ایسے سخت جاں ہیں کہ اب تک نہ مر گئے

پرسا تمہیں شہیدوں کا دینے کو آئے ہیں
پیٹے ہیں خاک اڑائی ہو آنسو بہائے ہیں
(۱۱) کس کس کے داغ آج جگر پر اٹھائے ہیں
یہ ہم تمہارے لال کے خوں میں نہائے ہیں
سر تھا حسین بیکس و تنہا کی گود میں
بیٹے کی جان نکلی ہے بابا کی گود میں

سر بار دوش ہے ہمیں رخصت کرو بہن
مرتے پڑے ہوئے ہیں عزیزوں کے بے کفن
(۱۲) اب عنقریب خیمۂ عصمت ہیں تیغ زن
پامال ہو نہ لاشۂ فرزند صف شکن
محجوب ہم ہیں قاسم بے پر کی روح سے
شرمندگی نہ ہو علی اکبر کی روح سے

---

[1] خوف ناک۔ غضب ور۔ [2] اس مصرع کے درمیان میں تین لفظ ہم قافیہ آئے ہیں۔ 'زرد' 'درد' 'سرد'۔ اس سے صنعت تضمین المزدوج پیدا ہو گئی ہے۔

یہ سن کے بی بیوں کے جگر پر چھری چلی ‌ ‌ ‌ زینب زمیں پہ گر کے پکاری کہ یا علی
سرِ خفی جہاں کے ہیں سب آپ پر جلی (۱۳) ‌ ‌ ‌ جاتا ہو ظالموں میں یہ کونین کا ولی
بیکس کو آسرا ہو پسر کا نہ بھائی کا ‌ ‌ ‌ آقا یہی تو وقت ہو مشکل کشائی کا

صدقے گئی پسر کے بچانے میں کد کرو ‌ ‌ ‌ فرزند فاطمہ کی بلاؤں کو رد کرو
دریا کو چھین لو حقِ مہرِ زہرا سند کرو (۱۴) ‌ ‌ ‌ یا شیر حق مقام مدد ہے مدد کرو
پانی پہ جنگ آگ لگی ہے یہ دہر میں ‌ ‌ ‌ حصہ پسر کا کیا نہیں مادر کے مہر میں

یا مصطفیٰ بلا میں پھنسا ہے تمھارا لال ‌ ‌ ‌ یا شیر ذوالجلال دکھاؤ انھیں جلال
یا فاطمہ میں لٹتی ہوں بکھراؤ سر کے بال (۱۵) ‌ ‌ ‌ یا رب الٹ دے آج یہ سب عرصۂ قتال
پھر کیا کسی سے کام ہو سب سے جدا رہوں ‌ ‌ ‌ بھائی کو اپنے لے کے میں جنگل میں جا رہوں

فرمایا شہ نے صبر بہن چاہیے تمھیں ‌ ‌ ‌ خالق کی یاد سر و علن چاہیے تمھیں
لب پر رضا رضا کا سخن چاہیے تمھیں (۱۶) ‌ ‌ ‌ جو ماں کا تھا چلن وہ چلن چاہیے تمھیں
ہر بار پوچھتے تھے سبب آہ سرد کا ‌ ‌ ‌ شکوہ کیا علی سے نہ پہلو کے درد کا

ہیں مورد بلا و مصیبت ازل سے ہم ‌ ‌ ‌ اس غمکدے میں چین سے گزرا نہ ایک دم
غم ہے ہمارے واسطے ہم ہیں برائے غم (۱۷) ‌ ‌ ‌ سب اپنے اپنے عہد میں سہہ گئے ستم
اب آخری بہن یہ سواری ہماری ہے ‌ ‌ ‌ بعد ان بزرگواروں کے باری ہماری ہے

۱۴؎ اشارہ ہے اس عقیدے کی طرف کہ پیغمبر حضرت محمدؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ کا عقد خداوند عالم کی تجویز سے حضرت علی کے ساتھ ہوا اور خدا نے روئے زمین کے کل دریا، نہریں اور چشمے ان کے مہر میں دیے۔ ۱۳؎ پوشیدہ اور ظاہر۔ خفیہ اور علانیہ۔

۱۶؎ اس واقعے کی طرف اشارہ ہے کہ رسولؐ کے انتقال کے بعد ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے حضرت علی کے گھر پر چڑھائی کر دی۔ دروازہ بند تھا اس کو گرا دیا جس سے حضرت فاطمہ کے پہلو میں چوٹ آئی۔

سچ ہے کہ تم کو مجھ سے محبت ہے اے بہن
کیا کیجے ناگزیر یہ فرقت ہے اے بہن
(۱۸) پیارے تمہارے بھائی کی رخصت ہے اے بہن
دنیا مقام رنج و مصیبت ہے اے بہن
بھولے نہ یاد حق کبھی گو حال غیر ہو
اس کی ظفر ہے خاتمہ جس کا بخیر ہو

کیا کرتیں تم بہن اجل آتی وطن میں گر
یکساں ہو مرنے والوں کو جنگل ہو یا ہو گھر
(۱۹) درپیش ہے سفر ہیں ہمیں خلق سے سفر
اب آرزو یہ ہے کہ کٹے تن سے جلد سر
ہر دکھ میں خوش ہیں وہ جنھیں الفت خدا کی ہے
میرا نہیں یہ سر تو امانت خدا کی ہے

دیکھا یہ کہہ کے بالی سکینہ کو یاس سے
لپٹی وہ دوڑ کر شہ گردوں اساس سے
(۲۰) طاقت نہ تھی کلام کی ہر چند پیاس سے
بولی وہ تشنہ کام شہ حق شناس سے
کیا اس بلا کے بن سے تہیہ سفر کا ہو
صدقے گئی بتاؤ ارادہ کدھر کا ہے

فرمایا شہ نے ہاں یہ سفر ناگزیر ہے
آؤ گلے لگو کہ یہ صحبت اخیر ہے
(۲۱) اب آرزوئے قرب خدائے قدیر ہے
تنہا ہیں ہم سپاہ مخالف کثیر ہے
طے ہو یہ مرحلہ جو عنایت خدا کرے
جس کا نہ کوئی دوست ہو بی بی وہ کیا کرے

سن کر مصیبت پدر بیکس و حزیں
بولی بلائیں باپ کی لے کر وہ مہ جبیں
(۲۲) نکلو بلا کے بن سے کہیں یا امام دیں
آقا سوا حضور کے میرا کوئی نہیں
صدقے گئی مدینے چلو یا نجف چلو
للہ ساتھ لے لو مجھے جس طرف چلو

شہ نے کہا کہ بند ہیں راہیں پدر نثار
پھیلی ہوئی ہے چار طرف فوج نابکار
(۲۳) پیدل نکلنے پاتا ہے ناکوں سے نہ سوار
اس دشت کیں میں قید ہے احمد کا[1] یادگار
قاصد جو میرے نام کا خط لیکے آتے ہیں
سر کاٹ کر درختوں میں لٹکائے جاتے ہیں

---

[1] پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کا ایک نام احمد بھی ہے۔ ان کے یادگار سے امام حسینؑ مراد ہیں۔

عمو[۱] تمھارے چھوڑ گئے ہم کو جاں بلب — بی بی قدم پہ گر کے ہمیں کون روکے اب
تلواریں چل گئیں بنے قاسم پہ بے سبب (۲۴) — مرنا شباب میں علی اکبر کا ہے غضب
تھی جن سے زندگی کی حلاوت وہ چھٹ گئے — دو تین گھر بھرے ہوئے اکدم میں لٹ گئے

ہر چند صبح و شام ہے جاری یہ شاہراہ — پر کوئی قافلہ نہ ہوا ہوگا یوں تباہ
پایا تھا عمر کھو کے جنھیں ہم نے آہ آہ (۲۵) — ڈھونڈھا کہاں کہاں نہیں ملتے وہ رشک ماہ
کیا ہوگا لاکھ روئینگے یا خاک اڑائینگے — نہ عمر اب پھریگی نہ وہ دوست آئینگے

بی بی یہاں سے اہل وطن ہیں قریب تر — پر میری بیکسی کی نہیں ایک کو خبر
بھیجے ہیں دوستان یمن نے بھی نامہ بر (۲۶) — لیکن حسین تک نہ ہوا ایک کا گزر
قریوں سے بھی مدد کو جو نکلا وہ گھر گیا — لشکر بنی اسد[۲] کا قریب آکے پھر گیا

گھیرا ہے اس لیے مجھے اس بن میں بے گناہ — تا مجھ تک آسکے نہ کوئی میرا خیر خواہ
نہ دوست نہ عزیز نہ غمخوار نہ سپاہ (۲۷) — ساتھی تو سب عدم میں وطن دور گھر تباہ
مجھ سا بھی کوئی بیکس و بے پرسش نہ ہو — مر کر نہ دفن ہوں تو کسی کو خبر نہ ہو

جانا ہے دور شب کو جو آنا نہ ہو ادھر — ضد کرکے روئیو نہ ہمیں چاہتی ہو گر
پہلے پہل ہے آج شب فرقت پدر (۲۸) — سو رہیو ماں کی چھاتی پہ غربت سے رکھ کے سر
راحت کے دن گزر گئے یہ فصل اور ہے — اب یوں بسر کرو جو یتیموں کا طور ہے

ننھے سے ہاتھ جوڑ کے بولی وہ تشنہ کام — تبلائیے مجھے کہ یتیمی ہے کس کا نام
آنکھوں سے خوں بہا کے یہ کہنے لگے امام (۲۹) — کھل جائے گا یہ درد و الم تم پہ تا بہ شام
بی بی نہ پوچھو کچھ یہ مصیبت عظیم ہے — مرجائے جسکا باپ وہ بچہ یتیم ہے

---

۱ تمھارے چچا۔ یعنی حضرت عباس۔ ۲ اسد کی اولاد۔ عرب کے ایک قبیلے کا نام۔ اس قبیلے کے لوگوں نے امام حسین اور ان کے ساتھ شہید ہونے والوں کو دفن کیا تھا۔

بندے اتارو طوق بڑھاؤ پدر نثار — چھینا کہیں جو لوٹنے آئیں ستم شعار
چلّا ئیو نہ اینَ ابی کہہ کے بار بار (۳۰) دشمن ہمارے نام کا ہے شمر نابکار
لو الوداع جاتے ہیں اب قتل گاہ میں — سونپا تمھیں خدا و نبی کی پناہ میں

یہ کہہ کے پیاری بیٹی سے دیکھا اِدھر اُدھر — پوچھا کدھر ہیں بانوے ناشاد و نوحہ گر
فضہ نے عرض کی کہ ادھر پیٹتی ہیں سر (۳۱) رخصت کی بھی حضور کی ان کو نہیں خبر
لب پر گھڑی گھڑی علی اکبر کا نام ہے — چلیے ذرا کہ کام اب ان کا تمام ہے

رکھی تھی لاکے لاش پسر آپ نے جہاں — منہ اس زمیں پہ ملتی ہیں اور ہے لبوں پہ جاں
کرتی ہیں اٹھ کے آہ تو ہلتا ہے آسماں (۳۲) نعرہ یہ ہے کہ ہائے مرا شیر نوجواں
واری گئے نہ قبر میں اماں کو گاڑ کے — جنگل بسا دیا مری بستی اجاڑ کے

روتے ہوئے گئے جو وہاں شاہ خوش خصال — دیکھا کہ غش ہیں خاک پہ بکھرے ہوئے ہیں بال
شبیر بیٹھ کر یہ پکارے بصد ملال (۳۳) اے شہربانو[1] ہوش میں آؤ یہ کیا ہے حال
سچ ہے فلک نے تم کو بڑے دکھ دکھائے ہیں — صاحب اٹھو ہم آخری رخصت کو آئے ہیں

سن کر صدا حسین کی جونہی وہ نوحہ گر — کی عرض سر جھکا کے قدم پر بچشم تر
تنہا حضور آئے ہیں باندھے ہوئے کمر (۳۴) صاحب کہاں ہے منتوں والا مرا پسر
ایسے ہنسیج دکھ میں جدا ہوں وہ باپ سے — اپنے مرادوں والے کو لونگی میں آپ سے

اے جان فاطمہؑ مرا پیارا کدھر گیا — اماں کی زندگی کا سہارا کدھر گیا
وہ تین دن کی پیاس کا مارا کدھر گیا (۳۵) سیدانیوں کی آنکھوں کا تارا کدھر گیا
مرتی ہوں اپنے سرو سہی قد کو دیکھ لوں — اک بار پھر شبیہہ محمدؐ کو دیکھ لوں

---

[1] ایران کے آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد سوم کی بیٹی۔ امام حسین کی بیوی، امام زین العابدین کی ماں۔ قدیم کتابوں میں ان کا نام شہربانو بھی ملتا ہے۔ جنھوں نے ان کا نام شاہ زنان بتایا ہے۔ مرثیوں میں زیادہ تر صرف بانو لکھا جاتا ہے۔

وہ گورا گورا چاند سا مکھڑا دکھائیں پھر   لے لوں میں گیسوؤں کی بلائیں تو جائیں پھر
مجھ کو تو خیریت سے غرض ہو نہ آئیں پھر (۳۶) خوشبو میں تن کی سونگھ لوں جنگل بسائیں پھر
تڑپے گا دل تو لیکے اجازت حضور سے   میں دیکھ لوں گی در پہ کھڑی ہو کے دور سے

بے خودی میں جب آئے تھے میداں سے وہ ادھر   کیا دیکھتی مجھے تو کچھ آتا نہ تھا نظر
سنبھلا جو دل ذرا تو پھڑکنے لگا جگر (۳۷) کب آئے کب گئے مجھے مطلق نہیں نظر
آئے تو چھپ کے آئے گئے بے ملے ہوئے   باتیں نہ پیار کی ہوئیں نہ کچھ گلے ہوئے

گر ہیں خفا تو آئیں میں اٹھ کر نثار ہوں   ان کی خطا نہیں ہے میں تقصیر وار ہوں
دائی ہوں ان کی آپ کی خدمت گزار ہوں (۳۸) اب رحم کیجیے کہ بہت شرمسار ہوں
تکلیف گرچہ ہوگی شہ مشرقین کو   لے آئیے منا کے مرے نور عین کو

باتیں یہ سن کے کہنے لگے شاہ بحر و بر   یارب جدا نہ ہو کسی ماں سے جواں پسر
بانو کسے بلاؤں کہاں ہے وہ سیم بر (۳۹) ہمشکل مصطفیٰ تو گئے فاطمہ کے گھر
ہر دکھ میں صبر کرتے ہیں جو حق شناس ہیں   جس نے تمھیں دیا تھا وہ اب اس کے پاس ہیں

جاگے ہوئے تھے رات کے نیند آ گئی انھیں   ہے ہے منافقوں کی نظر کھا گئی انھیں
مخفی بہت کیا پہ اجل پا گئی انھیں (۴۰) صحرائے کربلا کی فضا بھا گئی انھیں
زندہ نہ ہوگا لال اگر مر بھی جاؤ گی   بانو کوئی گھڑی میں ہمیں بھی نہ پاؤ گی

جاتے ہیں ہم وہیں کہ جہاں ہو وہ لالہ فام   دے دو جو اپنے لال کو دینا ہو کچھ پیام
سن کر یہ ذکر ہوش میں آئی وہ تشنہ کام (۴۱) سمجھی کہ گھر تباہ ہوا اب چلے امام
خنجر سے حلق شاہ کے کٹنے کا طور ہے   بستی[1] اجڑ کے تخت الٹنے کا طور ہے

---

[1] بستی اجڑنا سے اولاد کا مرنا اور تخت الٹنا سے بیوہ ہو جانا مراد ہے۔

دامن پکڑ کے شاہ کا بولی وہ دل فگار | اے ابن فاطمہ یہ کنیز آپ کے نثار
بعد آپ کے جو لوٹنے آئیں ستم شعار | بیٹھے کہاں یہ بیکس و غمگین و سوگوار (۴۲)
کچھ حق میں اس کنیز کے فرما کے جائیے | صاحب کوئی جگہ مجھے بتلا کے جائیے

فرمایا شہ نے حافظ و حامی ہے ذوالجلال | زہرا کی بیٹیوں کی رہو تم شریک حال
زینب کو دیکھو سر پہ نہ بھائی نہ دونوں لال | صاحب تمھارے ساتھ ہو عابد سا خوش خصال (۴۳)
بے وارثوں کا وارث و والی اللہ ہو | دیکھو ڈگیں نہ پاؤں کہ مشکل یہ راہ ہو

لو الوداع لاش پہ اب آ کے رو دیجو | لیکن نہ خاک اڑا کے نہ چلا کے رو دیجو
زانو پہ سر کو شرم سے نہوڑا کے رو دیجو | قبر رسول پاک پہ ہاں جا کے رو دیجو (۴۴)
لٹنے میں صبر شکر تباہی میں چاہیئے | رونا بشر کو خوف الٰہی میں چاہیئے

یہ سن کے حشر ہو گیا فریاد و آہ سے | سیدانیاں لپٹ گئیں زہرا کے ماہ سے
گھبرا گیا نہ پھر شہ عالم پناہ سے | نکلے حسین روتے ہوئے خیمہ گاہ سے (۴۵)
چوتھا فلک ضیا سے جلو خانہ[1] بن گیا | خورشید شمع حسن کا پروانہ بن گیا

مل کر حرم سے در پہ جو شاہ غیور آئے | اک غل ہوا حضور کرامت ظہور آئے
لاؤ فرس کو ڈیوڑھی[2] پہ جلدی حضور آئے | اعمیٰ[3] بھی ہو تو آنکھ کی پتلی میں نور آئے (۴۶)
پھرتا تھا سر پہ چتر[4] سلیماں جناب کے | سایہ تھا ایک بیچ میں دو آفتاب[5] کے

---

[1] حضرت فاطمہ کا چاند۔ مراد امام حسین۔

[2] محل کے سامنے کا وسیع صحن جہاں شاہی سواری کا جلوس ترتیب دیا جاتا تھا۔ [3] اعمیٰ: اندھا۔

[4] جب بادشاہ کی سواری نکلتی تھی تو ایک خادم اس کے سر پر چتر لگائے رہتا تھا اور کبھی کبھی اسکو گردش دیتا جاتا تھا۔ [5] ایک آفتاب اصلی جو آسمان پر ہے دوسرا آفتاب امام حسین کا نورانی چہرہ۔ ان دو آفتابوں کے بیچ میں چتر کا سایہ تھا۔

نصرت کی تھی صدا کہ رہے حشمت و جلال
تاباں رہے یہ نیّر اقبال بے زوال
شوکت کی یہ دعا تھی کہ اے فاطمہ کے لال
(۴۷) سر سبز تیرے دوست عدو تیرے پائمال

یارب فساد خلق سے امن و اماں رہے
جب تک زمیں رہے یہ امام زماں رہے

بیٹھا نہ تھا کوئی نہ برابر ادھر ادھر
پر قدسیوں[1] کی صف تھی برابر ادھر ادھر
مڑ مڑ کے دیکھتے تھے جو سرور ادھر ادھر
(۴۸) گرتی تھی برق حسن چمک کر ادھر ادھر

جلوے دکھا رہی تھی ضیا ہاتھ پاؤں کی
اک چاندنی بچھی ہوئی تھی دھوپ چھاؤں[2] کی

غل تھا فلک کا رنگ بدلتا ہے دیکھ لو
ذرّوں سے آفتاب بھی جلتا[3] ہے دیکھ لو
جوبن[4] آج دن کا بھی ڈھلتا ہے دیکھ لو
(۴۹) قدموں پہ نور آنکھوں کو ملتا ہے دیکھ لو

نقش اس قدم کے چاند سے روشن نجیب ہیں
مجمر ہو آسماں تو ستارے سپند[5] ہیں

آمد فرس کی تھی دلہن آتی ہے جس طرح
تھم تھم کے نکہت چمن آتی ہے جس طرح
تصویر آہوئے ختن آتی ہے جس طرح
(۵۰) یا شمع سوئے انجمن آتی ہے جس طرح

باہم طیور کہتے تھے کبک دری ہے یہ
گھوڑے چراغ[6] پا تھے کہ بیشک پری ہے یہ

---

[1] قدسی۔ عالم بالا کی مقدس ہستیاں۔ فرشتے۔ [2] اس کے دو معنی ہیں ایک روشنی اور سایہ، دوسرے ایک ریشمی کپڑا جو دو رنگ کے تاروں سے بنا جاتا ہے۔ [3] رشک یا حسد کرتا ہے۔ [4] رونق حسن۔ شباب۔ [5] اسپند یا کالا دانہ نظر بد کا اثر دور کرنے کے لیے کسی پر سے اتار کر آگ میں ڈالا جاتا ہے اس بیت کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام حسین کے قدموں کے نشان اس قدر روشن تھے کہ تارے ان کے مقابلے میں کالا دانہ معلوم ہوتے تھے جو ان پر سے اتار کر آسمان کی انگیٹھی میں ڈال دیئے گئے تھے۔
[6] چراغ پا ہونا۔ بھڑکنا۔ کہتے ہیں کہ گھوڑے ہوائی مخلوق یعنی جن، پری وغیرہ کو دیکھ سکتے ہیں اور ان کو دیکھ کر بھڑکتے ہیں، اس مصرع کا مطلب یہ ہے کہ امام حسین کا گھوڑا اتنا خوبصورت اور ایسا خوش رفتار تھا کہ دوسرے گھوڑے اس کو پری سمجھ کر بھڑکنے لگے۔

آیا عجب شکوہ سے اسپ قمر رکاب[1] | تھامے تھی فتح زین کا دامن ظفر رکاب
چشمک زنی ہلال پہ کرتی تھی ہر رکاب | (۵۱) حلقہ تھا نور مہر کا جلوہ گر رکاب

فتراک[2] تھے کہ کھولے ہوئے تھا عقاب پر | زیں[3] پر تھا گرد پوش کہ ابر آفتاب پر

اختر خجل ہیں زین جواہر نگار سے | ذرّوں نے چن لیے ہیں ستارے غبار سے
کھنتا ہے کب سوار فراست[4] شعار سے | (۵۲) گردن میں ہاتھ باگ نے ڈالے ہیں پیار سے

نازاں ہے خود رکاب بھی پائے کو دیکھ کر | بل کر رہا ہے خاک پہ سائے کو دیکھ کر

قربان اس نگاور[5] ضیغم[6] شکار کے | پامال کر دے شیر کو ٹاپوں سے مار کے
شائستگی کو پوچھیے دل سے سوار کے | (۵۳) چاہے تو ایک طفل چڑھے باگ اتار کے

رکھوے قدم تو زنگ[7] میلا ہو پھول کا | پیارا فرس ہو راکب دوشِ رسول کا

چاروں سموں سے بدر خجل نعل سے ہلال | کھیلیں شکار شیر پہ آنکھیں ہیں وہ غزال
کہیے نہ یال حور نے بکھرا دیئے ہیں بال | (۵۴) پھرنے پہ جھوم جھوم کے صدقے پری کی چال

رستے ہیں یا دگنبد نیلی رواق کے | دلدل کی تیزیاں تو ہیں طرّاے براق کے

سینہ کشادہ تنگ کمر چست جوڑ بند | گردن میں خم ہلال کا اور اس پہ سر بلند
جاندار بردبار عدو کش ظفر پسند | (۵۵) بجلی کسی جگہ کہیں آہو کہیں پہ نمر

سرعت ہے ابر کی تو لطافت ہوا کی ہے | اتنے ہنر فرس میں یہ قدرت خدا کی ہے

---

[1] جس کی رکابیں چاند تھیں۔ یعنی چاند کی طرح چمک رہی تھیں۔ [2] زین کے دونوں طرف کے تسمے۔ شکاربند
[3] یعنی زین آفتاب کی طرح چمک رہا تھا۔ اس پر گرد پوش جو پڑا ہوا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آفتاب پر ابر آگیا ہے۔
[4] فراست۔ گھوڑوں کے بارے میں ہر طرح کی واقفیت۔ شہسواری۔
[5] تیز رفتار گھوڑا۔ [6] شیر کو شکار کرنے والا۔ [7] طرارہ۔ جست۔ چوکڑی چھلانگ۔

لو اب سوار ہوتا ہے زہرا[۱] کا یادگار ۔۔۔ تھامے رکاب کون نہ یاور نہ غمگسار
روکو فرس سے کہتے تھے شبیر نامدار ۔۔۔ (۵۶) اے ذوالجناح دیکھ یہ نیرنگ روزگار
سب دوست بہر میں ابن علی[۲] سے جدا ہوئے ۔۔۔ جو تیرے گرد رہتے تھے وہ دوست کیا ہوئے

سب دوست بے مثال تھے روؤں کسے کسے ۔۔۔ خوش رو تھے باکمال تھے روؤں کسے کسے
حیدر کے پانچ لال تھے روؤں کسے کسے ۔۔۔ (۵۷) سات آٹھ خردسال تھے روؤں کسے کسے
جب تو کہ خیر پیاس میں مرنے کے ہوئینگے ۔۔۔ سب میرے دوست میرے عوض انکو روئینگے

مرتا ہو ایک دوست کسی شخص کا اگر ۔۔۔ وہ شخص اس کے ہجر میں روتا ہے عمر بھر
اک دن میں صاف ہو گیا میرا تو گھر کا گھر ۔۔۔ (۵۸) کیا درد ہے جو مڑ کے کبھی سیدھی نہ ہو کمر
اس گھر میں جتنے گھر ہیں وہ سب بے چراغ ہیں ۔۔۔ میرے تو اک کلیجے پہ اٹھارہ[۳] داغ ہیں

پیاسے مرے ہیں ساتھ جو میرے وہ تشنہ کام ۔۔۔ گھر گھر میں ان کی نذر کے ہو دیں گے اہتمام
جاری سبیلیں[۴] رکھیں گے رستوں پہ خاص و عام ۔۔۔ (۵۹) چلائیں گے یہ پانی کے بھر بھر کے سرد جام
بھولو نہ تشنگی کو شہ تشنہ کام کی ۔۔۔ پیاسو سبیل ہو یہ شہیدوں کے نام کی

ایسے کسے ملے ہیں رفیقان باوفا ۔۔۔ پیش خدا جلیل ہے ان سب کا مرتبا
ہوتے جہاں میں آج جو پیغمبر خدا ۔۔۔ (۶۰) کرتے ہر اک شہید کا ماتم جدا جدا
شانہ بتول بالوں میں کرتی نہ عمر بھر ۔۔۔ چادر سیاہ سر سے اترتی نہ عمر بھر

یہ سن کے ذوالجناح تو روتا تھا زار زار ۔۔۔ چلاتی تھی یہ زوجۂ عباس نامدار
صاحب اٹھو ترائی سے میں آپ کے نثار ۔۔۔ (۶۱) آقا سوار ہوتے ہیں آیا ہے راہوار
یاں آکے ساتھ جاؤ امام غیور کے ۔۔۔ سایہ کرو کہ دھوپ ہے سر پر حضور کے

۱و۲ے زہرا کا یادگار اور 'ابن علی' ان دونوں فقروں سے مراد امام حسین ہیں۔

۳ے امام حسین کے بھائی، بیٹے، بھتیجے، بھانجے جو کربلا میں شہید ہوئے ان کی تعداد اٹھارہ تھی۔

۴ے سبیل۔ راہ گیروں کو پانی پلانے کا سامان۔

بانو پکارتی تھی کہ اکبر کدھر ہو تم — بیٹا پدر کے کوچ کے دن بے خبر ہو تم
تھامو رکاب باپ کے پیارے پسر ہو تم (۶۲) — اماں کا گھر اجڑتا ہے دادی کے گھر ہو تم
بازو کو تھامو ہاتھ میں حضرت کے ہاتھ دو — بیٹا ضعیفی وقت میں بابا کا ساتھ دو

لکھا ہو یاں لجام فرس پر تھا دستِ شاہ — فریاد وا حسینؑ سے ہلتی تھی قتل گاہ
خیمے سے نکلی اک زنِ بالا بلند آہ (۶۳) — رخ پر نقاب پاؤں میں موزے عبا سیاہ
حُسنِ بتولؑ شانِ علیؑ کا ظہور تھا — گویا لباس کعبہ میں خالق کا نور تھا

پردہ تھا پر جھکی ہوئی آئی وہ دل کباب — تھامی لرزتے ہاتھوں سے رہوار کی رکاب
گھوڑے پہ جلوہ گر ہوئے شاہ فلک جناب (۶۴) — بیت الشرف[1] میں بھر گئی وہ مثل آفتاب
جس کا یہ ذکر ہے وہ نواسی نبی کی تھی — زینب بہن حسین کی بیٹی علی کی تھی

رن کو سواری شۂ جن و بشر[2] چلی — پیچھے تمام فوج ملک ننگے سر چلی
گھوڑے کے ساتھ فاطمہ تھامے جگر چلی (۶۵) — شبدیز[3] کیا چلا کہ نسیمِ سحر چلی
طبقہ تمام نور سواری سے عرش تھا — سونے کی تھی زمیں تو ستاروں کا فرش تھا

ذرّوں سے آفتاب کی ضو آشکار تھی — سرسبز تھے درخت زمیں لالہ زار تھی
ماتم میں اک سماں تھا خزاں میں بہار تھی (۶۶) — جنگل تھا مشک بیز ہوا عطر بار تھی
غل تھا نہ دور دور چلو نہ بہم چلو — ہاں خادمو ادب سے قدم با قدم چلو

---

[1] بزرگی کا گھر۔ مراد امام حسین کا خیمہ۔ اجرام فلکی کی بلند ترین منزل کو بھی بیت الشرف کہتے ہیں۔ یہاں آفتاب کی مناسبت سے اس لفظ کا استعمال نہایت برمحل ہے۔

[2] جنوں اور انسانوں کا بادشاہ۔ مراد امام حسین۔

[3] سیاہ رنگ کا گھوڑا۔ اچھی نسل کا گھوڑا۔ ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کے ایک گھوڑے کا نام۔

وہ شان وہ شکوہ وہ شوکت جناب کی　　اللہ ری ضو جھپکتی ہے آنکھ آفتاب کی
تصویر ہے جناب رسالت مآب کی　　(۶۷) پیری دکھا رہی ہے لطافت شباب کی
بر میں نبی کا جامہ عنبر شمامہ ہے　　رنگت تو پھول سی ہو گلابی عمامہ ہے

غل تھا فرس پہ سید والا[۱] کو دیکھ لو　　ہاں برق[۲] و شرق طور تجلا[۳] کو دیکھ لو
پڑھ کر درود صورت مولا کو دیکھ لو　　(۶۸) بالائے رحل مصحف[۴] زہرا کو دیکھ لو
پایہ کسی بشر نے یہ پایا ہے خلق میں　　قرآں انھیں کے واسطے آیا ہے خلق میں

حوریں ہیں گرد ساغر کوثر لیے ہوئے　　قدسی جلو میں ہیں طبق زر لیے ہوئے
جبریل ہیں نجات کا دفتر لیے ہوئے　　(۶۹) جھولی میں ہے نسیم گل تر لیے ہوئے
لٹتے ہیں پھول وادی عنبر سرشت میں　　دولہا برات لے کے چلا ہے بہشت میں

وہ روے دلفروز وہ زلفوں کا پیچ و تاب　　گویا کہ نصف شب میں نمایاں ہے آفتاب
ابرو کی ذوالفقار سے زہر عدو کا آب　　(۷۰) آنکھیں وہ جن سے نرگس فردوس کو حجاب
پتلی کا رعب سب پہ عیاں ہے خدائی میں　　بیٹھا ہے شیر[۵] پنجوں کو ٹیکے ترائی میں

پہنچا جو اس شکوہ سے خیر الورا[۶] کا لال　　کانپے جبل لرزنے لگا عرصۂ قتال
ٹوٹے جو مورچے تو پکارے یہ بدخصال　　(۷۱) بھاگو کہ آئے شیر الٰہی پئے جدال
دیکھا جو رعب قبلۂ عالی مقام کو　　علموں نے جھک کے ہاتھ بڑھائے سلام کو

---

۱ بلند مرتبہ سردار۔ مراد امام حسین۔ ۲ 'برق' کے معنی تارے کا نکلنا 'شرق' کے معنی سورج کا نکلنا۔ ان لفظوں کے معنی چمکنا اور دمکنا بھی ہیں اور وہی یہاں مراد ہیں۔ ۳ روشنی والا پہاڑ، کوہ سینا، جہاں حضرت موسیٰ نے نور ایزدی کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ ۴ حضرت فاطمہ کی کتاب۔ رسول کی وفات کے بعد ان کی بیٹی حضرت فاطمہ زہرا کے پاس فرشتے جو خدائی احکام لاتے تھے ان کا مجموعہ۔ یہاں امام حسین مراد ہیں۔
۵ آبداری کی بنا پر آنکھ کا استعارہ ترائی سے اور رعب و ہیبت کی بنا پر پتلی کا استعارہ شیر سے کیا ہے۔
۶ سب سے اچھا انسان مراد حضرت محمدؐ۔

بڑھ کر صدا نہیب نے دی رو برو نگاہ ‏ دشمن ترے ذلیل معاند ترے تباہ
آواز دی ظفر نے کہ اے معدلت پناہ ‏(۷۲) تاباں رہے ستارۂ اقبال و عز و جاہ
زہرہ عدو کا آب کلیجہ لہو رہے ‏ ہر معرکے میں تیغ علی سرخرو رہے

نیزہ زمیں پہ آپ نے گاڑا جو یک بیک ‏ ماہی سے دب کے گاو زمیں نے کہا سرک
شاید قیامت آئی زمیں پر گرا فلک ‏(۷۳) بس یا حفیظ کہہ کے لرزنے لگی سمک[1]
غل تھا الٹ چکے ہیں حسین آستین کو ‏ یا بوتراب[2] آکے بچا لو زمین کو

دب دب کے مورچوں سے ادھر پہلواں ہٹے ‏ لشکر ہٹا نشان ضلالت نشاں ہٹے
سر کی زمیں مگر نہ امام زماں ہٹے ‏(۷۴) سچ ہے کہ قطب[3] دائرہ دیں کہاں ہٹے
سر بھی کٹے اگر تو نہ پیچھے قدم ہٹیں ‏ کعبہ کبھی ہٹا ہو تو شاہ امم[4] ہٹیں

لو گونجتا ہے شبر رجز خواں ہیں شاہ دیں ‏ نعرہ یہ ہے کہ ہیں ہمیں پشت و پناہ دیں
روشن ہمارے نور سے ہے شاہراہ دیں ‏(۷۵) دنیا میں ہم ہیں تاج سر عز و جاہ دیں
سجدے بتوں کو کرتے تھے ساکن کنشت کے ‏ ہم نے تمھیں بتا دیئے رستے بہشت کے

خالی کیا علی نے بتوں سے خدا کا گھر ‏ عزیٰ[5] کہاں ہیں لات و ہبل آج ہیں کدھر
غل تھا علی ہیں دوش محمدؐ پہ جلوہ گر ‏(۷۶) مصحف پہ مصحف آج ہے اور نور نور پر
سب سے علی کا مرتبہ اعلا ہے دیکھ لو ‏ شیر خدا کی شان دو بالا ہے دیکھ لو

---

[1] مچھلی۔ ایک عقیدہ ہے کہ زمین ایک گائے کے سینگوں پر قائم ہے اور وہ گائے ایک مچھلی پر کھڑی ہوئی ہے۔ یہاں وہی مچھلی مراد ہے۔ [2] بوتراب (ابوتراب) زمین یا مٹی کے مالک۔ ایک دن حضرت علی کو زمین پر لیٹا ہوا دیکھ کر رسول نے انھیں ابوتراب کہہ کر مخاطب کیا۔ اس دن سے یہ بھی آپ کا ایک خطاب ہو گیا۔

[3] وہ دھرا جس کے گرد دین کا حلقہ گھومتا ہو۔ یعنی وہ ذات جس پر دین کا دارومدار ہے۔ پہیے کا دھرا اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔ قطب ایک ستارہ بھی ہے جس کے گرد اور ستارے گردش کرتے ہیں مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا۔ [4] امتوں یعنی قوموں اور قبیلوں کا بادشاہ۔ مراد امام حسین۔ [5] عرب کے قدیم بتوں کے نام جو اسلام سے پہلے پوجے جاتے تھے۔

زنار گردنوں پہ تمہاری سوار تھی — شرک جلی یہ تھا کہ پرستش میں نار تھی
اسلام کے چمن میں کبھی یہ بہار تھی — (۷۷) حق حق کی مسجدوں میں یہ کس دن پکار تھی
چرچا تھا کفر و فسق و فجور و گناہ کا — یہ شور کب تھا اشہد ان لا الٰہ[1] کا

کعبے میں ہم نے پہلے اذاں دی بشدّ و مد — دریائے رحمت صمدی ہیں ہمارے جد
ہم پر ازل سے ہے کرم مفضل احد — (۷۸) سب ہم پہ منکشف ہے جو کچھ ہوگا تا ابد
تم لوگ جس طریق سے پھرتے ہو فرش پر — ہم یوں پلک جھپکنے میں جاتے ہیں عرش پر

گھر میں ہمارے وحی خدا لائے جبرئیل — جب آئے خادموں کی طرح آئے جبرئیل
مشہور ہم ہیں خلق میں آقائے جبرئیل — (۷۹) اس گھر کی خادمی ہے تمنائے جبرئیل
شاگردی علی سے سرافراز جب ہوئے — جبریل تب مقرب درگاہ رب ہوئے

کیوں ظالمو رسول کا پیارا نہیں ہوں میں — کیوں عرش کبریا کا ستارا نہیں ہوں میں
کیوں مستحق لطف و مدارا نہیں ہوں میں — (۸۰) کیوں ظالمو امام تمہارا نہیں ہوں میں
سیّد یہ ظلم کون سی یہ رسم و راہ ہے — کیا میہماں کو پانی کا دینا گناہ ہے

وہ نہر جس کو خلق میں جاری کرے الٰہ — روکی ہے تم نے ظلم کی تیغوں سے اس کی راہ
پانی پہ جنگ پیاسوں سے، یا یہ بغض واہ — (۸۱) یہ کس ولی کا گھر تھا جسے کر دیا تباہ
سیراب گرگ و شیر ہوں اور اسپ و خر پئیں — اولاد فاطمہ نہ پئے جانور پئیں

کھنچ کھنچ کے جائے ساری زراعت میں آب نہر — محروم ابن ساقی کوثر یہ کیا ہے قہر
اس میں یہ نہر بھی ہو جو ہو فاطمہ کا مہر — (۸۲) شہرہ ہے تازیوں[2] کی تواضع کا شہر شہر
امت نبی کی آہ یہ سفاک ہو گئی — بس آج آبروئے فلک خاک ہو گئی

---

[1] اس کے بعد الّا اللہ محذوف ہے، اس عربی جملے کے یہ معنی ہیں کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ یقیناً اللہ کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے۔ یہ جملہ اذان میں دو مرتبہ کہا جاتا ہے۔ [2] عربوں۔

کرتا ہے پاس داری مہماں ہر اک بشر ملتے ہیں اس سے جھک کے جو آتا ہے اپنے گھر
عاجز بھی لا کے سامنے رکھتا ہے ماحضر[1] (۸۳) فاقہ ہے تیسرا ہمیں اور تم ہو بے خبر
بنتانِ فاطمہ میں ہوا یہ بری چلے
پانی طلب کریں تو گلے پر چھری چلے

سن کر بیان شاہ فصیحوں نے سر جھکائے کتنوں نے پھیر پھیر کے منہ اشک بھی بہائے
اکثر صفوں میں شور یہ اٹھا کہ ہائے ہائے (۸۴) کیوں ہم رسول حق کے نواسے سے لڑنے آئے
خم ہو کے گردنیں عمر و شمر ٹل گئے
فولاد[2] موم ہو گیا پتھر پگھل گئے

نوفل[3] سے بڑھ کے یہ پسر سعد نے کہا ہاں جلد حکم دے کہ بجیں طبل جا بجا
ہو سب صفوں میں نالہ شہنا کا غل بپا (۸۵) تا فوج میں سنے نہ کوئی شاہ کی صدا
مظلومی حسین پہ دل ٹکڑے ہوتے ہیں
انساں کا ذکر کیا ہے کہ حیواں بھی روتے ہیں

ناگہ بجے جلاجل و قرنا و طبل و دف خاموش ہو گئے شہ مظلوم اس طرف
چلوں میں تیر جوڑ کے بڑھنے لگی جو صف (۸۶) اگلی ادھر نیام سے تیغ شہ نجف
بھاگو ہٹو بچو یہ صدا دی سپاہ نے
بانبی[4] سے منہ نکالا ہے مار سیاہ نے

تیغ دو سر کو روک کے حضرت نے یہ کہا بیکس سے کس طرح تمہیں منظور ہے دغا
آؤ عرب کی طرح جو ہے قصد جنگ کا (۸۷) سب مل کے گھر لڑو تو پھر اس میں ہے دیر کیا
دنیا سے وقت عصر گزرنا ہے ہر طرح
حاضر ہوں ہر طرح میں کہ مرنا ہے ہر طرح

سر کو نہ سر نہ جان کو ہم جاں سمجھتے ہیں ہاں حکم کردگار کو ایماں سمجھتے ہیں
مشکل ہزار ہو اسے آساں سمجھتے ہیں (۸۸) ہم ایک اور لاکھ کو یکساں سمجھتے ہیں
اس معرکے میں کھیت[5] پڑے ہیں اسی طرح
بچے ہمارے تم سے لڑے ہیں اسی طرح

حضرت کی صدا

---

[1] جو کچھ حاضر ہے بے تکلف کھانا۔ [2] فولاد اور پتھر سے سنگ دل اور بے رحم لوگ مراد ہیں۔
[3] یزیدی فوج کا ایک سردار۔ [4] سانپ کے رہنے کا سوراخ۔
[5] کھیت پڑنا۔ جنگ ہونا۔ کھیت سے مراد جنگ کا میدان۔

(۸۹)

لڑتا تھا مل کے ایک سے گر ایک نام دار
برسوں بھی تم سے ختم نہ ہوتی یہ کارزار
نکلا اِدھر سے ایک اُدھر سے بڑھے ہزار
اس پر بھی الاماں کا غل اٹھتا تھا بار بار
بے دیں کا ساتھ دے کے حمیت کو کھو دیا
تم نے تو آج نام عرب کا ڈبو دیا

(۹۰)

یہ ذکر تھا کہ تیر چلے اس سپاہ سے
گیتی کو زلزلہ ہوا زہرا کی آہ سے
پھر ضبط ہو سکا نہ شہ دیں[1] پناہ سے
بجلی گری صفوں پہ غضب کی نگاہ سے
چمکی علی کی تیغ جو دشتِ مصاف میں
پریاں چھپیں جزیروں میں سیمرغ قاف میں

(۹۱)

کاٹھی سے اس طرح ہوئی تیغ دوسر جدا
جیسے سواد شب سے بیاض سحر جدا
نصرت کا آئینہ تھا جدا اور گہر جدا
محمل جدا تھا لیلی فتح و ظفر جدا
تیغ کشیدہ دست شہ بحر و بر میں ہے
طومار[2] ہاتھ میں ہو لفافہ کمر میں ہے

(۹۲)

شیفی چلی کہ سیفِ شہ لافتا چلی
گویا صفوں پہ کھولے ہوئے منہ بلا چلی
بن میں سموم قہر و عتاب خدا چلی
جھونکوں سے جسکے اڑتے ہیں سر وہ ہوا چلی
آواز الاماں کی سپہر بریں پہ تھی
بڑھ کر جو یوں ہٹے کہ صف اول زمیں پہ تھی

(۹۳)

پہنچے جو مثل شیر جھپٹ کر اِدھر اُدھر
سر گر پڑے حسام سے کٹ کر اِدھر اُدھر
ایک گیا فرس جو سمٹ کر اِدھر اُدھر
ڈھالوں کا ابر رہ گیا پھٹ کر اِدھر اُدھر
جاروب تھی کہ سیف میان مصاف تھی
دریا کی راہ حملۂ اول میں صاف تھی

(۹۴)

ملتی تھی جائے امن نہ زیر فلک کہیں
غل تھا کہ دل نہ جائیں سما د سمک کہیں
جنات بے حواس کہیں تھے ملک کہیں
سایہ کہیں تھا تیغ کہیں تھی چمک کہیں
پانی سے جل بجھا تھا کوئی کوئی نار سے
گرتی تھیں تین بجلیاں[3] اک ذوالفقار سے

---

[1] وہ بادشاہ جس کی سرکار میں دین پناہ لے ۔ مراد امام حسینؑ ؛ یزیدی حکومت میں دین کو امام حسینؑ کے پاس پناہ ملی تھی ۔ [2] کاغذ کی بڑی لمبی پٹی جس پر لکھتے جاتے تھے اور لپیٹتے جاتے تھے ۔
[3] تلوار، اس کی چمک اور اس کا سایہ (دیکھو اس بند کا چوتھا مصرع)

غل شش جہت میں تھا کہ نہ اس سے دوچار ہو　　بھاگو کہیں یہ برق نہ پھر شعلہ بار ہو
کون اس کے منھ پہ جا کے اجل کا شکار ہو　　(۹۵) جو ایک ہو دو ہو جو دو ہو وہ چار ہو
بھاگیں کہ ان صفوں کو بہم آراستہ کریں　　مہلت جو تیغ دے تو دم[1] آراستہ کریں

جب سن سے فوج شام پہ وہ شعلہ خو چلی　　بس سر کے بل سقر میں سپاہ عدو چلی
ٹھہری بڑھی چمکتی ہوئی چار سو چلی　　(۹۶) آئی کس آب و تاب سے کیا سرخرو چلی
تیزی یونہیں زباں میں سخن ور کو چاہیے　　پاس آبرو کا صاحب جوہر کو چاہیے

اب دم نہ لیجیو یہ اجل اس سے کہہ گئی　　ندی لہو کی دشت پر آفت میں بہہ گئی
کاٹی زرہ کڑی[2] بھی پڑی جو وہ سہہ گئی　　(۹۷) بھاگا کوئی شقی تو لہو پی کے رہ گئی
غصے میں مثل برق قرار اس نے کم لیا　　لاکھوں میں ڈھونڈھ کر اسے مارا تو دم لیا

پھل اس کا نہ سپر پہ نہ جوشن پہ رہ گیا　　جس پر پڑی تڑپ کے وہ توسن پہ رہ گیا
دو ٹکڑے ہو کے سر نہ فقط تن پہ رہ گیا　　(۹۸) خوں بھی اجل گرفتہ کی گردن پہ رہ گیا
دم میں وہ غرور نہ وہ خودسری رہی　　مجرم وہی رہا یہ خطا سے بری رہی

یکتا برش میں جوہر ذاتی میں قدر میں　　چمکی احد[3] میں خیبر و خندق میں بدر میں
تیزی وہی تھی منھ کی اس آشوب غدر میں　　(۹۹) چل کر سپر سے سر میں گئی سر سے صدر[4] میں
کھنچتے ہوئے کمر سے نیا ڈھنگ تھا　　راکب تھا نہ فرس تھا نہ زیں تھا نہ تنگ تھا

مانند برق تیغ کا سایہ جدھر گرا　　بیٹے پہ باپ باپ پہ مر کر پسر گرا
یہ ہاتھ اس طرف تو وہ بازو ادھر گرا　　(۱۰۰) پرکالے[5] اڑ گئے رفعہ سپر کے وہ[6] سر گرا
قبضے میں اب ہے تیغ نہ مستانے ہاتھ میں　　کیوں دیدیا تھا ہاتھ کو بیگانے ہاتھ میں

---

۱ دم لیں۔ سانس ٹھیک کریں۔ ۲ 'زرہ' اور 'کڑی' میں صنعت ایہام تناسب ہے۔
۳ اس مصرع میں ان مقامات میں سے چند کا ذکر کیا گیا ہے جہاں حضرت علی نے جہاد کیا تھا اور ان کی تلوار کے جوہر کھلے تھے۔ ۴ سینہ۔ ۵ ٹکڑے۔ ۶ 'وہ' ضمیر نہیں بلکہ اسم اشارہ ہے۔

سرکش ہوا پہ جو تھے وہ سب گرد ہو گئے ❊ سرخی رخوں سے اڑ گئی منھ زرد ہو گئے
دعوائے مردمی تھا پہ نامرد ہو گئے (۱۰۱) ❊ ہنگامہ جن سے گرم تھا وہ سرد ہو گئے
مرنے پہ بھی نصیب کی سوزش نہ جائے گی ❊ ان بدیوں کو آتش دوزخ جلائے گی

عاری تھے تیغ شاہ حجازی سے نیزہ باز ❊ پیہم الٹ کے گرتے تھے تازی سے نیزہ باز
روکے تھے ہاتھ دست درازی سے نیزہ باز (۱۰۲) ❊ باز آئے اپنی شعبدہ بازی سے نیزہ باز
یوں چٹ سے کھول دیتی تھی نیزے کے بند کو ❊ آتش پہ ڈال دے کوئی جیسے سپند کو

غل تھا کہ وہ چمکتی ہوئی آئی یہ گری ❊ برچھی سے اڑ گئی وہ سناں یہ گرہ گری
ترکش کٹا کمان کیانی سے زہ گری (۱۰۳) ❊ یہ سر گرا وہ خود گرا یہ زرہ گری
آتی ہو لشکروں پہ تباہی اسی طرح ❊ گرتی ہے برق قہر الٰہی اسی طرح

وہ شام و روم کے قدر انداز بے نظیر ❊ سہواً نہ چوکتا تھا نشانے سے جن کا تیر
ہر صف میں شست سہم کے ہوتے تھے گوشہ گیر (۱۰۴) ❊ چلّاتے تھے کہ موت کے حلقے میں ہیں اسیر
لیتے قسم اگر کبھی لشکر کشی کریں ❊ سر کاٹ ڈالیے گا جواب سرکشی کریں

مشاق ساٹھ ساٹھ برس کے وہ تیز دست ❊ چلّا نہ سوجھتا تھا اُنھیں آنکھ سے نہ شست
بے سر تھے وہ بھی بادہ نخوت سے تھے جو مست (۱۰۵) ❊ غارت تھے مثل تیر ہوائی ہوا پرست
ترکش دو نیم ہو گئے زہ گیر کیا کرے ❊ چلّہ نہ ہو کماں پہ تو پھر تیر کیا کرے

---

۱ نیزہ بازی کے داؤں۔ ۲ شست، سہم کے معنی تیر بھی ہیں اور گوشہ، چلّہ اور حلقہ کمان میں ہوتا ہے۔
اس طرح ان لفظوں سے ایہام تناسب کی صنعت پیدا ہو گئی ہے۔
۳ ۱۔ وہ تیر جو بغیر نشانہ باندھے ہوئے چلایا جائے۔ ۲۔ ایک طرح کی آتش بازی جسے صرف "ہوائی" بھی کہتے ہیں۔ ۴ ۱۔ مغرور۔ ۲۔ نفس پرست۔ ۳۔ بیجا امیدیں باندھنے والا۔
۵ انگشتانہ جو تیر انداز اپنے انگوٹھے میں پہن لیتے ہیں کہ وہ کمان کے چلے سے کٹ نہ جائے۔
وہ بالعموم ہڈی کا بنا ہوا ہوتا ہے۔

وہ شہسوار دوش محمد کی ران باگ — کیا ٹھہرے دھوپ میں کہ وہ سیاہے یہ آگ
تلوار کیا فرس کو بھی تھی شامیوں سے لاگ (۱۰۶) — ایک ایک کو پکار رہا تھا کہ بھاگ بھاگ
زور اس سے چل سکے گا نہ رستم نہ گیو کا — اس پیلتن کی ٹاپ طمانچہ ہے دیو کا

پھرتا تھا کیا صفوں میں فرس جھوم جھوم کے — سرعت بلائیں لیتی تھی منھ چوم چوم کے
پامال تھے پرے پہ شام و روم کے (۱۰۷) — غل تھا یہ غول میں پسر سعد شوم کے
رخش ایسا روم و رے میں نہیں شام میں نہیں — یہ شوخیاں تو ابلق ایام میں نہیں

چار آئینے سے یوں نکل آتی تھی ذوالفقار — عینک کے پار ہوتا ہے جیسے نظر کا تار
چار آئینے تو کیا تھے کہ ہوتے بھلا دو چار (۱۰۸) — ہر دم تھا امتزاج عناصر کو انتشار
الٹے جہاں نہ بیا اگر اک گھڑی پڑے — کیا ہو زرہ سے ضرب جب ایسی کڑی پڑے

خود[1] و زرہ وہ دام سے آزاد یہ اسیر — تیر و کمان سخت وہ بے پر یہ گوشہ گیر
شمشیر جاں ستان و سنان و کمند و تیر (۱۰۹) — بے آب و سر بریدہ و ژولیدہ و حقیر
بے برگ و بار دشمن آل رسول ہیں — اب برچھیوں میں پھل ہیں نہ ڈھالوں میں پھول ہیں

اُس تیغ کے وقار سے کوہ گراں سبک — ڈھالوں کی شامیوں کی گھٹا ابر سے تنک[2]
یہ آگ اور ناریوں کے دست و پا خنک (۱۱۰) — چلنے میں بس یہی تھی ہم و دعویٰ کہ اب نہ رک
مقتل کے ہر نشیب کو لاشوں سے پاٹ دے — پر جبرئیل کے بھی پسر ہوں تو کاٹ دے

---

[1] اس بند کے ابتدائی چار مصرعوں میں تین جگہ لف و نشر مرتب کی صنعت ہے۔
(۱) خود و زرہ اور آزاد و اسیر ہیں۔ (۲) تیر و کمان اور بے پر و گوشہ گیر ہیں۔ (۳) شمشیر و سنان و کمند و تیر اور بے آب و سر بریدہ و ژولیدہ و حقیر ہیں۔

[2] باریک، نازک، کمزور۔

جب اٹھ کے تیغ صفدرِ قدسی شرف گری | گویا کہ برق سطوتِ شاہ نجف گری
آیا اُدھر خدا کا غضب جس طرف گری | (۱۱۱) کٹ کر گرا پرے پہ پرا صف پہ صف گری
سِلّیؔ چلی کہ سیفؔ صفؔ کارزار پر | گھوڑے گرے پیادوں پہ پیدل سوار پر

اللہ ری شان واہ رے حملے جناب کے | خاک اڑ گئی جدھر گئے گھوڑے کو داب کے
دکھلا دیے وغا میں چلن بوتراب کے | (۱۱۲) فتراک تھے کہ پر فرس لاجواب کے
پتلی جدھر سوار نے پھیری وہ مڑ گیا | اترا براق بن کے پری ہو کے اڑ گیا

جم کر صفوں سے یوں فرس تند خو اڑا | گویا ہمائے اوج شرف چار سو اڑا
تلوار جیسے چلی سر نحس عدو اڑا | (۱۱۳) نکلا دم اور نہ زخم سے مطلق لہو اڑا
ہر دم برش بڑھی رہی گھاٹ اسکا نام ہے | اس کو صفائی کہتے ہیں کاٹ اسکا نام ہے

باطل کو حق سے خیر کو شر سے جدا کیا | ظلمت کو دن سے شب کو سحر سے جدا کیا
یوں کفر و دیں کو تیغ دوسر سے جدا کیا | (۱۱۴) گویا کلفؔ کو روئے قمر سے جدا کیا
ٹکڑے اڑائے دم میں سپاہِ شریر کے | قربان ذوالفقار جنابِ امیرؔ کے

بخشا ہو کبریا نے اصالتؔ کو کیا وقار | تھی سرنگوں اس اوج پہ وہ تیغ آب دار
باآبرو کا جوہر ذاتی ہے انکسار | (۱۱۵) واں مدح ذوالفقار کی تھی عرش پر پکار
اس عزّ و اعتلاؔ پہ زباں بھی رکی رہی | یہ کیا فروتنی ہو کہ گردن جھکی رہی

خالص اگر ہو مشک تو بو آشکار ہے | چمکے گا آپ وہ جو دُرِ آب دار ہے
زرگر کی مدح و قدح کا کیا اعتبار ہے | (۱۱۶) کہہ دے گی خود محک کہ طلا خوش عیارؔ ہے
بدمغز کو کمال کی دولت خدا نہ دے | خالی ہو جو کہ ظرف وہ کیونکر صدا نہ دے

۶ جوہر تیغ ۔ ۷ بات بات پر ۔ ۸ کرنے میں افتخار

اۓ ان لفظوں کو سن کر صنعت اشتقاق کا دھوکا ہوتا ہے۔ ۲ۓ داغ۔ بالخصوص چاند کا داغ ۳ۓ 'امیر' سے مراد امیر المومنین 'جناب امیر' سے مراد حضرت علی ۴ۓ شرافت۔ اصیل ہونا۔ ۵ۓ بلندی ۶ۓ کسوٹی پر کسا ہوا۔ کھرا۔

اک ذوالفقار خلق میں دو ہاتھ سے چلی — دستِ حسینؑ و پنجۂ مشکل کشا علیؑ
یہ مصطفےٰ کی جان وہ اللہ کا ولی (۱۱۷) — دونوں کا مرتبہ بھی دو عالم پہ ہے جلی

فخرِ مجاہدیں پسرِ فاطمہؑ ہوا — حیدر سے ابتدا ہوئی یاں خاتمہ ہوا
ظلمت سے نور نور سے ظلمت جدا ہوئی — وحدت سے ایک ضرب میں کثرت جدا ہوئی
دیں میں سے کفر کی بدعت جدا ہوئی (۱۱۸) — ایماں کے راستے سے ضلالت جدا ہوئی

اس دبدبے سے زیر کیا روم و شام کو — حکمِ جہاد پھر نہ ہوا نو امام[1] کو
خودسر عدو تھے حباب اس کے سامنے — موجِ زرہ تھی نقش بر آب اس کے سامنے
کیا منہ تھا کہ ہو تیغ جواب اس کے سامنے (۱۱۹) — بڑھنے کی تھی سپر کو نہ تاب اس کے سامنے
اللہ کا غضب یہ جانے ہوئے تھے سب — لوہے[2] کو ذوالفقار کے مانے ہوئے تھے سب

اللہ رے تلاطمِ افواجِ روسیاہ — ٹکراتے تھے پہ ملتی نہ تھی بھاگنے کی راہ
غل تھا پناہ دے ہمیں اے آسماں پناہ (۱۲۰) — امت رسولِ پاک کی ہوتی ہے اب تباہ
بخشو خطا یہ کام ہو مولا ثواب کا — صدقہ محمدؐ عربی کی جناب کا

اُس شور میں سُنا جو رسولِ خدا کا نام — پڑھ کر درود آپ نے بس روک لی حسام
فرمایا خیر تم سے خدا لے گا انتقام (۱۲۱) — عاجز نہیں یہ بیکس و مظلوم و تشنہ کام
کیا چیز سر ہے بات پہ جو ادا مرتے ہیں — دیکھو ہم اختیار پہ یوں صبر کرتے ہیں

---

[1] امام حسینؑ بارہ اماموں میں سے تیسرے امام تھے۔ ان کے بعد جو نو امام ہوئے انھوں نے جہاد نہیں کیا۔ بارھویں امام جو اس وقت نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ وہ ظہور کے بعد جہاد کریں گے، مگر اب تک انھوں نے بھی نہیں کیا ہے۔ یہ مصرع اس عقیدے پر مبنی ہے کہ خدا کے حکم کے بغیر کوئی امام جہاد نہیں کرتا۔

[2] 'لوہا ماننا' کے معنی ہیں کسی کی فوقیت تسلیم کر لینا۔ مرعوب ہو جانا۔ تلوار کے لیے یہ محاورہ لغوی معنی میں بھی درست ہے۔

چرخ و نجوم و شمس و قمر شہر و دشت و دَرّ[1]   سنگ و معادن و صدف و قطرہ و گہر
اشجار و شاخ و برگ و گل و غنچہ و ثمر   (۱۲۲) رکن[2] و مقام[3] و باب[4] و منیٰ[5] و زمزم[6] و حجر[7]
جن و ملک ہیں انس ہیں غلمان و حور ہیں   کہدیں یہ سب[8] کہ ابن علی بے قصور ہیں

میں کیا لڑوں کہ غم سے لہو ہے مرا جگر   آنکھوں کے آگے خاک پہ ہے لاشۂ پسر
بازو[9] کے غم میں ٹوٹ گئی ہے مری کمر   (۱۲۳) سر ہو یہ مرحلہ جو کٹے تن سے جلد سر
حسرت یہ ہے کہ تیغوں سے تن پاش پاش ہو   جب ذبح ہوں تو پہلوئے اکبر میں لاش ہو

بھاگو نہ لو نیام میں رکھتا ہوں میں حسام   مشتاق قرب حق ہے یہ مظلوم و تشنہ کام
دنیا سے کچھ غرض ہے نہ اب زندگی سے کام   (۱۲۴) حاضر ہے سر فقیر کا کیا کوچ کیا مقام
بیٹھے نہیں زمیں میں خزانے کو گاڑ کے   موت آئی اٹھ کھڑے ہوئے دامن کو جھاڑ کے

پلٹے یہ سن کے بھاگے ہوئے رو سیاہ آہ   ابرِ ستم میں گھر گیا زہرا کا ماہ آہ
اک تشنہ لب پہ ٹوٹ پڑی سب سپاہ آہ   (۱۲۵) دو لاکھ حربے ایک تن زار آہ آہ
سب کچھ تھا اختیار پہ مجبور ہو گئے   شبیر سر سے تا بہ قدم چور ہو گئے

---

[1] وادی۔ درّہ۔ پہاڑ کا دامن۔ پہاڑ کی چوٹی۔ ان معنوں میں یہ لفظ تنہا نہیں آتا دشت کے ساتھ آتا ہے۔ [2] رکن یمانی۔ کعبے کے جنوبی گوشے کی دیوار کا وہ حصہ جہاں ایک پتھر نصب ہے، جس پر طواف کرتے وقت حاجی ہاتھ پھیرتے ہیں۔

[3] مقام ابراہیم حرم کعبہ کے اندر ایک جگہ جہاں وہ پتھر لگا ہوا ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم کعبے کی دیواریں بناتے تھے۔ [4] حرم کعبہ کا وہ مقدس دروازہ جو باب السلام کہلاتا ہے۔

[5] کعبے سے چند میل کے فاصلے پر ایک قریہ ہے، جہاں حاجی حج کے بعض اعمال بجالاتے ہیں۔

[6] کعبے کے قریب ایک کنواں ہے جس کا پانی بہت پاک اور متبرک سمجھا جاتا ہے اور شفا کے لیے مریضوں کو پلایا جاتا ہے۔ [7] حجر اسود۔ کالا پتھر جو کعبے کے اندر ایک دیوار میں لگا ہوا ہے اور حاجی طواف کرتے وقت اس کو چومتے ہیں۔ [8] اس بند میں اٹھتیس چیزوں کا ذکر اس ترتیب سے کیا گیا ہے کہ ایک ایک طرح کی چیزیں ایک ایک جگہ جمع ہو گئی ہیں۔ یہ حسن ترتیب کی ایک بے نظیر مثال ہے۔

[9] بازو اور قوت بازو سے بھائی مراد ہوتا ہے۔

باندھے تھے چار غول جفا کار بہر جنگ — اک صف سے تیغیں چلتی تھیں اور ایک سے خدنگ[1]
نیزوں کے وار ہوتے تھے اک صف سے بے درنگ — (۱۲۶) چلتے تھے ایک صف سے پیاپے کلوخ[2] و سنگ
زہرا تڑپ رہی تھیں علی ہاتھ ملتے تھے — یہ وار سب نبی کے کلیجے پہ چلتے تھے

وہ لوں وہ آفتاب کی تابندگی وہ بن — بھیلوں میں شیر ہانپتے تھے دشت میں ہرن
رونے کی چار سو تھی صدا بولتا تھا رن — (۱۲۷) غل تھا خدا پرستوں کے لاشے ہیں بے کفن
آندھی میں خاک اڑتی تھی گھوڑوں کی گشت سے — آواز ہائے ہائے کی آتی تھی دشت سے

بی بی پکارتی تھی کوئی ہائے میرے لال — حیدر کا باغ ہوتا ہے جنگل میں پائمال
زہرا کی دونوں بیٹیاں[3] کھولے ہوئے تھیں بال — (۱۲۸) ڈیوڑھی سے نکلے پڑتے تھے بچوں کا تھا یہ حال
جھکتے تھے زیں سے جب شہ ذیشاں زمین پر — غل تھا کہ ہائے گرتا ہو قرآں زمین پر

نجف

جس روز تھا یہ حشر یہ ماتم یہ شور و شر — آنکلا اک مسافر غربت زدہ ادھر
نکلا تھا گھر سے شوق نجف[4] میں وہ خوش سیر — (۱۲۹) چھوٹے ہوئے وطن سے گزرا تھا سال بھر
بے خانماں کو عشق خدا کے ولی کا تھا — مشتاق وہ زیارت قبر علی کا تھا

رخ زرد پاؤں سوجے ہوئے جسم پر غبار — ایمان و اعتقاد قوی پر بدن نزار
طاعت گزار نیک عقیدت وفا شعار — (۱۳۰) نہ راحلہ[5] نہ زاد[6] نہ ہمدم نہ غمگسار
یہ آرزو کہ گوہر بحر شرف ملے — چھانوں جہاں کی خاک پہ در نجف[7] ملے

---

۱ ایک درخت جس کی لکڑی سے تیر بنائے جاتے ہیں۔ مجازاً تیر۔ ۲ ڈھیلا۔
۳ حضرت زینب اور حضرت ام کلثوم۔ ۴ عراق۔ عرب کا ایک شہر جہاں حضرت علی کا مزار مبارک ہے۔ ۵ سواری کا اونٹ۔ ۶ سفر کا سامان۔ راستے کا کھانا۔
۷ سفید آب دار پتھر جو نجف کے نواح میں پایا جاتا ہے۔ اس کے نگ کی انگوٹھی پہننا برکت کا باعث سمجھا جاتا ہے۔

سر کے بل[1] قدم کیے وہ سعید خجستہ پے[2] — دو دن کی راہ کرتا تھا ایک ایک دن میں طے
پیادی نہ تھی جو قطع مسافت سے کوئی شے — (۱۳۱) آساں تھی اس کو دوری شام و عراق و رے
ان جنگلوں میں بادیہ پیما تھا دین کا — گو بن گیا تھا راہ خدا کی زمین کا

روم

دیتی تھی اس کو طاقت رفتار جب جواب — جھک جھک کے دونوں پاؤں سے کرتا تھا یہ خطاب
لازم ہے تم کو سعی[3] کہ یہ ہے وہ ثواب — (۱۳۲) احسان میرے سر پہ تمہارا چلو شتاب
کیا کیا شرف تمہاری بدولت ملے نہیں — گنج گہر ہیں زیر قدم آبلے نہیں

کرتا تھا ہر قدم پہ دعا وہ بہ اشک و آہ — پہنچا دے مجھ کو منزل مقصد پہ یا الٰہ
سمجھاتے تھے اسے جو مسافر میان راہ — (۱۳۳) اک دن مقام کر کہ ترا حال ہے تباہ
یاری نہ دیں قدم تو ٹھہرنا ضرور ہے — کہتا تھا رو کے وہ کہ نجف کتنی دور ہے

پہنچا جو کربلا میں تو دیکھا یہ اس نے حال — تنہا کھڑا ہے ایک مسافر لہو میں لال
فوجیں ستم کی گرد ہیں آمادۂ قتال — (۱۳۴) چلتے ہیں تیر کرتا ہے پانی کا جب سوال
ازبسکہ اہل درد تھا بیتاب ہو گیا — پانی کے مانگنے پہ جگر آب ہو گیا

سمت کو جو اس نے غور سے لاشوں پہ کی نظر — دیکھا کوئی ہے شمس کوئی غیرت قمر
بچہ پڑا ہے ایک ستارہ سا خاک پر — (۱۳۵) کرتا بھی ہنسلیاں بھی شلوکا بھی خوں میں تر
سرخی لہو سے حلق کے سیب ذقن[4] میں ہے — باچھوں میں سب ہے دودھ انگوٹھا دہن میں ہے

برپا ہے ایک سمت جو خیمہ فلک وقار — آتی ہے پیٹنے کی صدا اس سے بار بار
چلا رہی ہے ڈیوڑھی پہ یوں کوئی غمگسار — (۱۳۶) صدقے میں تیرے لے مرے بابا کے یادگار
کانپا کلیجہ تھم کے سنا جب دہائی کو — سمجھا کہ رو رہی ہے بہن اپنے بھائی کو

---

[1] سر کے بل چلنا سے مراد ہے منزل کے انتہائی احترام کے ساتھ طے کرنا۔ [2] مبارک قدم
[3] 'سعی' کے دو معنی ہیں کوشش اور چلنا۔ یہاں یہ دونوں معنی لیے جا سکتے ہیں۔
[4] 'ذقن'۔ ٹھوڑی۔ سرخ و سفید پر گوشت ٹھوڑی کو سیب سے تشبیہ دیتے ہیں۔

بولا وہ مل کے ہاتھ[۱] کہ یہ ماجرا ہے کیا — لائے کہاں نصیب مجھے وا مصیبتا

بیکس پہ یہ ستم یہ تعدی ہے یہ جفا (۱۳۷) یارب ہوئی ہے اس ترے بندے سے کیا خطا

نیزوں سے صدر تیغوں سے تن چور چور ہے — آئی ندائے غیب کہ یہ بے قصور ہے

کہنے لگا لرز کے وہ ذی قدر و نیک نام — اللہ کس قدر ہے پر آشوب یہ مقام

دریا خدا نے خلق کیے بہر فیض عام (۱۳۸) مرتا ہے بے اجل یہ ستم کش یہ تشنہ کام

ان سے بشر ڈرے جنھیں خوف خدا نہیں — جلدی نکل چلو یہ ٹھہرنے کی جا نہیں

دو چار گام بڑھ کے یہ سوچا وہ نام ور — مظلوم کی دعا میں ہے سب طرح کا اثر

واللہ برگزیدۂ حق ہے یہ خوش سیر (۱۳۹) کیجیے التماس دعا ہاتھ باندھ کر[۲]

تیغوں میں اس کے پاس چلو جو خدا کرے — آساں ہوں مشکلیں جو یہ بیکس دعا کرے

باتیں یہ کر کے دل سے بڑھا وہ اسیر غم — لاشوں کو دیکھ دیکھ کے روتا تھا دم بدم

ہاتف[۳] نے دی صدا کہ سمجھ کر اٹھا قدم (۱۴۰) رتبے میں یہ زمیں بھی نہیں کچھ نجف سے کم

آنکھیں ملک بچھاتے ہیں اس ارض پاک پر — یہ سب ورق ہیں مصحف ناطق[۴] کے خاک پر

آیا جو کانپتا ہوا وہ شاہ دیں کے پاس — کی عرض السلام علیک اے فلک اساس

مولا جواب دے کے یہ بولے بہ درد و یاس (۱۴۱) آنا ہوا کدھر سے ترا اے خدا شناس

عرض اس نے کی غلام شہ ذوالفقار ہوں — بیکس ہوں بے نوا ہوں غریب الدیار ہوں

طے کی ہے سال بھر میں پہاڑوں کی میں نے راہ — بچے کہیں تباہ ہیں خادم کہیں تباہ

اب تک ہو دور مجھ سے در ضیغم[۵] آہ (۱۴۲) مال و متاع لے کے چلا تھا یہ پر گناہ

غارت نہیں ہوئی ہو بضاعت غلام کی — لوٹا ہو راہ میں مجھے فوجوں نے شام کی

---

۱ ہاتھ ملنا انتہائی افسوس کی علامت ہے۔ ۲ ہاتھ جوڑ کر نہایت عاجزی سے۔

۳ عالم غیب سے آواز دینے والا، جس کی آواز سنائی دیتی ہے، مگر وہ خود دکھائی نہیں دیتا۔

۴ بولتا ہوا قرآن۔ مراد حضرت علی۔ مصحف ناطق کے ورق سے حضرت علی کی اولاد مراد ہے۔

۵ خدا کا شیر۔ حضرت علی، جن کا ایک خطاب اسد اللہ بھی ہے۔

میں دو مہینے فوج ستم میں رہا اسیر   مولا[1] علی کے نام کے دشمن ہیں یہ شریر
ہتھیار لے کے آ نہیں سکتا ہے راہ گیر   (۱۴۳) تب قید سے چھٹا ہوں کہ جب ہو گیا فقیر
سر پر یہی کلاہ یہی اک لباس ہے   پر ہوں غنی کہ دولت دیں میرے پاس ہے

دو صاحبوں کے شوق میں چھوڑا ہے اپنے گھر   حسرت یہ ہے نصیب کرے یاوری اگر
پہلے تو ہوں نجف کی زیارت سے بہرہ ور   (۱۴۴) منظور پھر وہاں سے مدینے کا ہے سفر
جاؤں گا دولتیں ہیں اگر سرنوشت میں   رستے میں موت آئی تو پہنچا بہشت میں

فرمایا آپ نے کہ مدینے میں کیا ہے کام   عرض اس نے کی وہی تو ہے دنیا میں اک مقام
اس سرزمیں پہ ہے مرا آقا مرا امام   (۱۴۵) برسوں سے جس کے عشق میں روتا ہوں صبح و شام
حیدر کے جان و دل ہیں شہ مشرقین ہیں   صدقے میں اس جگہ کے وہیں تو حسین ہیں

کیا دن سعید ہوگا میں اس روز کے نثار   جس روز ان کے گرد پھروں گا میں سات بار
چوموں گا دونوں ہاتھ بصد عز و افتخار   (۱۴۶) آنکھیں قدم پہ جھک کے ملوں گا بہ انکسار
دنیا[2] ہو اور فاطمہ کا نور عین ہو   دیکھوں انھیں صحیح و سلامت تو چین ہو

دشمن بہت امام کے ہیں اور دوست کم   امت دعا کرے نہیں مجھ کو ہے یہ غم
اب پنجتن[3] تمھیں ہیں تو انھیں کا ہے ایک دم   (۱۴۷) عزلت گزیں ہے قبر نبی پر وہ ذی حشم
زندہ ہیں گر حسین تو زندہ ہیں چار[4] دم   یارب اس ایک دم کو عطا کر ہزار دم

---

[1] 'مولا' (مولی) کے معنی ہیں آقا۔ مالک پیشوایان دین کو اکثر اس لفظ سے خطاب کرتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ لفظ خطاب کے لیے نہیں آیا ہے۔ بلکہ 'علی' کی صفت واقع ہوا ہے۔

[2] اس مصرع کا مطلب یہ ہو کہ امام حسین کی ذات کے سوا مجھے دنیا کی کوئی چیز مطلوب نہیں۔ انتہائی عقیدت اور محبت کا اظہار ہے۔

[3] پانچ بزرگ یعنی حضرت محمدؐ، علیؑ و فاطمہ و حسنؑ حسینؑ۔

[4] یعنی حضرات محمد و علی و فاطمہ و حسن، جن کا اس وقت انتقال ہو چکا تھا۔

اک میرا شاہزادہ ہے ہم شکل مصطفیٰ — شہرہ ہے جس کی شکل و شمائل کا جابجا
ماں کا مرادوں والا پسر ہے وہ مہ لقا (۱۴۸) — سائے میں شہ کے اس کو سلامت رکھے خدا
اس نخل گل سے دور خزاں کی بلا رہے — یارب چمن حسین کا پھولا پھلا رہے

یہ سن کے آپ آئے مسافر کے متصل — پھیلا کے دونوں ہاتھ کہا آ گلے تو مل
ہاں بھائی سچ ہے صدمۂ غربت ہے جاں گسل (۱۴۹) — اس دم بہل گیا ترے آنے سے میرا دل
طاقت کلام کی نہیں پاتا یہ ضعف ہے — چہرا ترا نظر نہیں آتا یہ ضعف ہے

ہاں مدتوں سے ہے یہی نیرنگ روزگار — ہر گل پہ ایک دن ہے خزاں ایک دن بہار
ہم دردہم[1] بھی ہیں ترے اے یار غمگسار (۱۵۰) — تیری طرح لٹے ہیں یہیں چھوڑ کر دیار
شکر خدا مسافر راہ ثواب ہیں — اب پیر کوچ میں نہیں پا در رکاب ہیں

کس سے کہیں کہ ہم پہ جو صدمہ گزر گیا — خالی ہوا عزیزوں سے گھر دشت بھر گیا
دنیا سے دو پہر میں مرا گھر کا گھر گیا (۱۵۱) — بیٹا جوان قتل ہوا بھائی مر گیا
بنتی نہیں جب آتی ہے قسمت بگاڑ پر — ٹکڑے ہو گر پڑے یہ مصیبت پہاڑ پر

میرا ہے اب یہ حال کہ زخموں سے چور ہوں — جنگل میں موت آتی ہے بستی سے دور ہوں
اک خاکسار بندۂ رب غفور ہوں (۱۵۲) — عالم ہے اس کی ذات کہ میں بے قصور ہوں
کہنے میں بات آتی ہے یہ کچھ گلا نہیں — دن تیسرا ہے آج کہ پانی ملا نہیں

مولا سے ہاتھ جوڑ کے بولا وہ دل کباب — لے آؤں دوڑ کر مرے شربے[2] میں ہے کچھ آب
کیجے زبان خشک کو تر بہر بوتراب (۱۵۳) — بولے ہلا کے سر کو شہ آسماں جناب
اب انتظار موت کا ہے کیا جیوں گا میں — سب پیاسے مر گئے ہیں یہ پانی پیوں گا میں

۱؎ ایک طرح کا درد رکھنے والے۔ چوتھا اور پانچواں مصرع اس لفظ کی شرح کرتا ہے۔

۲؎ شربہ۔ صراحی۔

درکار جو تجھے ہو وہ لے بہر کردگار   پیدل اگر ہے تو تو یہ حاضر ہے راہوار
ناقہ بھی لے ترا تو ہے آقا وہ نامدار(۱۵۴)   سائل[1] کو جس نے روٹی کے اونٹوں کی دی قطار

حاضر ہی جان و مال کرے ہے میہمان تو   بھائی ہمارے گھر کو گھر اپنا جان تو

اسباب بھی ہو مال بھی ہو سیم و زر بھی ہے   موجود راحلہ بھی ہے زاد سفر بھی ہے
مغفر بھی ہو زرہ بھی ہو تیغ و سپر بھی ہے   (۱۵۵) گر تیرے کام آئے تو حاضر یہ سر بھی ہے
بیکس ہوں گو کہ آج یہ عالی مقام ہوں   شرما نہ تو کہ میں بھی علی کا غلام ہوں

آقا جو ہے ترا وہی آقا مرا بھی ہے   تیرا طبیب جو وہ مسیحا مرا بھی ہے
جو ہے ولی حق وہی مولا مرا بھی ہے   (۱۵۶) بھائی[2] علی کے حصے میں حصہ مرا بھی ہے
ہاں اہل غیر کف[3] میں تصرف نہ چاہیے   آپس میں دوستوں کو تکلف نہ چاہیے

دیکھی جو یہ عنایت سلطان بحر و بر   رونے لگا وہ مرد مسافر جھکا کے سر
دل سے کہا خدا کا ولی ہے یہ خوش سیر (۱۵۷)   اس حال میں غریب نوازی ہے کس قدر
دیکھی نہ باپ میں یہ محبت نہ بھائی میں   ابتک ہیں اس طرح کے بھی بندے خدائی میں

---

[1] روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی سفر میں تھے کہ ایک سائل نے آپ سے روٹی مانگی۔ آپ نے اپنے غلام قنبر سے کہا کہ اس کو روٹی دے دو۔ قنبر نے عرض کیا روٹی دسترخوان میں ہے۔ حکم دیا مع دسترخوان دے دو۔ قنبر نے عرض کیا دسترخوان اونٹ پر ہے۔ فرمایا اونٹ سمیت دے دو قنبر نے پھر عرض کیا اونٹ قطار میں ہے، فرمایا مع قطار دے دو۔ قنبر نے ساری قطار سائل کے حوالے کر دی۔ ان دو مصرعوں میں اسی روایت کی طرف اشارہ ہے۔

[2] اس جملے میں یہ اشارہ ہے کہ میں حضرت علی کا بیٹا وارث اور جانشین ہوں۔

[3] جو اپنی برادری، خاندان و قوم، قبیلے یا طبقے کا نہ ہو۔ عربی لفظ "کفو" اردو میں "کف" ہو گیا۔

عرض اس نے کی حضور سے بس ہے یہ التجا ۔ کیجے اٹھا کے ہاتھ مرے حق میں یہ دعا
پہنچا دے مجھ کو قبر علی پہ مرا خدا[۱۵۸] ۔ مولا نے آسماں کی طرف دیکھ کر کہا
جسکو نہیں زوال وہ دولت نصیب ہو ۔ یارب اسے علی کی زیارت نصیب ہو

تسلیم اس نے کی تو یہ بولے شہ انام ۔ قبر علی پہ جا کے یہ کہنا مرا پیام
آتے ہیں آپ درد و مصیبت میں سب کے کام ۔ میں بیکس و غریب بھی ہوں آپ کا غلام[۱۵۹]
تنہا ہوں دشمنوں میں خبر آکے لیجیے ۔ ہنگام ذبح گود میں سر آکے لیجیے

سن کر بیان شاہ رہی ضبط کی نہ تاب ۔ آنسو بہا کے سر کو جھکایا بصد حجاب
دل سے کہا کہ ہے لب بام اب یہ آفتاب ۔ بیکس کے کام آؤ کہ اس میں بھی ہے ثواب[۱۶۰]
احساں کا یہ عوض ہو کہ احسان کیجیے ۔ اب سر علی کے نام پہ قربان کیجیے

حضرت سے عرض کی کہ نہ جائے گا اب غلام ۔ بس جی چکے بہت یہی مرنے کا ہے مقام
اب دیجیے رضا کہ بڑھوں کھینچ کر حسام ۔ وہ کام چاہیے کہ رہے تا بہ حشر نام[۱۶۱]
دیندار ہوں نہ ترک رفاقت کرونگا میں ۔ اب کے تیسر حق کی زیارت کرونگا میں

زوار[۳] جن کا ہوں میں انھیں کی مجھے قسم ۔ سر بھی کٹے گا اب تو نہ چھوڑوں گا یہ قدم
جلوے دکھا رہا ہے مجھے گلشن ارم ۔ حوریں پکارتی ہیں کہ آ منتظر ہیں ہم[۱۶۲]
پردے اٹھے ہوئے ہیں نظر دور جاتی ہے ۔ گردوں سے مرحبا کی صدا مجھ کو آتی ہے

---

۱ وہ مسافر حضرت علی کے روضۂ اقدس کی زیارت کرنا چاہتا تھا، مگر امام حسینؑ نے خود حضرت علی کی زیارت کی دعا دی اور یہ دعا مقبول ہوئی (دیکھو بند ۱۷۷)

۲ عقیدہ ہے کہ جب کوئی مومن مرتا ہے تو حضرت علی اس کی قبر میں تشریف لاتے ہیں۔

۳ زائر کی جمع ہے۔ مگر واحد کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ کسی مقدس مقام کی زیارت کرنے والا یا زیارت کی غرض سے سفر کرنے والا۔

گھبرا کے بولے شاہ کہ ہاں ہاں[1] قسم نہ کھا — رستہ ہے یاں سے رات بسے کا نجف کو جا
بچنا مرا محال ہے گر جان دی تو کیا (۱۶۳) — اے بھائی تو ہے صاحب دختر نہ لے رضا
دامن کو آنسوؤں سے بھگوتی ہو رات دن — بیٹی تری ترے لیے روتی ہو رات دن

رخصت کے وقت وہ جو بلکتی تھی دم بہ دم — وعدہ کیا تھا تو نے کہ آئیں گے جلد ہم
مرتی ہے انتظار میں وہ صاحب الم (۱۶۴) — اُدھر وہ اس الم میں ہوں میں بھی اسیر غم
ہجراں کشیدہ رنج و بلا و محن میں ہے — بیمار ایک میری بھی بیٹی وطن میں ہے

بیٹی کا ذکر سن کے یہ بولا وہ خوش خصال — فرمائیے جناب سے کس نے کہا یہ حال
آگاہ اس سے کوئی نہیں غیر ذوالجلال (۱۶۵) — شاید ہے علم غیب میں بھی آپ کو کمال
ہر شے کا علم آپ کو اس بیکسی میں ہے — یہ تو صفت امام میں یا نبی میں ہے

بتلائیے برائے خدا مجھ کو اپنا نام — فرمایا بے نوا و وطن آوارہ تشنہ کام
بیکس عزیز مردہ اسیر سپاہ شام (۱۶۶) — عاجز بلا رسیدہ ستم دیدہ مستہام
درد و غم و الم مرے حصے میں آئے ہیں — یہ سب خطاب میں نے یہاں آ کے پائے ہیں

قدموں پہ لوٹ کر یہ پکارا وہ دردناک — اظہار اسم اقدس و اعلیٰ میں کیا ہے باک
بتلائیے کہ غم سے مرا دل ہو چاک چاک (۱۶۷) — چپ ہو گئے تڑپنے پہ اس کے امام پاک
فرما سکے نہ یہ کہ شہ مشرقین ہوں — مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

سر اپنا پیٹ کر وہ پکارا بہ شور و شین — ہے ہے یہ کیا زباں سے کہا کون سا حسینؑ
آئی ندا فلک سے کہ زہرا کا نور عین (۱۶۸) — بیٹا علی کا سبط شہنشاہ مشرقین[3]
گھر فاطمہ کا لٹ گیا سب اس لڑائی میں — بس اک یہی حسینؑ ہے ساری خدائی میں

---

[1] کسی کو کسی کام سے فوراً روکنے کے لیے یہ کلمہ استعمال ہوتا ہے۔

[2] ذرا سا۔

[3] مشرق اور مغرب کا یعنی ساری دنیا کا بادشاہ۔ مراد حضرت محمدؐ

کھینچی ہو تو نے جس کے لیے زحمتِ سفر — اے بے خبر نہیں ہے وہ سلطانِ بحر و بر
ویراں ہے شہرِ نجف اے مردِ خوش سیر (۱۶۹) ضرب سے ہیں نبیؐ و علیؑ ہیں برہنہ سر
زینب ہے یہ جو ڈیوڑھی پہ جاں اپنی کھوتی ہے — زہرا تو ساتویں سے اسی بن میں روتی ہے
اس بے وطن نے جب کہ مفصل سنا یہ حال — غش کھا کے پائے شہ پہ گرا وہ نکو خصال
اٹھا تڑپ کے جب تو پکارا بصد ملال (۱۷۰) یہ کیا قیامت آ گئی اے فاطمہ کے لال
کیا تھی خبر کہ آپ اس آفت کے بن میں ہیں — میں تو یہ جانتا تھا کہ شہ وطن میں ہیں
مدت سے تھی مجھے تو زیارت کی آرزو — خوبی مرے نصیب کی یا شاہ نیک خو
اب دیکھیے رضا کہ جگر غم سے ہے لہو (۱۷۱) مر جاؤں لڑ کے فوج سے حضرت کے روبرو
للہ چشمِ پاک کو پُرنم نہ کیجیے — آپ اس غلام زادی کا کچھ غم نہ کیجیے
شہزادیاں غلام کی ہوتی ہیں بے پدر — کچھ غم نہیں یتیم وہ لونڈی ہوئی اگر
میں کیا مکان کیا مرا یا شاہِ بحر و بر (۱۷۲) جب بے سبب جہاں میں لٹے فاطمہ کا گھر
گیتی ہو آج درہم و برہم تو خوب ہے — الٹے تمام دفترِ عالم تو خوب ہے
روکا بہت مگر نہیں رکتا تھا وہ دلیر — تلوار لے کے فوج پہ جھپٹا مثالِ شیر
شیرِ[1] جاں کے شوق میں تھا زندگی سے سیر (۱۷۳) ایسا لڑا کہ رن میں ہوئے زخمیوں کے ڈھیر
دم بھر رہا تھا عشقِ شہِ مشرقین کے — نعرہ تھا دم بدم کہ تصدق حسینؑ کے
لگتا تھا زخم جب تو وہ کہتا تھا یا علیؑ — بدرُ[2] الدجےٰ حسینؑ ہیں شمسُ[3] الضحےٰ علیؑ
مرشد علیؑ امام علیؑ رہنما علیؑ (۱۷۴) کشتی علیؑ جہاز علیؑ ناخدا علیؑ
عازم ہوں سیرِ گلشنِ دارالسلام کا — دریائے غم سے پار ہو بیڑا غلام کا

---

[1] 'شیر' اور 'سیر' میں تجنیس محرّف ہے۔
[2] اندھیرے کا چاند۔
[3] دوپہر کا آفتاب۔

اُس بے وطن پہ ٹوٹ پڑی سب سپاہِ شام — ریتی پہ ٹکڑے ہو کے گرا وہ فلک مقام
زخمی تھے خود یہ اس کے سرہانے گئے امام (۱۷۵) — گودی میں لے کے زانو پہ رکھا سرِ غلام
رو کر پکارتے تھے یہ اس خوش نصیب کو — اے بھائی جان چھوڑ چلے اس غریب کو

اے میری بیکسی کے مددگار الوداع — اے تشنہ لب حسینؑ کے غمخوار الوداع
اے بے وطن کے یار وفادار الوداع (۱۷۶) — اے شیرِ ذوالجلال کے زوّار الوداع
جو خوش نصیب ہیں وہی جنت میں جاتے ہیں — گھبرائیو نہ ہم بھی ترے بعد آتے ہیں

فرما کے یہ حسین تو روتے تھے زار زار — ہنستا تھا دونوں آنکھوں کو کھولے وہ ذی وقار
پوچھا سبب خوشی کا تو بولا وہ دل فگار (۱۷۷) — اے نورِ چشمِ احمدِ مرسل ترے نثار
جلوہ خدا کے نور کا ہے میرے سامنے — مشتاق جن کا تھا انھیں دیکھا غلام نے

بالائے سر کھڑے ہیں رسولِ فلک مقام — فرزند کہہ کے لیتے ہیں شفقت سے میرا نام
دستِ علی میں چشمۂ کوثر کے دو ہیں جام (۱۷۸) — فرماتے ہیں کہ پی اسے گر تو ہے تشنہ کام
ناجی ہو دوست دار مرے نورِ عین کا — حصہ ترا یہ ہے تو یہ حصہ حسینؑ کا

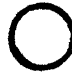
حقا کہ تھا ظفر کا وسیلہ سفر ترا — نام نکو قلم[۱] نے لکھا عرش پر ترا
اب جنت النعیم[۲] میں ہوگا گزر ترا (۱۷۹) — ہمسایۂ رسولِ خدا میں ہے گھر ترا
حوریں ہیں باغِ خلد میں مرنے کے واسطے — آیا ہوں خود میں تیری زیارت کے واسطے

رونے لگا یہ شاہ سے کہہ کر وہ تشنہ لب — فرمایا آپ نے کہ یہ رونے کا کیا سبب
کی عرض اس نے اے خلفِ سید العرب[۳] (۱۸۰) — تنہائی کا حضور کی صدمہ ہو دل پہ اب
رخصت جو تن سے روح کی ہو بیقرار ہوں — مہلت جو دے اجل تو پھر اٹھ کر نثار ہوں

---

۱ عقیدہ ہے کہ عرش پر ایک لوح یعنی تختی ہے اور ایک قلم ہے جو اس لوح پر خدائی احکام اور شدنی واقعات لکھتا رہتا ہے۔ یہاں قلم سے وہی قلم قدرت مراد ہے۔ ۲ آٹھ بہشتوں میں سے ایک کا نام
۳ عرب کا سردار۔ مراد حضرت محمدؐ۔

مجھ کو ہے غم حضور کا حضرت کو غم مرا
اب کوچ جلد ہے سوئے ملک عدم مرا
منھ ڈھانپ دیجئے شہ عالی ہمم مرا
(۱۸۱) پڑھئیے کوئی دعا کہ نکلتا ہے دم مرا
کیا وقت بیکسی ہو ہمارے حضور پر
کس سے کہوں کہ لاش کو لائے حضور پر
یہ کہتے کہتے آہ وہ زوّار مر گیا
بیکس کا بے وطن کا مددگار مر گیا
شیدائے نام حیدرِ کرار مر گیا
(۱۸۲) شبیر روتے رہ گئے غم خوار مر گیا
لاشے سے اٹھ کے جا نہ سکے خیمہ گاہ میں
پھر گھر گئے حسینؑ عدو کی سپاہ میں
اب کیا کہوں انیسؔ کہ سیّد پہ کیا ہوا
تڑپے حسین شور قیامت بپا ہوا
برباد خاندان رسول خدا ہوا
(۱۸۳) سجدے میں تن سے فرق مبارک جدا ہوا
پُرخوں قبائے سیّد لولاک لٹ گئی
عریاں حسینؑ رہ گئے پوشاک لٹ گئی



ویراں ہے کوئی گھر کہیں آبادی ہے
راحت سے کوئی اور کوئی فریادی ہے
اک عشرت و غم کا ہے مرقع دنیا
ماتم ہے کسی جا تو کہیں شادی ہے

لالے سے عیاں بہار سرجوشی ہے
نرگس کو جو دیکھئے تو خاموشی ہے
کیسی یہ گومگو ہے اے ربّ کلیم
بلبل نالاں ہے گل کو خاموشی ہے

کس بات میں مکر کس میں تزویر نہیں
جز حرف غلط زباں پہ تقریر نہیں
اس عہد میں راستی کا کیونکر ہو رواج
مسطر کج ہے قلم کی تقصیر نہیں

۱؎ دم نکلنے میں انسان کو بے حد تکلیف ہوتی ہے بعض دعائیں پڑھنے سے یہ تکلیف کم ہو جاتی ہے۔
۲؎ صدقہ کرے۔ نثار کرے۔

مرثیہ[1] (۶)

(۱)
نمک[2] خوانِ تکلم ہے فصاحت میری
ناطقے بند ہیں سُن سُن کے بلاغت میری
رنگ اڑتے ہیں وہ رنگیں ہے عبارت میری
شورجس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری
عمر گزری[3] ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں[4] پشت ہے شبیرؑ کی مداحی میں

(۲)
ایک قطرے کو جو دوں بسط تو قلزم کردوں
بحرِ مواج فصاحت کا تلاطم کر دوں
ماہ کو مہر کروں ذرّوں کو انجم کردوں
گنگ کو ماہر اندازِ تکلم کر دوں
دردِ سر ہوتا ہے بے رنگ نہ فریاد کریں
بلبلیں مجھ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

(۳)
اس ثناخواں کے بزرگوں میں ہیں کیا کیا مدّاح
جدِ اعلیٰ[4] سے نہ ہوگا کوئی اعلا مدّاح
باپ مدّاح کا مدّاح ہے دادا مدّاح
عم[5] ذی قدر ثناخوانوں میں یکتا مدّاح
جو عنایاتِ الٰہی سے ہوا نیک ہوا
نام بڑھتا گیا جب ایک کے بعد ایک ہوا

---

[1] یہ مرثیہ میر انیس نے اپنے صاحبزادے میر عسکری رئیس کو کہہ دیا تھا۔ مگر اس پائے کا مرثیہ رئیس کے منھ پر کیا پھبتا۔ آخر حقیقت کھل گئی اور میر انیس نے چہرے کے بندوں کو اپنے حسبِ حال بنانے کے لیے تیسرے بند کے چوتھے مصرعے اور آٹھویں بند کے پہلے مصرعے میں ضروری ترمیم کر دی، مگر پہلے بند کی بیت جو ہر شخص کی زبان پر چڑھ گئی تھی، اصل حالت میں رہنے دی۔ حالانکہ اس کے دوسرے مصرعے میں بھی ترمیم ضروری تھی، کیونکہ انیس تک پانچ نہیں، چار پشتیں گزری تھیں۔

[2] گفتگو کے دسترخوان کا نمک یعنی جس سے کلام میں مزہ پیدا ہوتا ہے۔

[3] یہ مصرع رئیس کی زبان سے ہے۔ پانچوں پشتیں یہ ہیں۔ رئیس، انیس، خلیق، حسن۔ ضاحک۔

[4] پردادا یا اس سے پہلے کی پشت کا کوئی بزرگ۔ یہاں میر حسن یا میر ضاحک مراد ہیں۔

[5] رئیس کے دونوں چچا میر مونس اور میر انس بلند پایہ مرثیہ گو اور مرثیہ خوان تھے۔

طبع ہر ایک کی موزوں قد زیبا موزوں — صورت سرو ازل سے ہیں سراپا موزوں
نثر بے سجع[1] نہیں نظم معلا موزوں (۴) — کہیں سکتہ نہیں آ سکتا کجا ناموزوں
تول لے عقل کی میزان میں گر فہمیدہ ہو — بات جو منہ سے نکلتی ہو وہ سنجیدہ ہو

خلق میں مثل خلیق اور تھا خوش گو کوئی کب — نام لے دھو کے زباں کوثر و تسنیم سے جب
بلبل گلشن زہرا و علی عاشق رب (۵) — منتہج مرثیہ گوئی میں ہوئے جن کے سبب
ہو اگر طبع میں جودت ہو کہ موزونی ہو — اس احاطے سے جو باہر ہو وہ بیرونی ہو

بھائی خوش فکرت و خوش لہجہ و پاکیزہ خصال — جن کا سینہ گہر علم سے ہے مالا مال
یہ فصاحت یہ بلاغت یہ سلاست یہ کمال (۶) — معجزہ[2] گر نہ اسے کہئے تو ہے سحر حلال[3]
اپنے موقع پہ جسے دیکھیے لاثانی ہے — لطف حضرت[4] کا ہو یہ رحمت یزدانی ہو

کیوں نہ ہو بندہ موروثی مولا ہوں میں — قلزم رحمت معبود کا قطرا ہوں میں
جس میں لاکھوں در دم جاں ہیں وہ دریا ہوں میں (۷) — مدح خوان پسر حضرت زہرا ہوں میں
وصف جوہر[5] کا کروں صفت ذات کروں — اپنے رتبے پہ نہ کیوں آپ مباہات کروں

مبتدی ہوں مجھے توقیر عطا کر یارب — شوق مداحی شبیر عطا کر یارب
سنگ ہو موم وہ تقریر عطا کر یارب (۸) — نظم میں رونے کی تاثیر عطا کر یارب
جد و آبا کے سوا غیر کی تقلید نہ ہو — لفظ مغلق[6] نہ ہوں گنجلک نہ ہو تعقید[7] نہ ہو

---

[1] نثر میں ایسے دو فقروں یا جملوں کا آنا جن کے آخری لفظ ہم قافیہ ہیں۔

[2] ایسا کام جو مادی وسیلوں کے بغیر صرف روحانی طاقت سے کیا جائے اور جس میں دوسرے لوگ عاجز ہوں مذہبی اصطلاح میں معجزہ پیغمبروں کے لیے مخصوص ہے اگر کوئی اور بزرگ ایسا ہی کام کرے تو اس کو کرامت کہتے ہیں، جس کی جمع کرامات اردو میں واحد کی حیثیت سے مستعمل ہے۔ [3] جائز جادو۔ اسلام کی رو سے جادو ناجائز ہے۔ لیکن اچھی تقریر بھی جادو کا اثر رکھتی ہے۔ اس لیے اس کو سحر حلال کہا ہے۔ [4] امام حسین۔ [5] ہنر و کمال۔ [6] جس کا سمجھنا مشکل ہو۔ [7] جملے میں لفظوں کی ترتیب میں خلل پڑنے سے یا سلسلۂ عبارت میں کسی کڑی کے چھوٹ جانے سے صحیح مطلب سمجھنا مشکل ہو جائے تو ان دونوں صورتوں کو تعقید کہتے ہیں پہلی کو تعقید لفظی اور دوسری کو تعقید معنوی۔

وہ مرقع ہو کہ دیکھیں اسے گر اہل شعور
ہر ورق میں کہیں سایہ نظر آئے کہیں نور
(۹)
عقل ہو یہ ہے کشش موقلم طرۂ حور
صاف ہر رنگ سے ہو قدرت صانع کا ظہور
کوئی ناظر جو یہ نایاب نظیریں[1] سمجھے
نقش ارژنگ[2] کو گاؤ اک لکیریں[3] سمجھے

قلم فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ
شمع تصویر[4] پہ گرنے لگیں آآ کے پتنگ
(۱۰)
صاف حیرت زدہ مانی ہو تو بہزاد ہو دنگ
خوں برستا نظر آئے جو دکھاؤں صف جنگ
رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی
بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

روزمرہ شرفا کا ہو سلاست ہو وہی
لب و لہجہ وہی سارا ہو متانت ہو وہی
(۱۱)
سامعیں جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی
یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہی
لفظ بھی چست ہوں مضمون بھی عالی ہوئے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہوئے

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لیے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے
(۱۲)
سرمہ زیبا ہے فقط نرگس جادو کے لیے
زیب ہے خال سیہ چہرۂ گل رو کے لیے
داند آں کس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

بزم کا رنگ جدا رزم کا میداں ہو جدا
یہ چمن اور ہیں زخموں کا گلستاں ہے جدا
(۱۳)
فہم کامل ہو تو ہر نامے کا عنواں ہو جدا
مختصر پڑھ کے رلا دینے کا ساماں ہے جدا
دبدبہ بھی ہو مصائب بھی ہوں توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں رقت بھی ہو تعریف بھی ہو

---

[1] مثالیں، نمونے (کمال مصوری کے)

[2] عام طور پر مشہور ہے کہ مانی چین کا ایک باکمال مصور تھا اور ارژنگ اس کی بنائی ہوئی تصویروں کا بے نظیر مرقع۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ایران کا باشندہ تھا اور خود کو پیغمبر اور اپنی کتاب ارژنگ کو آسمانی صحیفہ کہتا تھا۔

[3] بے ڈول۔ بدتناسب۔ بے ڈھنگی

[4] یعنی تصویر میں شمع ایسی بنے کہ پروانے اس کو اصل شمع سمجھ کر اس پر گرنے لگیں۔

ماجرا صبح شہادت کا بیاں کرتا ہوں ۔۔۔ رنج و اندوہ و مصیبت کا بیاں کرتا ہوں
تشنہ کاموں کی عبادت کا بیاں کرتا ہوں ۔۔۔ (۱۴) جاں نثاروں کی اطاعت کا بیاں کرتا ہوں
جن کا ہمتا نہیں ایک ایک مصلّٰی ایسا ۔۔۔ ایسے بندے نہ کبھی ہونگے نہ صاحب ایسا

صبح صادق کا ہوا چرخ پہ جس وقت ظہور ۔۔۔ زمزمے کرنے لگے یادِ الٰہی میں طیور
مثلِ خورشید برآمد ہوئے خیمے سے حضور ۔۔۔ (۱۵) یک بیک پھیل گیا چار طرف دشت میں نور
شش جہت میں رخِ مولا سے ظہورِ حق تھا ۔۔۔ صبح کا ذکر ہو کیا چاند کا چہرہ فق تھا

ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں وہ بیاباں وہ سحر ۔۔۔ دم بدم جھومتے تھے وجد کے عالم میں شجر
اوس نے فرشِ زمرد پہ بچھائے تھے گہر ۔۔۔ (۱۶) لوٹی جاتی تھی لہکتے ہوئے سبزے پہ نظر
دشت سے جھوم کے جب بادِ صبا آتی تھی ۔۔۔ صاف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آتی تھی

بلبلوں کی وہ صدائیں وہ گلوں کی خوشبو ۔۔۔ دل کو الجھاتے تھے سنبل کے وہ پُرخم گیسو
قمریاں کہتی تھیں شمشاد پہ یا ہو یا ہو ۔۔۔ (۱۷) فاختہ کی یہ صدا سرو پہ تھی کو کو کو
وقت تسبیح کا تھا عشق کا دم بھرتے تھے ۔۔۔ اپنے معبود کی سب حمد و ثنا کرتے تھے

آئے سجادۂ[۱] طاعت پہ امامِ دو جہاں ۔۔۔ اس طرف طبل بجا یاں ہوئی لشکر میں اذاں
وہ مصلّی[۲] کہ زباں جن کی حدیث و قرآں ۔۔۔ (۱۸) وہ نمازی کہ جو ایماں کے تنِ پاک کی جاں
زاہد ایسے تھے کہ ممتاز تھے ابراروں میں ۔۔۔ عابد ایسے تھے کہ سجدے کیے تلواروں میں

عرشِ اعظم کو ہلاتی تھیں دعائیں ان کی ۔۔۔ وجد کرتے تھے ملک سن کے صدائیں ان کی
وہ عمامے وہ قبائیں وہ عبائیں ان کی ۔۔۔ (۱۹) حوریں لیتی تھیں بصد شوق بلائیں ان کی
ذکرِ خالق میں لب انکے جو ہلے جاتے تھے ۔۔۔ غنچے فردوس کے شادی سے کھلے جاتے تھے

---

[۱] جانماز۔ وہ دری، چٹائی یا کپڑا جو نماز پڑھنے کے لیے مخصوص ہو۔
[۲] نماز پڑھنے والا۔

کیا جوانانِ خوش اطوار تھے سبحان اللہ ۔ کیا رفیقانِ وفادار تھے سبحان اللہ
صفدر و غازی و جرّار تھے سبحان اللہ ۔ (۲۰) زاہد و عابد و ابرار تھے سبحان اللہ
زن و فرزند سے فرقت ہوئی مسکن چھوڑا ۔ مگر احمدؐ کے نواسے کا نہ دامن چھوڑا

اللہ اللہ عجب فوج عجب غازی تھے ۔ عجب اسوار تھے بے مثل عجب تازی تھے
لائق مدح و سزاوار سرافرازی تھے ۔ (۲۱) گو بہت کم تھے یہ آمادۂ جانبازی تھے
پیاس ایسی تھی کہ آ آگئی جاں ہونٹوں پر ۔ صابر ایسے تھے کہ پھیری نہ زباں ہونٹوں پر

زہد میں حضرت سلمان[۱] کے برابر کوئی ۔ دولت فقر و قناعت میں ابو ذر[۲] کوئی
صدق گفتار میں عمار[۳] کا ہمسر کوئی ۔ (۲۲) حمزہ[۵] عصر کوئی مالک[۴] اشتر کوئی
ہونگے ایسے ہی محمدؐ کے جو شیدا ہونگے ۔ پھر جہاد ایسا نہ ہوگا نہ وہ پیدا ہونگے

گو مصیبت میں تلاطم میں تباہی میں رہے ۔ سر کٹے پاؤں مگر راہ الٰہی میں رہے
یوں سرافراز وہ سب لشکر شاہی میں رہے ۔ (۲۳) جس طرح تیغ دو دم دستِ سپاہی میں رہے
اس مصیبت میں بھی پایا نہ کبھی شاکی ان کو ۔ آبرو ساقی کوثر نے عطا کی ان کو

وہ تخشّع[۶] وہ تضرّع وہ قیام[۸] اور وہ قعود[۹] ۔ وہ تذلّل[۷] وہ دعائیں وہ رکوع[۱۰] اور وہ سجود
یاد حق دل میں تو سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ درود[۱۲] ۔ (۲۴) یہ دعا خالق اکبر سے کہ اے ربّ ودود[۱۳]
یوں مٹیں ہم کہ نہ آل اور نہ اولاد رہے ۔ مگر احمدؐ کے نواسے کا گھر آباد رہے

---

۱ و ۲ و ۳ و ۴ رسول کے خاص صحابیوں کے نام۔ ان میں مالک اشتر بڑے بہادر سپاہی تھے ۵ رسول کے چچا۔ یہ فن جنگ کے بڑے ماہر تھے۔

۶۔ ۷ و ۸ خود کو حقیر سمجھنا۔ عاجزی انکسار۔

(نماز میں) ۸ کھڑے ہونا ۔ ۹ بیٹھنا ۔ ۱۰ جھکنا

۱۲ دعا۔ تعریف۔ شکریہ۔ رحمت۔ برکت۔ ایک عربی جملہ جس کے معنی ہیں خداوندا محمدؐ و آل محمدؐ پر رحمت نازل کر۔

۱۳ محبت اور شفقت کرنے والا۔

موم فولاد ہو آواز دل میں وہ سوز و گداز — اپنے معبود سے سجدوں میں عجب راز و نیاز
سر تو سجادوں پہ تھے عرش معلیٰ پہ نماز[1] — (۲۵) خیر دل منتخب دہر وحید و ممتاز
چاند شرمندہ ہو جس سے تجلی ایسے — نہ امام ایسا ہوا پھر نہ مصلی ایسے

جب فریضے کو ادا کر چکے وہ خوش کردار — کس کے کمروں کو بصد شوق لگائے ہتھیار
جلوہ فرما ہوئے گھوڑے پہ شہ عرش وقار — (۲۶) علم فوج کو عباس نے کھولا اک بار
دشت میں نکہت فردوس بریں آنے لگی — عرش تک اسکے پھریرے کی ہوا جانے لگی

لہر وہ سبز پھریرے کی وہ پنجے کی چمک — شرم سے ابر میں چھپ جاتا تھا خورشید فلک
کہتے تھے صل علیٰ چرخ پہ اللہ اللہ کے ملک — (۲۷) دنگ تھے سب وہ سماں سے تھا سماں تا بہ سمک
کبھی پستی اسے جو اوج ہما نے دیکھا — وہ سماں پھر نہ کبھی ارض و سما نے دیکھا

اس طرح جب علم دلبر زہرا جائے — کس سے پھر معرکہ رزم میں ٹھہرا جائے
سانپ[2] دشمن کی نہ کیوں چھاتی پہ لہرا جائے — (۲۸) لہر میں تا بہ فلک جس کا پھریرا جائے
رفع شر کو علم خیر بشر آیا تھا — سورۂ نصر[3] پئے فتح و ظفر آیا تھا

وہ علم دار کہ جو شیر الٰہی کا خلف — گوہر بحر وفا نیر دیں در نجف
فخر حمزہ سے نمودار کا جعفر کا شرف — (۲۹) کس طرح چاند کہوں چاند میں ہے عیب کلف
کس نے پایا وہ جو تھا جاہ و حشم انکے لیے — یہ علم کے لیے تھے اور علم ان کے لیے

---

[1] نماز پڑھتے وقت وہ دنیاداری سے اس قدر بلند ہو جاتے تھے اور ان میں اتنی روحانی رفعت آجاتی تھی کہ گویا وہ عرش پر پہنچ جاتے تھے۔ رسولؐ کی ایک حدیث ہے الصلوٰۃ معراج المؤمن یعنی نماز مومن کی معراج ہے۔

[2] چھاتی پر سانپ لہرانا۔ حسد کرنا۔ جلنا اصل میں محاورہ ہے چھاتی پر سانپ لوٹنا۔

[3] قرآن کا ایک سورہ جو فتح مکہ کے وقت نازل ہوا تھا یہاں علم کو نشان فتح ہونے کی بنا پر سورۂ نصر کہا ہے۔

سروِ شمشاد سے قد اس طرح کا قامت ایسی — اسد اللہ کی تصویر تھے صورت ایسی
شیر نعروں سے دہل جاتے تھے صولت[1] ایسی (۳۰) — جا کے پانی[2] نہ پیا نہر میں ہمت ایسی
جان جب تک تھی اطاعت میں کمی بھائی کی — تھے علمدار مگر بچوں کی سقائی کی

وہ بہشتی نے کیا جس کو وفا کہتے ہیں — سب انھیں عاشق شاہِ شہدا کہتے ہیں
ان کو قبلہ تو انھیں قبلہ نما کہتے ہیں (۳۱) — جو بہادر ہیں وہ شمشیر خدا کہتے ہیں
عشق سردار و علمدار کا افسانہ ہے — وہ چراغ رہ دیں ہیں تو یہ پروانہ ہے

اک طرف اکبر مہرو سا جوان نایاب — کچھ جو بچپن تھا تو کچھ آمد ایام شباب
روشنی چہرے پہ ایسی کہ خجل ہو مہتاب (۳۲) — آنکھیں ایسی کہ رہا نرگس شہلا[3] کو حجاب
جس نے ان گیسوؤں میں رخ کی ضیا کو دیکھا — شب معراج میں محبوب خدا کو دیکھا

اے خوشا حسن رخ یوسفِ کنعان حسنؑ[4] — راحت روح حسین ابن علی جان حسنؑ
جسم میں زور علی طبع میں احسان حسنؑ (۳۳) — ہمہ تن خلق حسنؑ حسن حسنؑ شان حسنؑ
تن پہ کرتی تھی نزاکت سے گرانی پوشاک — کیا بھلی لگتی تھی بچپن میں شہانی[5] پوشاک

اللہ اللہ اسد حق کے نواسوں کا جلال — چاند سے چہروں پہ بل کھائے ہوئے زلفوں کے بال
نیچے کاندھے پہ رکھے ہوئے مانند ہلال (۳۴) — گرچہ بچپن تھا یہ رستم کو سمجھتے تھے وہ زال
صف سے گھوڑوں کو بڑھا کر جو پلٹ جاتے تھے — مورچے لشکر کفار کے ہٹ جاتے تھے

---

۱ رعب۔ دبدبہ۔ ہیبت۔

۲ تین دن کی پیاس میں دریا سے پیاسا نکل آنے کے لیے مشکل سے مشکل کام کر ڈالنے سے بھی زیادہ ہمت درکار ہے۔

۳ گہرے نیلے رنگ کی نرگس۔

۴ امام حسن کے حسین و جمیل صاحبزادے حضرت قاسم۔ کنعان۔ ملک شام کا ایک صوبہ موجودہ فلسطین کا ایک حصہ۔ حضرت یوسف کا وطن۔

۵ شادی کے کپڑے جو بالعموم سرخ رنگ کے ہوتے ہیں۔

آستینوں کو چڑھائے ہوئے آمادۂ جنگ — وہی سارا اسد اللہ کا نقشہ وہی ڈھنگ
سرخ چہرے تھے کہ شیروں کا یہی ہوتا ہو رنگ — (۳۵) دلولہ صف کے الٹنے کا لڑائی کی امنگ
جسم پر تیر چلیں نیزۂ خونخوار چلے — شوق اس کا تھا کہ جلدی کہیں تلوار چلے

یک بیک طبل بجا فوج میں گرجے بادل — کوہ تھرائے زمیں ہل گئی گونجا جنگل
پھول ڈھالوں کے چمکنے لگے تلوار کے پھل[1] — (۳۶) مرنے والوں کو نظر آنے لگی شکل اجل
واں کے چاؤش[2] بڑھانے لگے دل لشکر کا — فوج اسلام میں نعرہ ہوا یا حیدر کا

شور میدانیوں میں تھا کہ دلیرو نکلو — نیزہ بازی کرو رہواروں کو پھیرو نکلو
نہر قابو میں ہے اب پیاسوں کو گھیرو نکلو — (۳۷) غازیو صف سے بڑھو غول سے شیرو نکلو
رستمو داد وغا دو کہ یہ دن داد کا ہے — سامنا حیدر کرار کی اولاد کا ہے

شور سادات میں تھا یا شہ مرداں مدد ے — کعبۂ دیں مدد ے قبلۂ ایماں مدد ے
قوت بازو ے پیغمبر ذی شاں مدد ے — (۳۸) دم تائید ہے اے فخر سلیماں مدد ے
تیسرا فاقہ ہے طاقت میں کمی ہے مولا — طلب قوت ثابت قدمی ہے مولا

پیاس میں حرف نہ شکوے کا زباں تک لائیں — دم بہ دم سینوں پہ فاقوں میں سنانیں کھائیں
دل نہ تڑپے جو دم نزع نہ پانی پائیں — (۳۹) تیرے فرزند کی تائید کریں مرجائیں
لاشیں مقتل میں ہوں لاش تنہ دلگیر کیساتھ — سر ہوں نیزوں پہ سر حضرت شبیر کیساتھ

سامنے بڑھ کے یکایک صف کفار آئی — جھوم کر تیرہ گھٹا تاروں پہ اک بار آئی
روز روشن کے چھپانے کو شب تار آئی — (۴۰) تشنہ کاموں کی طرف تیروں کی بوچھار آئی
ہنس کے منھ بھائی کا شاہ شہداں نے دیکھا — اپنے آقا کو بحسرت رفقا نے دیکھا

---

[1] 'پھول' اور 'پھل' میں صنعت ایہام تناسب ہے۔
[2] نقیب جو میدان جنگ میں سپاہیوں کو جوش دلانے والی باتیں بلند آواز سے کہتے ہیں۔

عرض عباس نے کی جوش ہے جرّار[1] وں کو   تیر سب کھاتے ہیں تولے[2] ہوئے تلواروں کو
مہمانوں کا نہیں پاس ستمگاروں کو (۴۱)   مصلحت ہو تو رضا دیجیے غمخواروں کو
روسیاہوں کو ہٹا دیں کہ بڑھے آتے ہیں   ہم جو خاموش ہیں وہ منھ پہ چڑھے آتے ہیں

شہ نے فرمایا مجھے خود ہے شہادت منظور   نہ لڑائی کی ہوس ہے نہ شجاعت کا غرور
جنگ منظور نہ تھی ان سے پر اب ہوں مجبور (۴۲)   خیر لڑ لو کہ ستاتے ہیں یہ بے جرم و قصور
ذبح کرنے کے لیے لشکر ناری آئے   کہیں جلدی مرے سر دینے کی باری آئے

حکم پاتا تھا کہ شیر دل نے اڑائے تازی[3]   مثل شہباز گیا ایک کے بعد اک غازی
واہ ری حرب خوشا ضرب زہے جاں بازی (۴۳)   اڑ گئے ہاتھ بڑھا جو پئے دست اندازی
لوٹتے رن میں سر و جسم نظر آتے تھے   ایک حملے میں قدم فوج کے اٹھ جاتے تھے[4]

جس پہ غصے میں گئے صید پہ شہباز گرا   یہ کماں کٹ کے گری وہ قدر انداز گرا
جب گرا خاک پہ گھوڑے سے تو ممتاز گرا (۴۴)   نہ اٹھا پھر کبھی جو تفرقہ پرداز گرا
ہاتھ منھ کٹ گئے سر اڑ گئے جی چھوٹ گئے   مورچے ہو گئے پامال پرے ٹوٹ گئے

بعد غیروں کے عزیزوں نے کیا عزم نبرد   سر کو نہوڑا کے بھرا سبط نبی نے دم سرد
ہوک اٹھتی تھی کبھی سینے میں دل میں کبھی درد (۴۵)   سرخ ہوتا تھا کبھی چاند سا چہرہ کبھی زرد
کوئی گل رو تو کوئی سرو سہی بالا تھا   وہ بچھڑنے لگے گودی میں جنھیں پالا تھا

زلفوں والا تھا کوئی کوئی مرادوں والا   کوئی بھائی کا پسر کوئی بہن کا پالا
چاند سا منھ جو کسی کا تھا تو گیسو کالا (۴۶)   کوئی قامت میں بہت کم کوئی قد میں بالا
نوجواں کون سا خوش رو و خوش انداز نہ تھا   کتنے ایسے تھے کہ سبزہ ابھی آغاز نہ تھا

---

[1] جرار کے لغوی معنی ہیں کھینچنے والا۔ اردو میں بہادر کے معنی میں مستعمل ہے۔
[2] وار کرنے پر آمادہ۔
[3] عربی گھوڑا۔
[4] ہمت پست ہو گئی۔ خوف زدہ ہو گئے۔

ہاتھ وہ بچوں کے اور چھوٹی سی وہ تلواریں   موم کر دیتی تھیں فولاد کو جن کی دھاریں
آب ہو شیر کا زہرہ وہ اگر للکاریں (۴۷)   بجلیاں کوند رہی ہیں کہ یہ نیزے ماریں
کس بشاشت سے ہزاروں پہ لپکتے ہیں   بچے آتے ہیں کہ بپھرے ہوئے شیر آتے ہیں

یہی ہنگامہ رہا صبح سے تا وقتِ زوال   لاش پر لاش گری بھر گیا میدانِ قتال
مورچے سب تہ و بالا تھے پرے[1] سب پامال (۴۸)   سرخ رو خلق سے اٹھے اسد اللہ کے لال
کھیت ایسے کبھی کسی جنگ میں کم پڑتے ہیں   جو لڑا سب یہی سمجھے کہ علی لڑتے ہیں

قاسم و اکبر و عباس کا اللہ رے جہاد   غل ہر اک ضرب پہ تھا اب ہوئی دنیا برباد
الاماں کا تھا کہیں شور کہیں تھی فریاد (۴۹)   دے گئے خلق میں مردانگی و حرب کی داد
گو وہ دنیا میں نہیں عرش مقام ان کا ہے   آج تک عالمِ ایجاد میں نام ان کا ہے

دوپہر میں وہ چمن بادِ خزاں نے لوٹا   پتا پتا ہوا تاراج تو بوٹا بوٹا[1]
باپ بیٹے سے چھٹا بھائی سے بھائی چھوٹا (۵۰)   ابنِ زہرا کی کمر جھک گئی بازو ٹوٹا
پھر نہ یاور نہ وہ جانباز نہ وہ شیدا تھے   ظہر کے وقت حسین ابن علی تنہا تھے

سانحہ جو جو کہ بہادر تھے وطن سے آئے   سامنے سوتے تھے ریتی پہ سنانیں کھائے
دھوپ میں پیاس سے مثلِ گلِ تر مرجھائے (۵۱)   مر گئے پر نہ عزیزوں نے کفن تک پائے
دھوپ پڑتی تھی یہ دن چرخ نے دکھلایا تھا   نہ تو چادر تھی کسی لاش پہ نہ سایا تھا

صاحبِ فوج پہ طاری تھا عجب رنج و ملال   زرد تھا رنگ تو آنکھیں تھیں لہو رونے سے لال
کبھی بھائی کا الم تھا کبھی بیٹے کا خیال (۵۲)   کبھی دھڑکا تھا کہ لاشیں نہ کہیں ہوں پامال
کبھی بڑھتے تھے دغا کو کبھی رک جاتے تھے   سیدھے ہوتے تھے کبھی اور کبھی جھک جاتے تھے

پرے: فوج

۱؎ چھوٹے قد کا درخت

بڑھ کے چلاتے تھے بیدرد کہ اب آپ آئیں　　جوہرِ تیغ شہنشاہِ نجف دکھلائیں
(٥٣) مرنے والے نہیں جیتے جو سنانیں کھائیں　　کاٹ لیں آپ کا سر تن سے تو فرصت پائیں
پسرِ سعد سے وعدہ ہو صلہ لینے کا　　حکم ہو خیمۂ اقدس کے جلا دینے کا

شہ نے فرمایا کہ سر کاٹ لو حاضر ہوں میں　　نہ تو لڑنے میں نہ مرجانے میں قاصر ہوں میں
(٥٤) فوج بھی اب نہیں بے یار و ناصر ہوں میں　　شہر و صحرا ابھی تمہارا ہے مسافر ہوں میں
لوٹ لو پھونک دو تاراج کرو بہتر ہے　　کلمہ گو[1] یہ تمہارے ہی نبی کا گھر ہے

کئی سیدانیاں خیمے میں ہیں پردے والی　　جن کا رتبہ ہے زمانے میں ہر اک پر حالی[2]
(٥٥) اب نہ وارث ہے کوئی سر پہ نہ کوئی والی　　ان کو دیکھو کوئی رہ جائے جو خیمہ خالی
یہ نبی زادیاں بے پردہ نہ ہوویں جس میں　　ایک گوشہ ہو کہ سب بیٹھ کے رو لیں جس میں

شہ کی ان باتوں کا اعدا نے دیا جو کہ جواب　　گر لکھوں اس کو تو ہو جائے جگر سنگ کا آب
(٥٦) قلب تھرا گیا ہرگز نہ رہی ضبط کی تاب　　دیکھ کر رہ گئے گردوں کو شہِ عرش جناب
اشک غالی اسے کہتے ہیں جو دل بھر آئے　　آپ رونے کے لیے خیمے کے در پر آئے

تھم کے چلائے کہ اے زینب و ام کلثوم　　تم سے رخصت کو پھر آیا ہے حسین مظلوم
(٥٧) اب مرے قتل کے درپے ہے یہ سب لشکر شوم　　ہاں جگا دو اسے غش ہو جو سکینہ معصوم
نہیں ملتا جو زمانے سے گزر جاتا ہے　　کہہ دو عابد سے کہ مرنے کو پدر جاتا ہے

یہ صدا سن کے حرم خیمے سے مضطر دوڑے　　شہ کی آواز پہ سب بیکس و بے پر دوڑے
(٥٨) گر پڑیں سر سے ردائیں تو کھلے سر دوڑے　　بچے روتے ہوئے ماؤں کے برابر دوڑے
رو کے چلائی سکینہ شہ والا آؤ　　میں تمہیں ڈھونڈھتی تھی دیر سے بابا آؤ

---

[1] کلمہ پڑھنے والو مسلمانو۔
[2] ظاہر

(۵۹)

آؤ اچھے مرے بابا میں تمھارے واری — دیکھو تم بن ہیں گلے تک مرے آنسو جاری
آج یہ کیا ہے کہ بھولے مری خاطرداری — ہاتھ پھیلا کے کہو آ مری بیٹی پیاری
منھ چھپانے کی ہے کیا وجہ نہ شرماؤ تم — اب میں پانی بھی نہ مانگوں گی چلے آؤ تم

(۶۰)

دیکھ کر پردے سے یہ کہنے لگی زینب زار — ابن زہرا تری مظلومی کے ہمشیر نثار
آؤ چادر سے کروں پاک میں چہرے کا غبار — شہ نے فرمایا بہن مرگئے سب مونس و یار
تم نے پالا تھا جسے ہم اسے رو آئے ہیں — علی اکبر سے جگر بند کو کھو آئے ہیں

(۶۱)

منھ دکھائیں کسے سب سے ہے ندامت زینب — گھر میں آنے کی نہیں بھائی کو مہلت زینب
کھینچ لائی ہے سکینہ کی محبت زینب — بھائی جاتا ہے دکھا دو ہمیں صورت زینب
نہ تو سر کھولو نہ منھ پیٹو نہ فریاد کرو — بھول جاؤ ہمیں اللہ کو اب یاد کرو

(۶۲)

صبر سے خوش ہے خدا اے مری غمخوار بہن — سہل ہو جاتا ہے جو امر ہو دشوار بہن
اپنی ماں کا ہے طریقہ تمھیں درکار بہن — پھر میں کہتا ہوں سکینہ سے خبردار بہن
ناز پرور ہے مرے بعد الم اس پہ نہ ہو — بندے کانوں سے اتارو کہ ستم اس پہ نہ ہو

(۶۳)

کہیو عابد سے یہ پیغام مرا بعد سلام — غش تھے تم پھر گئے دروازے تلک آ کے امام
قید میں پھنس کے نہ گھبرائیو اے گل اندام — کاٹیو صبر و رضا سے سفر کوفہ و شام
ناؤ منجدھار میں ہے شور تلاطم جانو — ناخدا جاتا ہے گھر جانے اب اور تم جانو

(۶۴)

کہہ کے یہ باگ پھرائی طرف لشکر شام — پڑ گیا خیمۂ ناموس نبی میں کہرام
رن میں گھوڑے کو اڑاتے ہوئے آئے جو امام — رعب سے فوج کے دل ہل گئے کانپے اندام
سر جھکے انکے جو کامل تھے زباں دانی میں — اڑ گئے ہوش فصیحوں کے رجز خوانی میں

(۶۵)

تھا یہ نعرہ کہ محمد کا نواسا ہوں میں — مجھ کو پہچانو کہ خالق کہ شناسا ہوں میں
زخمی ہونے سے نہ مرنے سے ہراساں ہوں میں — تیسرا دن ہے یہ گرمی میں کہ پیاسا ہوں میں
چین کیا چیز ہے آرام کسے کہتے ہیں — اس پہ شکوہ نہیں کچھ صبر اسے کہتے ہیں

۱؎ خوف زدہ

(۶۶)

اس کا پیارا ہوں جو ہے ساقی حوض کوثر — اس کا بیٹا ہوں جو ہے فاتح باب خیبر

اس کا فرزند ہوں کی جس نے ہم بڑی کی سر — اس کا دلبر ہوں میں دی جس کو نبی نے دختر

صاحب تخت ہوے تیغ ملی تاج ملا — دوش احمدؐ[1] پہ انھیں رتبہ معراج ملا

(۶۷)

بے وطن ہوں نہ مسافر کو ستاؤ للّٰہ — قتل کیوں کرتے ہو تم کون سا میرا ہے گناہ

اب نہ یاور ہے کوئی ساتھ نہ لشکر نہ سپاہ — تم کو لازم ہے غریبوں پہ ترحم کی نگاہ

ہاتھ آئے گا نہ انعام نہ زر پاؤ گے — یاد رکھو مرا سر کاٹ کے پچھتاؤ گے

(۶۸)

نہ ابھی ختم ہوئی تھی یہ مسلسل تقریر — حجت اللہ[2] کے فرزند پہ چلنے لگے تیر

چوم کر تیغ کے قبضے کو پکارے شبیر — لو خبردار چمکتی ہے علی کی شمشیر

پسر فاتح صفین[3] و حنین[4] آتا ہے — لو صفیں باندھ کے روکو تو حسین آتا ہے

(۶۹)

لو کھنچی تیغ دو سر فوج پہ آفت آئی — لو ہلا قائمہ[6] عرش قیامت آئی

فتح تسلیم کو آداب کو نصرت آئی — فخر سے غاشیہ برداری کو شوکت آئی

چوم لوں پاؤں جلال اس تگ و دو میں آیا — ہاتھ جوڑے ہوئے اقبال جلو میں آیا

(۷۰)

آپ سیدھے جو ہوئے رخش نے بدلے تیور — دونوں آنکھیں ابل آئیں کر ڈبے بانی شر

تھوتھنی مل گئی سینے سے کیا دم کو چنور — مثل طاؤس اڑا گاہ ادھر گاہ ادھر

دم بدم گرد نسیم سحری پھرتی تھی — جھوم کر پھرتا تھا گھوڑا کہ پری پھرتی تھی

(۷۱)

ابر ڈھالوں کا اٹھا تیغ دو پیکر[7] چمکی — برق بھینچی ہے یہ چمکی تو برابر چمکی

سوئے پستی کبھی کوندی کبھی سر پر چمکی — کبھی انبوہ کے اندر کبھی باہر چمکی

جس طرف آئی وہ ناگن اسے ڈستے دیکھا — مینھ سروں کا صف دشمن میں برستے دیکھا

---

[1] اشارہ ہے اس واقعے کی طرف کہ حضرت علی نے حضرت محمدؐ کے کاندھے پر کھڑے ہو کر کعبے کے بت گرائے تھے۔

[2] خدا کا ثبوت۔ مراد حضرت علی۔ [3، 4 و 5] ان مقاموں میں حضرت علی نے بڑے معرکے کا جہاد کیا تھا۔ [6] عرش کا پایہ۔ [7] دوہرے پھل والی تلوار۔

دھار ایسی کہ رواں ہوتا ہے دھارا جیسے گھاٹ وہ گھاٹ کہ دریا کا کنارا جیسے
چمک ایسی کہ حسینوں کا اشارہ جیسے روشنی وہ کہ گرے ٹوٹ کے تارا جیسے
کوندنا برق کا شمشیر کی ضو میں دیکھا کبھی ایسا تو نہ دم خم مہ نو میں دیکھا

اک اشارے میں برابر کوئی دو تھا کوئی چار نہ پیادہ کوئی بچتا تھا سلامت نہ سوار
برق گرتی تھی کہ چلتی تھی صفوں پر تلوار (۳) غضب[1] اللہ علیہم کے عیاں تھے آثار
موت ہر غول کو برباد کیے جاتی تھی آگ گھیرے ہوئے دوزخ میں لیے جاتی تھی

تیغیں آری ہوئیں ڈھالوں کے اڑے پرکالے بند سب بھول گئے خوف سے نیزوں والے
جو بڑھا ہاتھ سر دست قلم کر ڈالے (۴) تیغ کہتی تھی یہ سب ہیں مرے دیکھے بھالے
صف پہ صف باندھ کے نیزوں کو عبث تولے ہیں ایسے عقدے مرے ناخن نے بہت کھولے ہیں

جب کبھی جائزہ[2] فوج ستم لیتی ہوں موت سے رحم نہ کرنے کی قسم لیتی ہوں
دو زبانوں سے سدا کار قلم لیتی ہوں (۵) چہرے کٹ چکتے ہیں لشکر کے تو دم لیتی ہوں
برطرف ہو کے عدم کے سفری ہوتے ہیں طبلقیں[3] کٹتی ہیں چہرے[4] نفری ہوتے ہیں

وہ برش وہ چمک اسکی وہ صفائی اس کی کسی تلوار نے تیزی نہیں پائی اس کی
اس کا بازو جو اڑایا تو کلائی اس کی (۶) لگ گئی جس کے گلے سے اجل آئی اس کی
صورتِ مرگ کسی نے کبھی نہ آتے دیکھا سر پہ چمکی تو کمر سے اسے جاتے دیکھا

---

[1] ان پر خدا کا غضب نازل ہو۔ یہ قرآن کے سورۂ فتح کی ایک آیت کا ٹکڑا ہے۔ اس میں اُن کا اشارہ منافقوں اور مشرکوں کی طرف ہے۔

[2] حاضری لینا۔ معائنہ کرنا۔ جانچ کرنا۔

[3] طبلق۔ کاغذوں کا مٹھا۔ مسل۔ فائل: فوج کے دفتر میں ہر سپاہی کی ایک مسل یا فائل رہتی ہوگی اور جب کسی سپاہی کا نام خارج کیا جاتا ہوگا تو اس کی مسل چاک کر ڈالی جاتی ہوگی۔

[4] چہرے کٹتے ہیں، فوج کے دفتر سے نام خارج ہوتے ہیں۔

کبھی ڈھالوں پہ گری اور کبھی تلواروں پر — پیدلوں پر کبھی آئی کبھی اسواروں پر
کبھی ترکش پہ رکھا منھ کبھی سوفاروں پر (۷۷) کبھی سر کاٹ کے آپہونچی کمانداروں پر
گرکے اس غول سے اٹھی تو اس انبوہ میں تھی — کبھی دریا میں کبھی بر میں کبھی کوہ میں تھی

کبھی چہرہ کبھی شانہ کبھی پیکر کاٹا — کبھی در آئی جگر میں تو کبھی سر کاٹا
کبھی مغفر کبھی جوشن کبھی بکتر[1] کاٹا (۷۸) طول میں راکب و مرکب کو برابر کاٹا
برش تیغ کا غل قاف سے تا قاف رہا — پی گئی خون ہزاروں کا پہ منھ صاف رہا

نہ رکی خود پہ وہ اور نہ سپر پر ٹھہری — نہ کسی تیغ پہ دم بھر نہ سپر پر ٹھہری
نہ جبیں پر نہ گلے پر نہ جگر پر ٹھہری (۷۹) کاٹ کر زین کو گھوڑے کی کمر پر ٹھہری
جان گھبرا کے تن دشمن دیں سے نکلی — ہاتھ بھر ڈوب کے تلوار زمیں سے نکلی

کٹ گئی تیغ تلے جب صف دشمن آئی — یک بیک فصل فراق سر و گردن آئی
بگڑی اس طرح لڑائی کہ نہ کچھ بن آئی (۸۰) تیغ کیا آئی کہ اڑتی ہوئی ناگن آئی
غل تھا بھاگو کہ یہ ہنگام ٹھہرنے کا نہیں — زہر اسکا جو چڑھے گا تو اترنے کا نہیں

وہ چمک اس کی سروں کا وہ برسنا ہر سو — گھاٹ سے تیغ کے اک حشر بپا تھا لب جو
آب میں صورت آتش تھی جلا دینے کی خو (۸۱) اور دم بڑھتا تھا پیتی تھی جو اعدا کا لہو
کبھی جوشن تو کبھی صدر کشادہ کاٹا — جب چلی ضرب سابق سے زیادہ کاٹا

تن تنہا شہ دیں لاکھ سواروں سے لڑے — بے سپر برچھیوں والوں کی قطاروں سے لڑے
صورت شیر خدا ظلم شعاروں سے لڑے (۸۲) دو سے اک لڑ نہیں سکتا یہ ہزاروں سے لڑے
گر ہو غالب تو ہزاروں پہ وہی غالب ہو — جو دل و جان علی ابن ابی طالب ہو

---

[1] ایک طرح کی زرہ۔

(٨٣)
تیسرے فاقے میں یہ جنگ یہ حملے یہ جدال — پیاس وہ پیاس کہ نیلم تھے سراسر لب لال[1]
دھوپ وہ دھوپ کہ سوکھے ہوئے تھے تازہ نہال — لو وہ لو جس کی حرارت سے پگھلتے تھے جبال
سنگ ریزوں میں تب و تاب[2] بھی انگاروں کی — سر پہ[3] یا دھوپ تھی یا چھاؤں تھی تلواروں کی

(٨٤)
تیر سے تھے کبھی جنگل میں ترائی میں کبھی — ڈھال کو چہرے پہ روکا نہ لڑائی میں کبھی
تیغ حیدر نے کمی کی نہ صفائی میں کبھی — فرق آیا نہ سر و تن کی جدائی میں کبھی
کسی ابرو کا بھی ایسا نہ اشارہ دیکھا — جس پہ اک بار چلی اسکو دوبارہ دیکھا

(٨٥)
آنکھ وہ آنکھ کہ شیروں کی جلالت جس میں — رخش وہ رخش کہ سبقت کی سرعت جس میں
تیغ وہ تیغ عیاں موت کی صورت جس میں — ہاتھ وہ ہاتھ یداللہ کی طاقت جس میں
روکلے وار جگر کیا کسی بے پیر کا ہے — زور وہ جس میں اثر فاطمہ کے شیر کا ہے

(٨٦)
جنگ میں پیاس کا صدمہ شہ دیں سے پوچھو — تن تنہا کی وغا لشکر کیں سے پوچھو
زلزلہ دشت پر آفت کا زمیں سے پوچھو — ضرب شمشیر دو سر روح امیں[4] سے پوچھو
باپ اس فوج میں تنہا پسر اس لشکر میں — کربلا میں یہ تلاطم ہوا یا خیبر میں

(٨٧)
اسداللہ کے صدقے شہ والا کے نثار — وہی حملے تھے وہی زور وہی تھی تلوار
فتح حیدر نے کیا جنگ میں خیبر کا حصار — مورچے فوج کے حضرت نے بھی توڑے کئی بار
کیوں نہ ہو احمد مرسل کے نواسے تھے حسینؑ — فرق اتنا تھا کہ دو روز کے پیاسے تھے حسینؑ

(٨٨)
ہر طرف فوج میں غل تھا کہ دہائی مولا — ہم نے دیکھی ترے ہاتھوں کی صفائی مولا
الاماں خوب سزا جنگ کی پائی مولا — آپ کرتے ہیں بروں سے بھی بھلائی مولا
ہاتھ ہم باندھتے ہیں پھینک کے شمشیروں کو — بخشیے امت نا اہل کی تقصیروں کو

---

[1] 'لال' فارسی۔ اردو لفظ 'لال' کا مترادف۔
[2] تپش اور گرمی۔ بہت شدت کی گرمی۔
[3] دھوپ کی تکلیف اگر دور ہوتی تھی تو تلواروں کی چھاؤں سے جو دھوپ سے بھی زیادہ رنج فزا تھی۔
[4] امانت دار فرشتہ مراد جبرئیل جو خدائی رازوں کے امین ہیں۔

(۸۹)
آئی ہاتف کی یہ آواز کہ اے عرش مقام
یہ وغا تیرے فاقے میں بشر کا نہیں کام
اے محمدؐ کے جگر بند امام ابن امام
لوحِ محفوظ[1] پہ مرقوم ہے صابر ترا نام
اب نہیں حکم لعینوں سے وغا کرنیکا
ہاں[2] یہی وقت ہے وعدے کے وفا کرنیکا

(۹۰)
آج ہے آٹھوں بہشتوں کی نئی تیاری
نخل سرسبز ہیں فردوس میں نہریں جاری
شب سے حوریں ہیں مکلل[3] بجواہر ساری
خانۂ دوست میں ہو دوست کی مہمانداری
پیشوائی کو رسول الثقلین آتے ہیں
عرش تک شور یہی ہو کہ حسین آتے ہیں

(۹۱)
تھم گئے سن کے یہ آواز شہ جن و بشر
روک کر تیغ کو فرمایا کہ حاضر ہے یہ سر
عید ہو جائے اگر ذبح کریں بانی شر
شمر ظالم ہے کدھر کھینچ کے آئے خنجر
ہو وہ عاشق جو فدا ہونے کو موجود رہے
بس مری فتح[4] یہی ہو کہ وہ خوشنود رہے

(۹۲)
کہہ کے یہ میان میں مولا نے رکھی تیغ دودم
ہاتھ اٹھا کر یہ اشارہ کیا گھوڑے کو کہ تھم
رہ گیا سر کو ہلا کر فرسِ تیز قدم
چار جانب سے مسافر پہ جھکے اہلِ ستم
نیزے یوں گرد تھے جیسے گلِ تر خاروں میں
گھر گئے سبطِ نبی ظلم کی تلواروں میں

(۹۳)
پہلے تیروں سے کمانداروں نے چھاتی چھانی
نیزے پہلو پہ لگاتے تھے ستم کے بانی
سر پہ تلواریں چلیں زخمی ہوئی پیشانی
خوں سے تر ہو گیا حضرت کا رخِ نورانی
جسم سب چھد رہا پرزے تھے زرہ جامے[5] کے
پیچ کٹ کٹ کے کھلے جاتے تھے عمامے کے

---

۱ عرش پر ایک تختی ہے جس پر ایک قلم خدائی احکام اور شدنی واقعات لکھ دیا کرتا ہے۔
۲ یہ مصرع اس روایت پر مبنی ہے کہ امام حسین نے بچپن میں اپنے نانا حضرت محمدؐ کی رسالت کی تکمیل کے لیے اپنی شہادت منظور کی تھی۔
۳ آراستہ۔ جواہرات سے آراستہ۔
۴ امام حسین نے خدا کی راہ پر جنگ کی تھی۔ یزیدی فوج کو شکست دینا ان کا مقصد نہ تھا۔
۵ زرہ کے نیچے پہننے کا لباس۔

برچھیاں مارتے تھے گھاٹ پہ جو تھے پہرے کس طرح جائے کہاں تینوں میں بیکس ٹھہرے
ایک ہزار اور کئی سو زخم تھے تن پر گہرے (۹۴) دیکھنے والوں کے ہوجاتے تھے پانی زہرے
خوں میں ڈوبا ہوا وہ مصحف رخ سارا تھا جزو ہر اک تن شبیر کا سی پارا[۱] تھا

ہاتھ سے باگ جدا تھی تو رکابوں سے قدم غش میں سیدھے کبھی ہوتے تھے فرس پر کبھی خم
بہتے تھے پہلوؤں سے خوں کے دریا پیہم (۹۵) کوئی بیکس کا مددگار نہ تھا ہائے ستم
مارے تلواروں کے مہلت نہ تھی دم لینے کی کوششیں ہوتی تھیں کعبے کے گرا دینے کی

دشت سے آتی تھی زہرا کی صدا ہائے حسینؑ میرے بیکس مرے بے بس مرے دکھ پائے حسینؑ
در سے چلاتی تھی زینب مرے ماں جائے حسینؑ (۹۶) کون تیغوں سے بچا کر تجھے لے آئے حسینؑ
فاطمہ رو رہی ہیں ہاتھوں سے پہلو تھامے حکم گر ہو تو بہن دوڑ کے بازو تھامے

ہائے سید ترا تن اور ستم کے بھالے کس کو چلاؤں کہ جیتے نہیں مرنے والے
اس پہ یہ ظلم دکھوں سے جسے زہرا پالے (۹۷) کون سر سے ترے تلواروں کی آفت ٹالے
کون فریاد سنے بے سر و سامانوں کی یاں تو بستی بھی نہیں کوئی مسلمانوں کی

نہ رہا جب کہ ٹھہرنے کا فرس پر یارا گر پڑا خاک پہ وہ عرش خدا کا تارا
غش سے کچھ دیر میں اٹھا جو علی کا پیارا (۹۸) نیزہ سینے پہ سنان[۲] ابن انس نے مارا
واں تو نیزے کی انی پشت سے باہر نکلی یاں بہن خیمے کی ڈیوڑھی سے کھلے سر نکلی

کھینچ کر سینے سے نیزہ جو بڑھا دشمن دیں جھک کے حضرت نے رکھی خاک پہ سجدے میں جبیں
تیز کرتا ہوا خنجر کو بڑھا شمر لعیں (۹۹) آسماں ہل گئے تھرا گئی مقتل کی زمیں
کیا کہوں تیغ کو کس طرح گلے پر رکھا پارۂ قرآں[۳] پہ رکھا حلق پہ خنجر رکھا

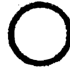
---

۱ تیس ٹکڑے۔ قرآن تیس حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ہر حصہ ایک پارہ کہلاتا ہے۔
۲ یزیدی فوج کا ایک سردار۔
۳ امام حسینؑ کے سینے کو قرآن سے استعارہ کیا ہے۔

ڈھانپ کر ہاتھوں سے منھ بنت علی چلائی — ذبح ہوتے ہو گئے سامنے ہے ہے بھائی
ضرب اول تھی کہ تکبیر کی آواز آئی — (۹۹) گر پڑی خاک پہ غش کھا کے علی کی جائی
آنکھ کھولی تھی کہ ہنگامۂ محشر دیکھا — سر اٹھایا تو سرِ شہ کو سناں پر دیکھا

روکے چلائی کہ ہے ہے مرے مظلوم حسینؑ — فوج اعدا میں تمہیں قتل کی ہو دھوم حسینؑ
کچھ مجھے آنکھوں سے ہوتا نہیں معلوم حسینؑ — (۱۰۰) ہائے میں رہ گئی دیدار سے محروم حسینؑ
مڑ کے دیکھو کہ مصیبت میں پڑی ماں جائی — ننگے سر لو اعدا میں کھڑی ہے بہن بھائی

بس انیسؔ آگے نہ لکھ زینب ناشاد کے بین — قتل ہو جانے پہ بھی دھوپ میں تھی لاش حسینؑ
قبر میں بھی نہ ملا احمد مختار کو چین — (۱۰۱) گھر جلا قید ہوئی آل رسول الثقلین[1]
کتنے گھر شاہ کے مرجانے سے برباد ہوئے — لٹ گئے یوں کہ نہ سادات پھر آباد ہوئے



پروا تیغ زباں کو سجنے کی نہیں — حاجت طبل سخن کو بجنے کی نہیں
دُربار ہے ابر طبع لیکن ہوں خموش — عادت ہے برسنے کی گرجنے کی نہیں

مضمون انیسؔ کا نہ چربا اترا — اترا بھی تو کچھ بگڑ کے نقشا اترا
نقاش نے سو طرح سے خفت کھینچی — تصویر نہ کھینچ سکی تو چہرا اترا

مملو درِ معنی سے مرا سینہ ہے — دل میں یہ صفائی ہے کہ آئینہ ہے
جب قفل دہن کھلا جواہر نکلے — گویا کہ زباں کلید گنجینہ ہے

---

[1] جن و انس کے یعنی تمام مخلوقات کے رسول

رباعیات

اندیشے میں دن تمام ہو جاتا ہے　　زنداں گھر وقت شام ہو جاتا ہے
زردار سے پوچھ حفظ زر کی تکلیف　　شب کا سونا حرام ہو جاتا ہے

دولت نہ عطا کر نہ جہاں میں زر دے　　جو باعث آبرو ہے وہ گوہر دے
شاہوں کو نصیب بحر و بر کی تحصیل　　یارب مجھے نان خشک و چشم تر دے

برباد کیا ہے طبع آوارہ نے　　تڑپا رکھا ہے قلب صد پارہ نے
شیطان کی کچھ خطا نہ قسمت کا قصور　　مارا مجھے آہ نفس امارہ نے

گلہائے مضامیں کو کہاں بند کروں　　خوشبو نہیں چھپنے کی جہاں بند کروں
میں باعث نغمہ سنجی بلبل ہوں　　کھولے نہ کبھی منھ جو زباں بند کروں

وہ نظم پڑھوں کہ بزم رنگیں ہو جائے　　اک نعرۂ آفرین و تحسیں ہو جائے
جھڑتے ہیں دہن سے پھول لفظوں کے عوض　　یاں آئے سخن چیں بھی تو گلچیں ہو جائے

زیبا ہے وقار بادشاہی کے لیے　　جرأت واجب ہے کج کلاہی کے لیے
لازم ہو کہ ہو اہل سخن تیز زباں　　تلوار ضرور ہے سپاہی کے لیے

الفت ہے نہ پاس ربط دیرینہ ہے　　منھ پر تو ہیں صاف قلب میں کینہ ہے
گر کیجیے امتحاں تو قلعی کھل جائے　　یاں سب کے دلوں کا حال آئینہ ہے

ہر وقت زمانے کا ستم سہتے ہیں　　حاسد جو برا کہے تو چپ رہتے ہیں
جو نیک ہیں وہ بدوں کو بھی کہتے ہیں نیک　　جو بد ہیں وہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

دل سے طاقت بدن سے کس جاتا ہے　　آتا نہیں پھر کے جو نفس جاتا ہے
جب سال گرہ ہوئی تو عقدہ یہ کھلا　　یاں اور گرہ سے اک برس جاتا ہے

مرثیہ (۷)

جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے[1] — جلوہ کیا سحر کے رخ بے حجاب نے
دیکھا سوئے فلک شہ گردوں رکاب نے (۱) مڑ کر صدا رفیقوں کو دی اس جناب نے
آخر ہو رات حمد و ثنائے خدا کرو — اٹھو فریضۂ سحری[2] کو ادا کرو

ہاں غازیو یہ دن ہے جدال و قتال کا — یاں خوں بہے گا آج محمدؐ کی آل کا
چہرہ خوشی سے سرخ ہے زہرا کے لال کا (۲) گزری شب فراق دن آیا وصال کا
ہم وہ ہیں غم کریں گے ملک جن کے واسطے — راتیں تڑپ کے کاٹی ہیں اس دن کے واسطے

یہ صبح ہے وہ صبح مبارک ہو جس کی شام — یاں سے ہوا جو کوچ تو ہے خلد میں مقام
کوثر پہ آبرو سے پہنچ جائیں تشنہ کام (۳) لکھے خدا نماز گزاروں میں سب کے نام
سب ہیں وحید عصر یہ غل چار سو اٹھے — دنیا سے جو شہید اٹھے سرخرو اٹھے

یہ سن کے بستروں سے اٹھے وہ خدا شناس — اک اک نے زیب جسم کیا فاخرہ لباس
شانے[3] محاسنوں[4] میں کیے سب نے بے ہراس (۴) باندھے عمامے آئے امام زماں کے پاس
رنگیں عبائیں دوش پہ کمریں کسے ہوئے — مشک و زباد[5] و عطر میں کپڑے بسے ہوئے

سوکھے لبوں پہ حمد الٰہی رخوں پہ نور — خوف و ہراس و رنج و کدورت دلوں سے دور
فیاض و حق شناس و اولوالعزم و ذی شعور (۵) خوش فکر و بذلہ سنج و ہنر پرور و غیور
کانوں کو حسن صوت سے حظ بر ملا ملے — باتوں میں وہ نمک کہ دلوں کو مزا ملے

---

[1] یہ مصرع اس قدیم خیال پر مبنی ہے کہ آفتاب زمین کے گرد گھومتا ہے اور شام کو نگاہوں سے اوجھل ہو کر رات بھر گردش کرنے کے بعد صبح کو پھر نکلتا ہے۔
[2] صبح کی نماز۔ [3] کنگھیاں۔
[4] داڑھی مونچھیں۔ [5] ایک خوشبو۔

ساونت[1] بردبار فلک مرتبت دلیر | عالی منش سبا[2] میں سلیماں وغا میں شیر
(6) گردان دہر ان کی زبردستیوں سے زیر | فاقوں میں دل بھی چشم بھی اور نیتیں بھی سیر
دنیا کو ہیچ و پوچ سراپا سمجھتے تھے | دریا دلی سے بحر کو قطرا سمجھتے تھے

تقریر میں وہ رمز و کنایہ کہ لاجواب | نکتہ بھی منہ سے گر کوئی نکلا تو انتخاب
(7) گویا دہن کتاب بلاغت کا ایک باب | سوکھی زبانیں شہد فصاحت[3] سے کامیاب
لہجوں پہ شاعران عرب تھے مرے ہوئے | پتے لبوں کے وہ جو نمک سے بھرے ہوئے

لب پر ہنسی گلوں سے زیادہ شگفتہ رو | پیدا تنوں سے پیرہن یوسفی[4] کی بو
(8) پرہیزگار و زاہد و ابرار و نیک خو | غلماں[5] کے دل میں جن کی غلامی کی آرزو
پتھر میں ایسے لعل صدف میں گہر نہیں | حوروں کا قول تھا یہ ملک ہیں بشر نہیں

پانی نہ تھا وضو جو کریں وہ فلک جناب | پر تھی رخوں پہ خاک تیمم سے طرفہ آب
(9) باریک ابر میں نظر آتے تھے آفتاب | ہوتے ہیں خاکسار غلام ابوتراب
مہتاب سے رخوں کی صفا اور ہو گئی | مٹی سے آئینوں پہ جلا اور ہو گئی

---

۱ بڑے بہادر۔

۲ انجمن۔ محفل۔ اصل میں یہ ہندی لفظ 'سبھا' ہے، سبا ایک ملک کا نام بھی ہے، جہاں کی ملکہ بلقیس پر حضرت سلیمان عاشق ہو گئے تھے یہاں اس لفظ میں صنعت ایہام ہے۔

۳ اضافت تشبیہی ہے۔ خود لب مراد ہیں۔

۴ حضرت یوسف کا کرتا جس کی خوشبو سے حضرت یعقوب کی آنکھوں میں روشنی آگئی تھی۔

۵ لڑکے۔ نوجوان آدمی۔ نوکر چاکر۔ بہشت کے خوبصورت باشندے یہ غلام کی عربی جمع ہے، مگر اس معنی میں فارسی اور اردو میں واحد کی حیثیت سے مستعمل ہے۔

خیمے سے نکلے شہ کے عزیزان خوش خصال — جن میں کئی تھے حضرت خیر النسا کے لال
(۱۰) قاسم سا گلبدن علی اکبر سا خوش جمال — اک جا عقیل[1] و مسلم[2] و جعفر[3] کے نونہال
سب کے رخوں کا نور سپہر بریں پہ تھا
اٹھارہ[4] آفتابوں کا غنچہ[5] زمیں پہ تھا

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور — دیکھے تو غش کرے ارنی[6] گوئے اوج طور
(۱۱) پیدا گلوں سے قدرت اللہ کا ظہور — وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خوان طیور
گلشن خجل تھے وادی مینو[7] اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس[8] سے

ٹھنڈی ہوائیں سبزۂ صحرا کی وہ لہک — شرمائے جس سے اطلس زنگاری فلک
(۱۲) وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک — ہر برگ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک
ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

قربان صنعت قلم آفریدگار — تھی ہر ورق[9] سے صنعت ترصیع[10] آشکار
(۱۳) عاجز ہے فکر سے شعرائے سبز شعار — ان صنعتوں کو پائے کہاں عقل سادہ کار[11]
عالم تھا محو قدرت رب عباد پر
مینا[12] کیا تھا وادی مینو[13] سواد پر

وہ نور اور وہ دشت سہانا سا وہ فضا — دراج[14] و کبک[15] و تیہو[16] و طاؤس کی صدا
(۱۴) وہ جوش گل وہ نالۂ مرغان خوش نوا — سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا
پھولوں سے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبد[17] گل فروش تھے

---

[1] حضرت علی کے ایک بھائی کا نام [2] حضرت عقیل کے فرزند، امام حسین کے چچا زاد بھائی۔

[3] عون و محمد کے دادا۔ ایک جہاد میں ان کے بازو کٹ گئے تھے تو شہادت کے بعد خدا نے ان کو جواہرات کے پر عطا کیے۔ اس بنا پر وہ جعفر طیار کہلاتے ہیں۔ طیار کے معنی اڑنے والا [4] امام حسین کے اٹھارہ عزیز [5] مجمع

[6] کوہ طور کی بلندی پر ارنی کہنے والا۔ حضرت موسیٰ جو کوہ طور پر جا کر 'رب ارنی' کہا کرتے تھے [7] جس کی اصل بہشت سے ہو یعنی جو بہشت کا ٹکڑا معلوم ہوتی ہو۔ [8] خوشبو [9] درخت کا پتہ [10] ترصیع کے معنی ہیں جواہرات جڑنا۔ عبارت میں جب فقرے یا جملے ایسے لائے جائیں کہ ایک کے الفاظ ترتیب وار دوسرے کے لفظوں کے ہم وزن اور ہم قافیہ ہوں تو اس میں ترصیع کی صنعت ہوتی ہے جو عبارت اس صنعت سے لکھی جائے اسے مرصع کہتے ہیں [11] بغیر جڑاؤ کا سادہ زیور بنانے والا۔ جڑاؤ زیور بنانے والے کو مرصع ساز کہتے ہیں اب ہر مسلمان سنار سادہ کار (سادے کار) کہلاتا ہے۔

[12] سونے چاندی کی چیزوں پر رنگین نقش و نگار [13] بہشت کے نقشے کا [14] تیتر [15] چکور [16] بٹیر [17] ٹوکری۔

(۱۵)
وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار ‌ ‌ پھولوں پہ جابجا وہ گہر ہائے آب دار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار ‌ ‌ بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار[1]
خواہاں تھے نخلِ گلشنِ زہرا[2] جو آب کے ‌ ‌ شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

(۱۶)
وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم ‌ ‌ کوکو کا شور نالۂ حق سرہ[3] کی دھوم
سبحان ربنا[4] کی صدا تھی علی العموم ‌ ‌ جاری تھے وہ جو ان کی عبادت کے تھے رسوم
کچھ گل فقط نہ کرتے تھے ربِ علا کی حمد ‌ ‌ ہر خار کو بھی نوکِ زباں[5] تھی خدا کی حمد

(۱۷)
چیونٹی بھی ہاتھ اٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار ‌ ‌ اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار
یا حی و یا قدیر کی تھی ہر طرف پکار ‌ ‌ تہلیل[6] تھی کہیں کہیں تسبیح[7] کردگار
طائر ہوا میں محو ہرن سبزہ زار میں ‌ ‌ جنگل کے شیر ہونک رہے تھے کچھار میں

(۱۸)
کانٹوں میں اک طرف تھے ریاضِ نبی کے پھول ‌ ‌ خوشبو سے جن کی خلد تھا جنگل کا عرض و طول
دنیا کی زیب و زینت کاشانۂ بتول[8] ‌ ‌ وہ باغ تھا لگا گئے تھے خود جسے رسولؐ
ماہِ عزا کے عشرۂ اول میں کٹ گیا ‌ ‌ وہ باغیوں کے ہاتھ سے جنگل میں کٹ گیا

(۱۹)
اللہ رے خزاں کے دن اس باغ کی بہار ‌ ‌ پھولے سماتے تھے نہ محمدؐ کے گل عذار
دولھا بنے ہوئے تھے اجل تھی گلوں کا ہار ‌ ‌ جاگے وہ ساری رات کے وہ نیند کا خمار
راہیں تمام جسم کی خوشبو سے بس گئیں ‌ ‌ جب مسکرائے پھولوں کی کلیاں کھِل[9] گئیں

---

[1] ہزار بلبل کو بھی کہتے ہیں۔ گل اور ہزار میں ایہام تناسب ہے۔
[2] زہر عربی کا لفظ ہے۔ پھول بالخصوص زرد رنگ کے پھول یہ لفظ واحد اور جمع دونوں کے معنی دیتا ہے۔ زہر اور زہرا میں تجنیس زاید و ناقص ہے۔
[3] اس کا راز حق ہے۔ قمری کی آواز۔
[4] کیا اچھا ہے ہمارا رب۔ رب کے معنی پالنے والا۔
[5] خوب یاد تھی۔ زبان پر جاری تھی۔ [6] "لا الٰہ الا اللہ" کہنا۔ [7] سبحان اللہ کہنا۔
[8] ایسی لڑکی جو عبادت کے شوق میں خانہ داری کی طرف مائل نہ ہو۔ مراد حضرت فاطمہ۔ [9] کھل گئیں۔

وہ دشت اور وہ خیمۂ زنگارگوں کی شان   گویا زمیں پہ نصب تھا اک تازہ آسمان

بے چوبہ سپہر بریں جس کا سائبان   (۲۰) بیت العتیق دیں کا مدینہ جہاں کی جان

اللہ کے حبیب کے پیارے اسی میں تھے
سب عرش کبریا کے تارے اسی میں تھے

گردوں پہ ناز کرتی تھی اس دشت کی زمیں   کہتا تھا آسماں کہ دہم چرخ ہفتمیں

پردے تھے رشک پردۂ چشمان حور عین   (۲۱) تاروں سے تھا فلک اسی خرمن کا خوشہ چیں

دیکھا جو نور شمسۂ کیواں جناب پر
کیا کیا ہنسی ہے صبح گل آفتاب پر

ناگاہ چرخ پر خط ابیض ہوا عیاں   تشریف جا نماز پہ لائے شہ زماں

سجادے بچھ گئے عقب شاہ انس و جاں   (۲۲) صوت حسن سے اکبر مہرو نے دی اذاں

ہر اک کی چشم آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی
گویا صدا رسولؐ کی کانوں میں آ گئی

چلّائے طیور جھومتے تھے وجد میں شجر   تسبیح خواں تھے برگ و گل و غنچہ و ثمر

محو ثنا کلوخ و نباتات دشت و در   (۲۳) پانی سے منہ نکالے تھے دریا کے جانور

اعجاز تھا کہ دلبر شبیر کی صدا
ہر خشک و تر سے آتی تھی تکبیر کی صدا

۱؎ بغیر چوبوں کا خیمہ۔ ۲؎ قدیم مکان۔ مراد خانہ کعبہ ایک روایت ہے کہ طوفان نوح میں خانہ کعبہ کے سوا ساری دنیا غرق ہو گئی تھی۔ ۳؎ شہر عرب کا ایک مشہور شہر جو پیغمبر اسلام کا مسکن و مدفن ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی نہایت مقدس زیارت گاہ ہے ۴؎ آسمان سات ہیں۔ ان کے اوپر آٹھویں کرسی اور اس کے اوپر نواں عرش ہے جو سب سے زیادہ بلند ہے امام حسین کے خیمہ کا مرتبہ عرش سے بھی بلند ہے اس لیے ساتواں آسمان اس کو عرش سے بالاتر ایک اور آسمان سمجھتا ہے۔

۵؎ شمسہ = کلس۔ کیواں = زحل۔ جناب = چوکھٹ۔ شمسہ کیواں جناب کے معنی ہیں اتنا اونچا کلس جس کی چوکھٹ یعنی نیچے کا حصہ زحل کے برابر ہے۔ زحل بہت بلند ستارہ ساتویں آسمان پر ہے۔

۶؎ اضافت تشبیہی۔ مراد خود آفتاب۔ سورج مکھی کے پھول کو بھی کہتے ہیں۔

۷؎ سفید لکیر۔ یہ صبح صادق کی علامت ہے۔ جو نماز صبح کا وقت ہے۔

۶۔ آواز کا حسن و قرأت کی تعریف ۔ غزل ۔ وہ خوش بیانیاں

ناموس شاہ روتے تھے خیمے میں زار زار | چپکی کھڑی تھی صحن میں بانوئے نامدار
زینب بلائیں لے کے یہ کہتی تھی بار بار | (۲۴) صدقے نمازیوں کے موذن کے میں نثار
کرتے ہیں یوں ثنا وصفت ذوالجلال کی | لوگو اذاں سنو مرے یوسف جمال کی

یہ حسن صوت اور یہ قرأت[1] یہ شد و مد[2] | حقا کہ افصح الفصحا ہے انھیں کا جد[3]
گویا ہے لحن حضرت داؤد[4] باخرد | (۲۵) یا رب رکھ اس صدا کو زمانے میں تا ابد
شعبے صدا[5] میں پنکھڑیاں[6] جیسے پھول میں | بلبل چہک رہا ہے ریاض رسولؐ میں
میری طرف سے کوئی بلائیں تو لینے جائے | عین[7] الکمال سے تجھے بچے خدا بچائے
وہ خوش[8] بیانی کہ جس کی طلاقت[9] دلوں کو بھائے | (۲۶) دو دن میں ایک بوند بھی پانی کی وہ نہ پائے
غربت میں پڑ گئی ہے مصیبت حسینؑ پر | فاقہ یہ تیسرا ہے مرے نور عین پر
صف میں ہوا جو نعرۂ قد قامت[10] الصلوٰۃ | قائم ہوئی نماز اٹھے شاہ کائنات
وہ نور کی صفیں وہ مصلی ملک صفات | (۲۷) قدموں سے جس کے ملتی تھیں آنکھیں رہ نجات
جلوہ تھا تا بہ عرش معلیٰ حسینؑ کا | مصحف کی لوح[11] تھی کہ مصلا حسینؑ کا

---

[1] پڑھنا۔ بالخصوص قرآن کو صحیح تلفظ اور صحیح لہجے سے پڑھنا۔ [2] آواز کا چڑھاؤ اور کھنچاؤ۔
[3] حضرت علی اکبر کے دادا حضرت علی خوش بیانی اور طلاقت میں بے نظیر تھے۔
[4] حضرت داؤد پیغمبر ایسے خوش الحان تھے کہ آپ کی آواز سن کر وحشی جانور اور چڑیاں تک آپ کے گرد جمع ہو جاتی تھیں۔ [5] شاخیں۔ صدا کے شعبوں سے مختلف سُر مراد ہیں۔
[6] آواز کے اتار چڑھاؤ میں ایسا دلکش تناسب ہے جیسا پھول کی پنکھڑیوں میں ہوتا ہے۔
[7] نظر بد۔ [8] خوش تقریر۔ بذلہ سنج۔ حاضر جواب۔ [9] خوش بیانی۔
[10] نماز قائم ہو گئی ہے۔ نماز سے پہلے اذاں دی جاتی ہے جس کو سن کر مسجد میں لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد اقامت کہی جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب نماز شروع ہوتی ہے۔ اقامت میں جو فقرے کہے جاتے ہیں۔ ان میں "قد قامت الصلوٰۃ" بھی ہے۔
[11] کتاب کے پہلے صفحے کی پیشانی جس پر طلائی اور رنگین نقش و نگار ہوں۔

قرآں کھلا ہوا کہ جماعت کی تھی نماز — بسم اللہ آگے جیسے ہو یوں تھے شہ حجاز
سطریں تھیں یا صفیں عقب شاہ سرفراز (۲۸) کرتی تھی خود نماز بھی ان کی ادا[1] پہ ناز
صفحے تھے سحر بیاض پہ بین السطور کی — سب آیتیں تھیں مصحف ناطق کے نور کی

باہم مکبروں[2] کی صدائیں وہ دل پسند — کرّو بیان[3] عرش[4] تھے سب جن سے بہرہ مند
ایماں کا نور چہروں پہ تھا چاند سے دو چند (۲۹) خوف خدا سے کانپتے تھے سب کے بند بند
خم گردنیں تھیں سب کی خضوع[5] و خشوع[6] میں — سجدوں میں چاند تھے مہ نو تھے رکوع[7] میں

اک صف میں سب محمدؐ و حیدرؑ کے رشتہ دار — اٹھارہ نوجواں ہیں اگر کیجیے شمار
پر سب وحید عصر و حق آگاہ و خاکسار (۳۰) پیرو امام[8] پاک کے دانائے روزگار
تسبیح ہر طرف تہ افلاک انھیں کی ہے — جس پر درود پڑھتے ہیں یہ خاک[8] انھیں کی ہے

دنیا سے اٹھ گیا وہ قیام اور وہ قعود — ان کے لیے تھی بندگی واجب الوجود[9]
وہ عجز وہ طویل رکوع اور وہ سجود (۳۱) طاعت میں نیست جانتے تھے اپنی ہست و بود
طاقت نہ چلنے پھرنے کی تھی ہاتھ پاؤں میں — گر گر کے سجدے کرتے تھے تیغوں کی چھاؤں میں

---

[1] ادا اور ناز میں صنعت ایہام تناسب ہے۔ [2] تکبیر یعنی اللہ اکبر کہنے والے۔
[3] کرّوبی کی جمع۔ فرشتے۔ [4] عاجزی۔ انکسار [5] آنکھیں نیچی کرنا۔ انکسار۔
[6] نماز میں اس طرح جھکنا کہ ہتھیلیاں گھٹنوں کو چھوئیں۔
[7] امام، دانا، تسبیح = دانا اور دانہ تلفظ میں یکساں ہیں اور تسبیح میں امام بھی ہوتا ہے اور دانہ بھی۔ اس طرح یہاں ایہام تناسب کی ایک خاص صورت پیدا ہو گئی ہے۔
[8] کربلا کی مٹی سے تسبیحیں بنتی ہیں اور ان پر درود پڑھا جاتا ہے۔
[9] وہ ذات جس سے وجود کی صفت علیحدہ نہیں ہو سکتی۔ جو ہمیشہ موجود تھی اور ہمیشہ موجود رہے گی۔ یعنی خدا۔

ہاتھ ان کے جب قنوت[1] میں اٹھے سوئے خدا
خود ہو گئے فلک پہ اجابت کے باب وا
تھرائے آسمان ہلا عرشِ کبریا
(۳۲) شہپر تھے دونوں ہاتھ پے طائرِ دعا
وہ خاکسار محو تضرع تھے فرش پر
رُوح القدس[2] کی طرح دعائیں تھیں عرش پر

فارغ ہوئے نماز سے جب قبلۂ انام
آئے مصافحے کو جوانانِ تشنہ کام
چومے کسی نے دستِ شہنشاہِ خاص و عام
(۳۳) آنکھیں ملیں کسی نے قدم پر باحترام
کیا دل تھے کیا سپاہ رشید[3] و سعید تھی
باہم معانقے[4] تھے کہ مرنے کی عید تھی

سجدے میں شکر کے تھا کوئی مرد باخدا
پڑھتا تھا کوئی حزن سے قرآں کوئی دعا
نعت نبی کہیں تھی کہیں حمد کبریا
(۳۴) مولا اٹھا کے ہاتھ یہ کرتے تھے التجا
فاقوں میں تشنہ کامی و غربت پہ رحم کر
یارب مسافروں کی جماعت پہ رحم کر

زاری تھی التجا تھی مناجات تھی ادھر
واں صف کشی و ظلم و تعدی و شور و شر
کہتا تھا ابن سعد یہ جا جا کے نہر پر
(۳۵) گھاٹوں سے ہوشیار ترائی سے باخبر
دو روز سے ہے تشنہ دہانی حسینؑ کو
ہاں مرتے دم بھی دیجو نہ پانی حسین کو

بیٹھے تھے جا نماز پہ شاہ فلک سریر
ناگہ قریب آکے گرے تین چار تیر
دیکھا ہر اک نے مڑ کے سوئے لشکر شریر
(۳۶) عباسؑ اٹھے تول کے شمشیر بے نظیر
پروانہ تھے سراج[5] امامت کے نور پر
روکی سپر حضور کرامت ظہور پر

---

[1] عبادت۔ بندگی۔ دعا۔ نیازمندی۔ مذہبی اصطلاح میں نماز کی دوسری رکعت میں رکوع سے پہلے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا یا پڑھنا۔ [2] پاک روح۔ جبرئیل۔
[3] بہادر۔ ہمت ور۔ ’شاگرد‘ کی صفت ’رشید‘ اکثر لاتے ہیں۔ وہاں رشید کے معنی ہوتے ہیں باصلاحیت ’کامل‘۔
[4] لپٹانا۔ گلے لگانا۔ گلے ملنا۔
[5] چراغ۔

اکبر سے مڑ کے کہنے لگے سرور زماں
باندھے ہے سرکشی پہ کمر لشکر گراں
تم جا کے کھودو خیمے میں اے پدر کی جاں (۳۷) بچوں کو لے کے صحن سے ہٹ جائیں بیبیاں
غفلت میں تیر سے کوئی بچہ تلف نہ ہو
ڈر ہے مجھے کہ گردن اصغر ہدف نہ ہو

کہتے تھے یہ پسر سے شہ آسماں سریر
فضہ پکاری ڈیوڑھی سے اے خلق کے امیر
ہو ہو علی کی بیٹیاں کس جا ہوں گوشہ گیر (۳۸) اصغر کے گاہوارے تک آ کر گرے ہیں تیر
گرمی میں ساری رات یہ گھٹ گھٹ کے رہتے ہیں
بچے ابھی تو سرد ہوا پا کے سوئے ہیں

باقر[1] کہیں پڑا ہے سکینہ کہیں ہے غش
گرمی کی فصل، یہ تب و تاب اور یہ عطش
رو رو کے سو گئے ہیں صغیران ماہ وش (۳۹) بچوں کو لے کے یاں سے کہاں جائیں فاقہ کش
یہ کس خطا پہ تیر پیاپے برستے ہیں
ٹھنڈی ہوا کے واسطے بچے ترستے ہیں[2]

اٹھے یہ شور سن کے امام فلک وقار
ڈیوڑھی تک آئے ڈھالوں کو روکے رفیق و یار
فرمایا مڑ کے چلتے ہیں اب بہر کارزار (۴۰) کمریں کسو جہاد پہ منگواؤ راہوار
دیکھیں فضا بہشت کی دل باغ باغ ہو
امت کے کام سے کہیں جلدی فراغ ہو

فرما کے یہ حرم میں گئے شاہ بحر و بر
ہونے لگیں صفوں میں کمر بندیاں ادھر
جوشن پہن کے حضرت عباس نامور (۴۱) دروازے پر ٹہلنے لگے مثل شیر نر
پرتو سے رخ کے برق چمکتی تھی خاک پر
تلوار ہاتھ میں تھی سپر دوش پاک پر

---

[1] امام حسین کے پوتے، حضرت سجاد کے فرزند، آئمہ اثنا عشر میں پانچویں امام، جو کربلا میں بچے تھے۔

[2] کیونکہ تیروں کی بارش کی وجہ سے باہر نہیں نکل سکتے۔

شوکت میں رشک تاج سلیماں تھا خود سر   کلغی پہ لاکھ بار تصدق ہما کے پر
(۴۲) دستانے دونوں فتح کے مسکن ظفر کے گھر   وہ رعب الاماں[1] وہ تہور کہ الحذر[2]
جب ایسا بھائی ظلم کی تیغوں میں آڑ ہو   پھر کس طرح نہ بھائی کی چھاتی پہاڑ[3] ہو

خیمے میں جا کے شہ نے یہ دیکھا حرم کا حال   چہرے تو فق ہیں اور کھلے ہیں سروں کے بال
(۴۳) زینب کی یہ دعا ہے کہ اے رب ذوالجلال   بچ جائے اس فساد سے خیر النسا کا لال
بانوے نیک نام کی کھیتی ہری رہے   صندل سے مانگ بچوں سے[4] گودی بھری رہے

آفت میں ہے مسافر صحرائے کربلا   بیکس پہ یہ چڑھائی ہے سید پہ یہ جفا
(۴۴) غربت میں ٹھن گئی جو لڑائی تو ہوگا کیا   ان ننھے ننھے بچوں پہ کر رحم اے خدا
فاقوں سے جان لب پہ ہے عطش سے ہلاک ہیں   یا رب ترے رسول کی یہ آل پاک ہیں

سر پر نہ اب علیؑ نہ رسولؐ فلک وقار   گھر لٹ گیا گزر گئیں خاتون روزگار
(۴۵) اماں کے بعد روئی حسنؑ کو میں سوگوار   دنیا میں اب حسین ہے ان سب کا یادگار
تو داد دے مری کہ عدالت پناہ ہے   کچھ اس پہ بن گئی تو یہ مجمع تباہ ہے

بولے قریب جا کے شہ آسماں جناب   مضطر نہ ہو دعائیں ہیں تم سب کی مستجاب
(۴۶) مغرور ہیں خطا پہ ہیں یہ خانماں خراب   خود جا کے میں دکھاتا ہوں ان کو رہ صواب
موقع نہیں بہن ابھی فریاد و آہ کا   لاؤ تبرکات رسالت پناہ کا

معراج میں رسولؐ نے پہنا تھا جو لباس   کشتی میں لائیں زینب اسے شاہ دیں کے پاس
(۴۷) سر پہ رکھا عمامۂ سردار حق شناس   پہنی قبائے پاک رسول فلک اساس
بر میں درست چست تھا جامہ رسولؐ کا   رومال فاطمہؑ کا عمامہ رسولؐ کا

---

[1] پناہ۔ خدا کی پناہ۔ خوف کا اظہار مقصود ہے۔
[2] 'حذر' کے معنی ہیں بھاگنا۔ بچنا۔ خوف۔ الحذر کلمۂ خوف ہے۔
[3] دل قوی ہو۔
[4] جمع کا صیغہ واحد کے طور پہ استعمال کیا گیا ہے۔

ے کے دوسرے جو چھٹے تھے بصد وقار ۔۔۔ ثابت یہ تھا کہ دوش پہ گیسو پڑے ہیں چار
کھا رہا تھا زلف سمن بو کا تار تار ۔۔۔ (۴۸) جس کے ہر ایک مو پہ خطا و ختن نثار
مشک و عبیر و عود اگر ہیں تو ہیچ ہیں
سنبل پہ کیا کھلیں گے یہ گیسو کے پیچ ہیں

ول سے آ رہی تھی رسول زمن کی بو ۔۔۔ دولھا نے سونگھی ہوگی نہ ایسی دلھن کی بو
ہر کی فاطمہ کی حسین و حسن کی بو ۔۔۔ (۴۹) پھیلی ہوئی تھی چار طرف پنجتن کی بو
لٹتا تھا عطر وادی عنبر سرشت میں
گل جھومتے تھے باغ میں رضوان بہشت میں

شاک جب پہن چکے جس دم شہ زمن ۔۔۔ لے کر بلائیں بھائی کے رونے لگی بہن
لائی ہائے آج نہیں حیدر و حسن ۔۔۔ (۵۰) اماں کہاں سے لائے تمھیں اب یہ بے وطن
رخصت ہے اب رسول کے یوسف جمال کی
صدقے گئی بلائیں تو لو اپنے لال کی

ندوق اسلحہ کے جو کھلوائے شاہ نے ۔۔۔ پٹکا منھ اپنا زینب عصمت پناہ نے
ہی زرہ امام فلک بارگاہ نے ۔۔۔ (۵۱) بازو پہ جوشنین[1] پڑھے عز و جاہ نے
جوہر بدن کے حسن سے سارے چمک گئے
حلقے تھے جتنے اتنے ستارے چمک گئے

اد آ گئے علی نظر آئی جو ذوالفقار ۔۔۔ قبضے کو چوم کر شہ دیں روئے زار زار
ولی جو لے کے ہاتھ میں شمشیر آبدار ۔۔۔ (۵۲) شوکت نے دی صدا کہ تری شان کے نثار
فتح و ظفر قریب ہو نصرت قریب ہو
زیبا اسکی تجھ کو ضرب عدو کو نصیب ہو

باندھی کمر سے تیغ جو زہرا کے لال نے ۔۔۔ پھاڑا فلک پہ اپنا گریباں ہلال نے
دستانے پہنے سرور قدسی خصال نے ۔۔۔ (۵۳) معراج پائی دوش پہ حمزہ کی ڈھال نے
رتبہ بلند تھا کہ سعادت نشان تھی
ساری سپر میں مہر نبوت[2] کی شان تھی

---

[1] آفتوں سے محفوظ رہنے کی دو دعائیں، جوشن صغیر اور جوشن کبیر۔

[2] پیغمبر اسلامؐ کے شانے پر ایک قدرتی نشان تھا جو آپ کے نبی ہونے کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

ہتھیار اِدھر لگا چکے آقائے خاص و عام / تیار اُدھر ہوا علم سیدالانام
کھولے سروں کو گرد تھیں سیدانیاں تمام (۵۴) روتی تھی تھامے چوبِ علم خواہرِ امام
تیغیں کمر میں دوش پہ شملے پڑے ہوئے / زینب کے لال زیرِ علم آ کھڑے ہوئے

گردانے دامنوں کو قبا کے وہ گُل عذار / مرفق[1] تک آستینوں کو الٹے بصد وقار
جعفر کا رعب و دبدبۂ شیرِ کردگار (۵۵) بوٹے سے ان کے قد پہ نمودار و نامدار
آنکھیں ملیں علم کے پھریرے کو چوم کے / رایت کے گرد پھرنے لگے جھوم جھوم کے

گہ[2] ماں کو دیکھتے تھے کبھی جانبِ علم / نعرہ کبھی یہ تھا کہ نثارِ شہِ اُمم
کرتے تھے دونوں بھائی کبھی مشورے بہم (۵۶) آہستہ پوچھتے کبھی ماں سے وہ ذی حشم
کیا قصد ہے علیِ ولی کے نشان کا / اماں کسے ملے گا علم نانا جان کا

کچھ مشورہ کریں جو شہنشاہِ خوش خصال / ہم بھی محق[3] ہیں آپ کو اس کا رہے خیال
پاسِ ادب سے عرض کی ہم کو نہیں مجال (۵۷) اس کا بھی خوف ہے کہ نہ ہو آپ کو ملال
آقا کے ہم غلام ہیں اور جاں نثار ہیں / عزت[4] طلب ہیں نام کے امیدوار ہیں

---

۱ کہنی۔ ۲ یعنی علم کے خواہش مند تھے اور ماں سے سفارش کے امیدوار تھے۔ ظاہری حرکتوں سے دلی خیالوں کے اظہار کی یہ بہت اچھی مثال ہے۔ ۳ حق دار۔ یہ لفظ عربی ہے۔ مگر عربی میں اس معنی میں نہیں آتا۔

۴ علامہ آزاد مرحوم 'سخندانِ فارس' میں لکھتے ہیں "یہ لفظ عالمِ طفولیت میں اکثر شرفا کے باب میں سنا کرتا تھا جو شخص کہ سامان، لباس، اخلاق، اطوار، عادات اور معاشرت احباب میں ہمیشہ ایسی حالت کے ساتھ رہے، جس سے حکام اور خاص و عام اس کے ساتھ بعزت پیش آئیں، اسے تعریف کے ساتھ کہتے تھے کہ فلاں شخص عزت طلب آدمی ہے . . . . اب مدت سے متروک ہے" 'عزت طلب' کی طرح 'آبرو طلب' بھی مستعمل تھا۔ میر شیر علی افسوس کہتے ہیں؎

مکان اس کو نہیں دہر میں بجز تہِ آب
جو کوئی مثلِ گہر آبرو طلب ہے گا

بے مثل تھے رسول کے لشکر کے سب جواں
لیکن ہمارے جد[1] کو نبی نے دیا نشاں
خیبر میں دیکھتا رہا سب لشکر گراں
(۵۸) پایا مگر علی نے علم وقت امتحاں
طاقت میں کچھ کمی نہیں گو بھوکے پیاسے ہیں
پوتے انھیں[2] کے تم ہو انھیں[3] کے نواسے ہیں

زینب نے تب کہا کہ تمھیں اس سے کیا ہو کام
کیا دخل مجھ کو مالک و مختار ہیں امام
دیکھو نہ کیجیو بے ادبانہ کوئی کلام
(۵۹) بگڑوں گی میں جو لوگے زباں سے علم کا نام
لو جاؤ بس کھڑے ہو الگ ہاتھ جوڑ کے
کیوں آئے تم یہاں علی اکبر کو چھوڑ کے

سر کو ہٹو بڑھو نہ کھڑے ہو علم کے پاس
ایسا نہ ہو کہ دیکھ لیں شاہ فلک اساس
کھوتے ہو اور آئے ہوئے تم مرے حواس
(۶۰) بس قابل قبول نہیں ہے یہ التماس
رونے لگوگے پھر جو برا یا بھلا کہوں
اس ضد کو بچپنے کے سوا اور کیا کہوں

عمریں قلیل اور ہوس منصب جلیل
اچھا نکالو قد کے بھی بڑھنے کی کچھ سبیل
ماں صدقے جائے گرچہ یہ ہمت کی ہے دلیل
(۶۱) ہاں اپنے ہم سنوں میں تمھارا نہیں عدیل
لازم ہے سوچے غور کرے پیش و پس کرے
جو ہو سکے نہ کیوں بشر اسکی ہوس کرے

ان ننھے ننھے ہاتھوں سے اٹھے گا یہ علم
چھوٹے قدوں میں سب سے سنوں میں سبھوں سے کم
نکلیں تنوں سے سبط نبی کے قدم پہ دم
(۶۲) عہدہ یہی ہے بس یہی منصب یہی حشم
رخصت طلب اگر ہو تو یہ میرا کام ہے
ماں صدقے جائے آج تو مرنے میں نام ہے

پھر تم کو کیا بزرگ تھے گر فخر روزگار
زیبا نہیں ہے وصف اضافی پہ افتخار
جوہر وہ ہیں جو تیغ کرے آپ آشکار
(۶۳) دکھلا دو آج حیدر و جعفر کی کارزار
تم کیوں کہو کہ لال خدا کے ولی کے ہیں
فوجیں پکاریں خود کہ نواسے علی کے ہیں

---

[1] یعنی جعفر طیّار۔

[2] اس ضمیر کا مرجع مصرع دوم میں 'ہمارے جد' ہیں۔

[3] اس ضمیر کا مرجع مصرع چہارم میں 'علی' ہے۔

(۶۴)
کیا کچھ علم سے جعفر طیار کا تھا نام — یہ بھی تھی اک عطائے رسول فلک مقام
بگڑی لڑائیوں میں بن آئے انھیں سے کام — جب کھینچتے تھے تیغ تو ہلتا تھا روم و شام
بے جاں ہوئے تو نخل وغا نے ثمر دیئے — ہاتھوں کے بدلے حق نے جواہر کے پر دیئے

(۶۵)
لشکر نے تین روز ہزیمت[۱] اٹھائی جب — بخشا علم رسول خدا نے علی کو تب
مرحب کو قتل کر کے بڑھا جب وہ شیر رب — در بند کر کے قلعے کا بھاگی سپاہ سب
اکھڑا وہ یوں گراں تھا جو در سنگ سخت سے — جس طرح توڑ لے کوئی پتا درخت سے

(۶۶)
نرغے میں تین دن سے ہے مشکل کشا کا لال — اماں کا باغ ہوتا ہے جنگل میں پائمال
پوچھا نہ یہ کہ کھولے ہیں کیوں تم نے سر کے بال — میں لٹ رہی ہوں اور تمھیں منصب کا ہے خیال
غمخوار تم مرے ہو نہ عاشق امام کے — معلوم ہو گیا مجھے طالب ہو نام کے

(۶۷)
ہاتھوں کو جوڑ جوڑ کے بولے وہ لالہ فام — غصے کو آپ تھام لیں اے خواہر امام
واللہ کیا مجال جو لیں اب علم کا نام — کھل جائے گا لڑیں گے جو یہ باوفا غلام
فوجیں بھگا کے گنج شہیداں میں سوئیں گے — تب قدر ہوگی آپکو جب ہم نہ ہوئیں گے

(۶۸)
یہ کہہ کے بس ہٹے جو سعادت نشاں پسر — چھاتی بھر آئی ماں کی کہا تھام کر جگر
دیتے ہو اپنے مرنے کی پیارو مجھے خبر — ٹھہرو ذرا بلائیں تو لے لے یہ نوحہ گر
کیا صدقے جاؤں ماں کی نصیحت بری لگی — بچو یہ کیا کہا کہ جگر پر چھری لگی

(۶۹)
زینب کے پاس آکے یہ بولے شہ زمن — کیوں تم نے دونوں بیٹوں کی باتیں سنیں بہن!
شیروں کے شیر عاقل و جرار و صف شکن — زینب وحید عصر ہیں دونوں یہ گل بدن
یوں دیکھنے کو سب میں بزرگوں کے طور ہیں — تیور ہی انکے اور ارادے ہی اور ہیں

---

[۱] شکست۔ ہار

نو دس برس کے سن میں یہ جرأت یہ ولولے
بچے کسی نے دیکھے ہیں ایسے بھی من چلے
اقبال کیونکر ان کے نہ قدموں سے منھ ملے
(۱۰) کس گود میں بڑھے ہوئے کس دودھ سے پلے
بیشک یہ ورثہ دار جناب امیر ہیں
پر کیا کروں کہ دونوں کی عمریں صغیر ہیں

اب تم جسے کہو اسے دیں فوج کا علم
کی عرض جو صلاح شہ آسماں حشم
فرمایا جب یہ اٹھ گئیں زہرائے باکرم
(۱۱) اس دن سے تم کو ماں کی جگہ جانتے ہیں ہم
مالک ہو تم بزرگ کوئی ہو کہ خرد ہو
جس کو کہو اسی کو یہ عہدہ سپرد ہو

بولی بہن کہ آپ بھی تو لیں کسی کا نام
ہے کس طرف توجہ سردار خاص و عام
قرآن[1] کے بعد ہو تو ہو بس آپ کا کلام
(۱۲) گر مجھ سے پوچھتے ہیں شہ آسماں مقام
شوکت میں قد میں شان میں ہمسر[2] کوئی نہیں
عباس نامدار سے بہتر کوئی نہیں

عاشق، غلام، خادم دیرینہ، جاں نثار
فرزند، بھائی، زینت پہلو، وفا شعار
راحت رساں، مطیع، نمودار، نام دار
(۱۳) جرار، یادگار پدر، فخر روزگار
صفدر ہے، شیر دل ہے، بہادر ہے، نیک ہے
بے مثل سیکڑوں میں ہزاروں میں ایک ہے

آنکھوں میں اشک بھر کے یہ بولے شہ زمن
ہاں تھی یہی علی کی وصیت بھی اے بہن
اچھا بلائیں آپ کدھر ہے وہ صف شکن
(۱۴) اکبر چچا کے پاس گئے سن کے یہ سخن
کی عرض انتظار ہے شاہ غیور کو
چلیے پھپھی نے یاد کیا ہے حضور کو

عباس آئے ہاتھوں کو جوڑے حضور شاہ
جاؤ بہن کے پاس یہ بولا وہ دیں پناہ
زینب وہیں علم لیے آئیں بہ عز و جاہ
(۱۵) بولے نشاں کو لے کے شہ عرش بارگاہ
انکی خوشی وہ ہے جو رضا پنجتن کی ہے
لو بھائی لو علم یہ عنایت بہن کی ہے

۱؎ خدا کے کلام کے بعد سب سے بڑا مرتبہ آپ کے کلام کا ہے۔ اس لیے کہ آپ امام وقت ہیں۔
۲؎ بے نظیر۔ جس کا سا کوئی اور نہیں ہے۔

رکھ کر علم پہ ہاتھ جھکا وہ فلک وقار
ہمشیر کے قدم پہ ملا منھ بہ افتخار
زینب بلائیں لے کے یہ بولیں کہ میں نثار
(۷۶) عباس فاطمہ کی کمائی سے ہوشیار
ہو جائے آج صلح کی صورت تو کل چلو
ان آفتوں سے بھائی کو لے کر نکل چلو

کی عرض نیزے جسم پہ جس وقت تک ہے سر
ممکن نہیں ہو یہ کہ بڑھے فوج بدگہر
تیغیں کھنچیں جو لاکھ تو سینہ کروں سپر
(۷۷) دیکھیں اٹھا کے آنکھ یہ کیا تاب کیا جگر
ساونت ہیں پسر اسد ذوالجلال کے
گر شیر ہو تو پھینک دیں آنکھیں نکال کے

منھ کر کے سوئے قبر علی پھر کیا خطاب
ذرے کو آج کر دیا مولا نے آفتاب
یہ عرض خاکسار کی ہے یا ابو تراب
(۷۸) آقا کے آگے ہوں میں شہادت سے کامیاب
سر تن سے ابن فاطمہ کے روبرو گرے
شبیر کے پسینے پہ میرا لہو گرے

یہ سن کے آئی زوجۂ عباس نامور
شوہر کی سمت پہلے کنکھیوں سے کی نظر
لیں سبط مصطفٰے کی بلائیں بہ چشم تر
(۷۹) زینب کے گرد پھر کے یہ بولی وہ نوحہ گر
فیض آپ کا ہو اور تصدق امام کا
عزت بڑھی کنیز کی رتبہ غلام کا

سر کو لگا کے بھائی سے زینب نے یہ کہا
تو اپنی مانگ کوکھ سے ٹھنڈی رہے سدا
کی عرض مجھ سی لاکھ کنیزیں ہوں تو فدا
(۸۰) بانوئے نامور کو سہاگن رکھے خدا
بچے جئیں ترقی اقبال و جاہ ہو
سائے میں آپ کے علی اکبر کا بیاہ ہو

قسمت وطن میں خیر سے پھر سب کو لیکے جائے
یثرب میں شور ہو کہ سفر سے حسین آئے
ام البنین[1] جاہ و حشم سے پسر کو پائے
(۸۱) جلدی شب عروسی اکبر خدا دکھائے
مہندی تمھارا لال ملے ہاتھ پاؤں میں
لاؤ دولھن کو بیاہ کے تاروں[2] کی چھاؤں میں

---

[1] حضرت عباسؑ کی مادر گرامی۔
[2] پچھلی رات کو صبح سے کچھ پہلے۔ دلھنیں سسرال میں پہلے پہل اکثر اسی وقت آتی ہیں۔

ناگاہ آکے بالی سکینہ نے یہ کہا — کیسا ہے یہ ہجوم کدھر ہیں مرے چچا
عہدہ علم کا ان کو مبارک کرے خدا (۸۲) لوگو مجھے بلائیں تو لینے دو اک ذرا
شوکت خدا بڑھائے مرے عمو جان کی — میں بھی تو دیکھوں شان علی کے نشان[۱] کی

عباس مسکرا کے پکارے کہ آؤ آؤ — عمو نثار پیاس سے کیا حال ہے بتاؤ
بولی لپٹ کے وہ کہ مری مشک لیتے جاؤ (۸۳) اب تو علم ملا تمھیں پانی مجھے پلاؤ
تحفہ نہ کوئی دیجیے نہ انعام دیجیے — قربان جاؤں پانی کا اک جام دیجیے

باتوں پہ اسکی روتی تھیں سیدانیاں تمام — کی عرض آکے ابن حسن نے کہ یا امام
انبوہ ہے بڑھی چلی آتی ہے فوج شام (۸۴) فرمایا آپ نے کہ نہیں لشکر کا مقام
عباس اب علم لیے باہر نکلتے ہیں — ٹھہرو بہن سے مل کے گلے ہم بھی چلتے ہیں

ناگہ بڑھے علم لیے عباس باوفا — دوڑے سب اہلبیت کھلے سر برہنہ پا
حضرت نے ہاتھ اٹھا کے یہ ایک ایک سے کہا (۸۵) لو الوداع اے حرم پاک مصطفےٰ
صبح شب فراق ہے پیاروں کو دیکھ لو — سب مل کے ڈوبتے ہوئے تاروں کو دیکھ لو

شہ کے قدم پہ زینب زار و حزیں گری — بانو پچھاڑ کھا کے پسر کے قریں گری
کلثوم تھرتھرا کے بہ روئے زمیں گری (۸۶) باقر کہیں گرا تو سکینہ کہیں گری
اجڑا چمن ہر اک گل تازہ نکل گیا — نکلا علم کہ گھر سے جنازہ نکل گیا

دیکھی جو شان حضرت عباس عرش جاہ — آگے ہوئی علم کے پس از تہنیت سپاہ
نکلا حرم سرا سے دو عالم کا بادشاہ (۸۷) نشتر بدل تھی بیت علی کی فغان و آہ
رو رو کے اشک ملتے تھے رخ جناب سے — شبنم ٹپک رہی تھی گل آفتاب سے

۱؎ علی کا نشان ۔ یہاں دو معنی دیتا ہے ۔ ایک حضرت علی کا علم اور دوسرے حضرت عباس جو حضرت علی کے صاحبزادے اور بہادری میں اپنے پدر بزرگوار کی یادگار تھے 'شان' اور 'نشان' میں تجنیس زائد و ناقص ہے ۔

مولا چڑھے فرس پہ محمد کی شان سے
ترکش لگایا ہرنے پہ کس آن بان سے
نکلا یہ جن و انس و ملک کی زبان سے
(۸۸) اترا ہے پھر زمیں پہ براق آسمان سے
سارا چلن خرام میں کبک دری کا ہے
گھونگھٹ نئی دلھن کا ہے چتون پری کا ہے

غنچے میں انکھڑیوں کے ابلنے کو دیکھیے
بن بن کے جھوم جھوم کے چلنے کو دیکھیے
سانچے میں جوڑ بند کے ڈھلنے کو دیکھیے
(۸۹) تھم کر کنوتیوں کے بدلنے کو دیکھیے
گو دنیں ڈالیں ہاتھ یہ پریوں کو شوق ہو
بالادستی میں اسکو ہما پر بھی فوق ہے

تھم کر ہوا جو فرس خوش قدم بڑھا
جوں جوں وہ سوئے دشت بڑھا اور دم بڑھا
گھوڑوں کی لیں سواروں نے باگیں علم بڑھا
(۹۰) رایت بڑھا کہ سرو ریاض ارم بڑھا
پھولوں کولے کے باد بہاری پہنچ گئی
بستاں کو بلا میں سواری پہنچ گئی

پنجہ ادھر چمکتا تھا اور آفتاب ادھر
اس کی ضیا تھی خاک پہ ضو اسکی عرش پر
زرریزی علم پہ ٹھہرتی نہ تھی نظر
(۹۱) دولھا کا رخ تھا سونے کے سہرے میں جلوہ گر
تھے دو طرف جو دو علم اس ارتفاع کے
الجھے ہوئے تھے تار خطوط شعاع کے

اللہ ری سپاہ خدا کی شکوہ و شان
بھٹکنے لگے جنود ضلالت کے بھی نشان
کریں کسے علم کے تلے ہاشمی جوان
(۹۲) دنیا کی زیب دین کی عزت جہاں کی جاں
ایک ایک دودمان علی کا چراغ تھا
جنکو بہشت پر تھا تفوق وہ باغ تھا

لڑکے وہ سات آٹھ بھی قد سمن عذار
گیسو کسی کے چہرے پہ دو اور کسی کے چار
حیدر کا رعب نرگسی آنکھوں سے آشکار
(۹۳) کھیلیں تو نیچوں سے کریں شیر کو شکار
تیور لسی کی سمت چاند سے سینے تنے ہوئے
آئے تھے عید گاہ میں دولھا بنے ہوئے

فقرہ ۶ پیچ (پیچ) جو گھوڑوں کی رفتار سے تھا
بالادستی اور بالا کی بہشت تھا

دوزخ

دیکھو عباس زینت اور باغ تھا

---

۱ ہرنا گھوڑے کی کاٹھی کا اگلا محراب نما حصہ ۔ ۲ دوڑ میں آگے رہنا ۔ تیز رفتاری
۳ علم کے چمکتے ہوے پنجے پر جب آفتاب کی شعاعیں پڑتی تھیں تو ایسا بھلا معلوم ہوتا تھا جیسے
دولھا کے چہرے پر سونے کا سہرا ۔ ۴ گمراہی کے لشکر ۔ مراد یزیدی فوجیں ۔ ۵ سیدھے قد والے ۔
خوش قامت ۔ ۶ پھول سے رخسار والے ۔

عزفوںؔ[1] سے حوریں دیکھ کے کرتی تھیں یہ کلام　　دنیا کا باغ بھی ہے عجب پر فضا مقام
دیکھو درود پڑھ کے سوئے لشکر امام　　(۹۴) ہمشکل مصطفےٰ ہے یہی عرش احتشام
رایت لیے وہ لال خدا کے ولی کا ہے
اب[2] تک جہاں میں سایہ تو نبی و علی کا ہے

دنیا سے اٹھ گئے تھے جو پیغمبر زماں　　ہم جانتے تھے حسن سے خالی ہے اب جہاں
کیونکر سوئے زمیں نہ جھکے پیر آسماں　　(۹۵) پیدا کیا ہے حق نے عجب حسن کا جواں
سب خوبیوں کا خاتمہ بس اس حسیں پہ ہے
محبوب حق ہے عرش پہ سایہ زمیں پہ ہے

ناگاہ تیر ادھر سے چلے جانب امام　　گھوڑا بڑھا کے آپ نے حجت بھی کی تمام
نکلے ادھر سے شہ کے رفیقان تشنہ کام　　(۹۶) بے سر ہوئے پروں میں سران سپاہ شام
بالا کبھی تھی تیغ کبھی زیر تنگ تھی
ایک ایک کی جنگ مالک اشتر کی جنگ تھی

نکلے پے جہاد عزیزان شاہ دیں　　نعرے کیے کہ خوف سے ہلنے لگی زمیں
روباہوں کی صفوں پہ چلے شیر خشمگیں　　(۹۷) کھینچی جو تیغ بھول گئے صف کشی لعیں
بجلی گری پروں پہ شمال و جنوب کے
کیا کیا لڑے ہیں شام کے بادل میں ڈوب کے

اللہ رے علی کے نواسوں کی کارزار　　دونوں کے نیمچے تھے کہ چلتی تھی ذوالفقار
شانہ کٹا کسی نے جو روکا سپر پہ وار　　(۹۸) گنتی تھی زخمیوں کی نہ کشتوں کا تھا شمار
اتنے سوار قتل کیے تھوڑی دیر میں
دونوں کے گھوڑے چھپ گئے لاشوں کے ڈھیر میں

وہ چھوٹے چھوٹے ہاتھ وہ گوری کلائیاں　　آفت کی پھرتیاں تھیں غضب کی صفائیاں
ڈر ڈر کے کاٹتے تھے کماں کش کنائیاں　　(۹۹) فوجوں میں تھیں نبی و علی کی دہائیاں
شوکت ہو بہو[3] تھی جناب امیر کی
طاقت دکھا دی شیروں نے زینب کے شیر کی

---

[1] جھروکے۔ کھڑکیاں۔ دریچیاں۔ [2] حضرت علی اکبر صورت میں حضرت محمدؐ سے مشابہ تھے۔
اور حضرت عباس شان و شوکت میں حضرت علی سے۔ اس لیے ان دونوں کا ساتھ گویا نبیؐ و علیؑ
کا ساتھ تھا۔ [3] ہو بہو۔

(۱۰۰)

کس حسن سے حسن کا جوان حسیں لڑا — گھر گھر کے صورت اسد خشم گیں لڑا
دو دن کی بھوک و پیاس میں وہ مہ جبیں لڑا — سہرا الٹ کے یوں کوئی دولہا نہیں لڑا
حملے دکھا دیے اسد کردگار کے — مقتل میں سوئے ازرق شامی کو مار کے

(۱۰۱)

چمکی جو تیغ حضرت عباس عرش جاہ — روح الامیں پکارے کہ اللہ کی پناہ
ڈھالوں میں چھپ گیا پسر سعد روسیاہ — کشتوں سے بند ہو گئی امن و اماں کی راہ
بھپٹا جو شیر شوق میں دریا کی سیر کے — لے لی ترائی تیغوں کی موجوں کو پھیر کے

(۱۰۲)

بے سر ہوئے موکل سرچشمۂ فرات — ہل چل میں مثل موج صفوں کو نہ تھا ثبات
دریا میں ہو کے غرق ہوئے کتنے بدصفات — گویا حباب ہو گئے تھے نقطۂ حیات
عباس بھر کے مشک کو یوں تشنہ لب لڑے — جس طرح نہروان میں امیر عرب لڑے

(۱۰۳)

آفت تھی حرب و ضرب علی اکبر دلیر — غصے میں جھپٹے صید پہ جیسے گرسنہ شیر
سب سربلند پست زبردست سب تھے زیر — جنگل میں چار سمت ہوئے زخمیوں کے ڈھیر
سر ان کے اترے تن سے جو تھے رن چڑھے ہوئے — عباس سے بھی جنگ پہ کچھ بڑھ چڑھے ہوئے

---

۱ یزیدی فوج کا ایک نامی پہلوان۔ ۲ میدان جنگ میں تلواریں اس کثرت سے چل رہی تھیں گویا تلواروں کا دریا لہریں لے رہا تھا۔ اس لیے حضرت عباس کا ان میں سے گزر کر دریا تک پہنچنا گویا تلواروں کے دریا کو پیر کر اترنا تھا۔ ۳ محافظ۔ نگہبان۔ ۴ عراق عرب کا ایک شہر جہاں حضرت علی نے خوارج کو شکست فاش دی تھی۔ نہر کی جنگ کو جنگ نہروان سے تشبیہ دینے سے ایک خاص لطف پیدا ہو گیا ہے۔

۵ عرب کا سردار۔ مراد حضرت علی۔

۶ جنگ کا تجربہ رکھنے والے۔ لڑائیاں لڑے ہوئے۔

تلواریں برسیں صبح سے نصف النہار تک ۔۔۔ ہلتی رہی زمین لرزتے رہے فلک
کانپا کیے پروں کو سمیٹے ہوئے ملک (١٠٤) ۔۔۔ نعرے نہ پھر وہ تھے نہ وہ تیغوں کی تھی چمک
ڈھالوں[1] کا دور برچھیوں کا اوج ہو گیا ۔۔۔ ہنگام ظہر خاتمۂ فوج ہو گیا

لاشے سبھوں کے سبط نبی خود اٹھا کے لائے ۔۔۔ قاتل کسی شہید کا سر کاٹنے نہ پائے
دشمن کو بھی نہ دوست کی فرقت خدا دکھائے (١٠٥) ۔۔۔ فرماتے تھے بچھڑ گئے سب ہم سے ہائے ہائے
اتنے پہاڑ ٹوٹ پڑیں جس پہ وہ خم نہ ہو ۔۔۔ گر سو برس جیوں تو یہ مجمع بہم نہ ہو

لاشے تو سب کے گرد تھے اور بیچ میں امام ۔۔۔ ڈوبی ہوئی تھی خوں میں نبی کی قبا تمام
افسردہ و حزین و پریشان و تشنہ کام (١٠٦) ۔۔۔ برچھی تھی دل کو فتح کے باجوں کی دھوم دھام
اعدا کسی شہید کا جب نام لیتے تھے ۔۔۔ تھرا کے دونوں ہاتھوں سے دل تھام لیتے تھے

پوچھو اسی سے جس کے جگر پر ہوں اتنے داغ ۔۔۔ اک عمر کا ریاض تھا جس پر لٹا وہ باغ
فرصت نہ اب بکا سے نہ ماتم سے ہو فراغ (١٠٧) ۔۔۔ جو گھر کی روشنی تھے وہ گل ہو گئے چراغ
پڑتی تھی دھوپ سب کے تن پاش پاش پر ۔۔۔ چادر بھی اک تھی علی اکبر کی لاش پر

مقتل سے آئے خیمے کے در پر شہ زمن ۔۔۔ پر شدت عطش سے نہ تھی طاقت سخن
پردے پہ ہاتھ رکھ کے پکارے بصد محن (١٠٨) ۔۔۔ اصغر کو گاہوارے سے لے آؤ اے بہن
پھر ایک بار اس مہ انور کو دیکھ لیں ۔۔۔ اکبر کے شیر خوار برادر کو دیکھ لیں

---

[1] اس مصرعے میں 'دور' اور 'اوج' مجازی معنی میں آئے ہیں اور اس حیثیت سے ہم معنی ہیں اس لیے ڈھالوں کا اوج اور برچھیوں کا دور کہنے سے معنی میں کوئی فرق نہ پڑتا۔ مگر انیس ان کے حقیقی معنوں کے اعتبار سے ڈھالوں کے لیے 'دور' اور برچھیوں کے لیے 'اوج' لائے ہیں، جو انتخاب الفاظ میں ان کی باریک بینی کا بین ثبوت ہے۔

(۱۰۹)
خیمے سے دوڑے آلِ محمدؐ برہنہ سر
اصغر کو لائیں ہاتھوں پہ بانوے نوحہ گر
بچے کو لے کے بیٹھ گئے آپ خاک پر
منہ سے ملے جو ہونٹھ تو چونکا وہ سیمبر
غم کی چھری چلی جگر چاک چاک پر
بٹھلا لیا[۱] حسینؑ نے زانوے پاک پر

(۱۱۰)
بچے سے ملتفت تھے شہ آسماں سریر
تھا اس طرف کمیں میں بن کاہل[۲] شریر
مارا جو تین بھال کا اس بے حیا نے تیر
بس دفعتاً نشانہ بنی گردن صغیر
تڑپا جو شیرخوار تو حضرت نے آہ کی
معصوم ذبح ہو گیا گودی میں شاہ کی

(۱۱۱)
جس دم تڑپ کے مر گیا وہ طفل شیرخوار
چھوٹی سی قبر تیغ سے کھودی بحالِ زار
بچے کو دفن کر کے پکارا وہ ذی وقار
اے[۳] خاکِ پاک حرمتِ مہماں نگاہ دار
دامن میں رکھ اسے جو محبت علی کی ہو
دولت ہو فاطمہ کی امانت علی کی ہو

(۱۱۲)
یہ کہہ کے آئے فوج پہ تولے ہوئے حسام
آنکھیں لہو[۴] تھیں رونے سے چہرہ تھا سرخ فام
زیبِ بدن کیے تھے بصد عز و احتشام
پیراہنِ مطہرِ پیغمبرِ انام
حمزہ کی ڈھال تیغ شہِ لافتا کی تھی
بر میں زرہ جناب رسولِ خدا کی تھی

(۱۱۳)
رستم تھا درع پوش کہ پاکھر میں راہوار
جرار[۵] بردبار سبک رو وفاشعار
کیا خوش نما تھا زین طلاکار و نقرہ کار
اکسیر تھا قدم کا جسے مل گیا غبار
خوش خو تھا خانہ زاد تھا دلدل نژاد تھا
شبیر بھی سخی تھے فرس بھی جواد تھا

---

۱ "بٹھلانا" کی جگہ اب بٹھانا بولتے ہیں۔

۲ کاہل کا بیٹا یعنی حرملہ، جو یزیدی لشکر کا ایک مشاق تیرانداز تھا۔

۳ یہ مصرع فارسی ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اے پاک مٹی مہمان کی عزت کا خیال رکھنا۔

۴ خون کی سی سرخ تھیں۔

۵ تیز رفتار گھوڑا۔ جواد کے معنی قریب ہیں۔ سخی۔ فیاض۔ یہاں لفظ کا استعمال صنعت ایہام کی بہت اچھی مثال ہے۔

گرمی کا روز جنگ کی کیونکر کروں بیاں ‏ ‏ ‏ ڈر ہے کہ مثل شمع نہ جلنے لگے زباں

وہ لوں کہ الحذر وہ حرارت کہ الاماں[۱] (۱۱۴) رن کی زمیں تو سرخ تھی اور زرد آسماں

آب خنک کو خلق ترستی تھی خاک پر ‏ ‏ ‏ گویا ہوا سے آگ برستی تھی خاک پر

وہ لوں وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب ‏ ‏ ‏ کالا[۲] تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثال شب

خود نہر علقمہ[۳] کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب (۱۱۵) خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب

اڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا ‏ ‏ ‏ کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

جھیلوں میں چارپائے نہ اٹھتے تھے تابہ شام ‏ ‏ ‏ مسکن[۴] میں مچھلیوں کے سمندر کا تھا مقام

آہو جو کاہلے[۵] تھے تو چیتے سیاہ فام (۱۱۶) پتھر پگھل کے رہ گئے تھے مثل موم خام

سرخی اڑی تھی پھولوں سے سبزی گیاہ سے ‏ ‏ ‏ پانی کنوؤں میں اترا تھا سائے کی چاہ سے

کوسوں کسی شجر میں نہ گل تھے نہ برگ و بار ‏ ‏ ‏ ایک ایک نخل جل رہا تھا صورت چنار[۶]

ہنستا تھا کوئی گل نہ مہکتا تھا سبزہ زار (۱۱۷) کانٹا ہوئی تھی سوکھ کے ہر شاخ باردار

گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے[۷] ‏ ‏ ‏ پتے بھی مثل چہرۂ مدقوق زرد تھے[۸]

۱؎ گرمی اور تپش ۔ نہایت شدید گرمی ۔ ۲؎ دھوپ سے چہرے کا رنگ کالا ہو جاتا ہے ۔ یہ دھوپ اتنی تیز تھی کہ دن کا روشن چہرہ رات کی طرح کالا ہو گیا ۔ ۳؎ دریائے فرات کی ایک شاخ کا نام ۔

۴؎ گرمی کی شدت سے پانی آگ ہو گیا تھا ۔ اس لیے اس میں مچھلیوں کی جگہ سمندر رہنے لگے تھے ۔ سمندر ایک جانور ہے جو آگ سے پیدا ہوتا ہے اور آگ میں ہی رہتا ہے ۔

۵؎ کاہلا کی جمع ۔ سست ، مضمحل ، تھکا ماندہ ۔ یہ لفظ جیتے ہرن کی اس کیفیت کے لیے آتا ہے جو گرمیوں میں دھوپ کی شدت سے اس پر طاری ہو جاتی ہے ۔ یہ لفظ ایک مدت تک مستعمل رہنے کے بعد اب متروک ہو گیا ہے ۔ ذیل کے شعروں سے اس کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے ۔

کاہلا سن کر مجھے آئے پہ چپ بیٹھے رہے ‏ ‏ ‏ بچنے سننے کو ذرا بیمارداری کر گئے ۔ میر حسن

گرمیٔ رخسار سے بیمار ہوئی چشم یار ‏ ‏ ‏ دھوپ کی شدت سے آہو کاہلا ہو جائے گا ۔ شیخ ناسخ

گرمی میں نہیں ہے شوخیٔ چشم ‏ ‏ ‏ یہ دھوپ سے کاہلا ہرن ہے ۔ شاد لکھنوی بہ تغیر

۶؎ ایک بہت اونچا اور چھتنار درخت جس کے پتوں کا رنگ خزاں کے موسم میں سرخی مائل ہو جاتا ہے ۔

۷؎ سب مایوس تھے ۸؎ اس تشبیہ سے پتوں کی زردی کے ساتھ ان کی انتہائی پژمردگی کا بھی تصور ہو جاتا ہے ۔

آب رواں سے منھ نہ اٹھاتے تھے جانور — جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر اِدھر اُدھر
مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر — (۱۱۸) خس خانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر چشم سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں — پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

شیر اٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے — آہو نہ منھ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے — (۱۱۹) گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر — بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلۂ جوالہ کا گماں — انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منھ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں — (۱۲۰) تہ پر تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ، گرمی روزِ حساب تھی — ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

آئینۂ فلک کو نہ تھی تاب تب کی تاب — چھپنے کو برق چاہتی تھی دامنِ سحاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کو اضطراب — (۱۲۱) کافورِ صبح ڈھونڈھتا پھرتا تھا آفتاب
بھڑکی تھی آگ گنبدِ چرخِ اثیر میں — بادل چھپے تھے سب کرۂ زمہریر میں

اس دھوپ میں کھڑے تھے اکیلے شہِ امم — نہ دامنِ رسول تھا نہ سایۂ علم
شعلے جگر سے آہ کے اٹھتے تھے دم بدم — (۱۲۲) اودے تھے لب زبان میں کانٹے کمر میں خم
بے آب تیسرا تھا جو دن میہمان کو — ہوتی تھی بات بات میں لکنت زبان کو

۱؎ اس مصرعے میں صنعت ادماج ہے۔ یعنی اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک اس طرح کہ مردم سے آنکھ کی پتلی اور 'پردوں' سے آنکھ کے پردے مراد لیے جائیں دوسرے اس طرح کہ 'مردم' سے آدمی اور 'پردوں' سے وہ پردے مراد لیے جائیں جو دھوپ کی تابش سے بچنے کے لیے ڈالے جاتے ہیں۔ ۲؎ گھومتا ہوا چکر کھاتا ہوا شعلہ۔ ۳؎ استبعاد [illegible] کا مبالغہ ہے۔ جس کو غلو کہتے ہیں مگر لطف سے خالی نہیں۔ ۴؎ اضافت تشبیہی ہے۔ زمہریر میں سفیدی اور خنکی ہوتی ہے۔ کافور بھی سفید اور تاثیر کے اعتبار سے ٹھنڈا ہوتا ہے۔ ۵؎ کرۂ نار۔ آگ کا کرہ۔ اثیر وہ آگ جو چار عنصروں میں سے ایک ہے۔ ۶؎ کرۂ ہوا کا وسطی حصہ جو بے حد سرد ہے۔ ۷؎ گرمی کے طولانی بیان سے کلام کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا اس کو شاعر نے یہ مصرع کہہ کر کس خوبصورتی سے جوڑ دیا ہے۔

گھوڑوں کو اپنے کرتے تھے سیراب شہ سوار　　آتے تھے اونٹ گھاٹ پہ باندھے ہوئے قطار
پیتے تھے آب نہر پرند آکے بے شمار (۱۲۳)　　سقے زمیں پہ کرتے تھے چھڑکاؤ بار بار
پانی کا دام و دد[1] کو پلانا ثواب تھا　　اک ابن فاطمہ کے لیے قحط آب تھا

سر پر لگائے تھا پسر سعد چتر زر　　خادم کئی تھے مروحہ جنباں[2] ادھر ادھر
کرتے تھے آب پاش[3] مکرر زمیں کو تر (۱۲۴)　　فرزند فاطمہ پہ نہ تھا سایۂ شجر
وہ دھوپ دشت کی وہ جلال آفتاب کا　　سونلا گیا تھا رنگ مبارک جناب کا

کہتا تھا ابن سعد کہ اے آسماں جناب　　بیعت[4] جو کیجے اب بھی تو حاضر ہو جام آب
فرماتے تھے حسین کہ او خانماں خراب (۱۲۵)　　دریا کو خاک جانتا ہے ابن بو تراب
فاسق ہے پاس کچھ تجھے اسلام کا نہیں　　آب بقا[5] ہو اب تو مرے کام کا نہیں

کہہ دوں تو خوان لے کے خود آئیں ابھی خلیل[6]　　چاہوں تو سلسبیل[7] کو دم میں کروں سبیل
کیا جام آب کا مجھے تو دے گا او ذلیل (۱۲۶)　　بے آبرو، خسیس[8]، ستم گر، دنی[9]، بخیل
جس پھول پر پڑے ترا سایہ وہ بو نہ دے　　کھلوائے فصد تو تو کبھی رگ لہو نہ دے

---

[1] گھریلو اور جنگلی جانور یعنی ہر طرح کے جانور۔ یہ دونوں لفظ بالعموم ایک ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں۔ [2] پنکھا ہلانے یا جھلنے والا۔ [3] زمین چھڑکنے والے۔ [4] بیعت کرنا۔ کسی کو اپنا مذہبی یا روحانی پیشوا قرار دینے کے لیے مقررہ رسم ادا کرنا۔ [5] آب حیات جس کے پینے سے آدمی ہمیشہ زندہ رہ سکتا ہے۔ [6] حضرت ابراہیم پیغمبر جن کا لقب خلیل اللہ تھا یعنی اللہ کے دوست۔
خوان خلیل یعنی حضرت ابراہیم کا دستر خوان۔ آپ بڑے مہمان نواز تھے۔

[7] بہشت کا ایک چشمہ۔ سبیل اور سلسبیل میں تجنیس مذیل ہے۔

[8] کمینہ، اردو میں بالعموم بخیل کے معنی میں بولا جاتا ہے۔

[9] حقیر۔ ذلیل۔

گو جمِ[۱] کا نام لیں تو ابھی جام لے کے آئے   کوثر یہیں رسولؐ کے احکام لے کے آئے
روح الامیں زمیں پہ مرا نام لے کے آئے (۱۲۷)   لشکر ملک کا فتح کا پیغام لے کے آئے

چاہوں جو انقلاب تو دنیا تمام ہو   الٹے زمین یوں کہ نہ کو فہ نہ شام ہو

فرما کے یہ نگاہ جو کی سوے ذوالفقار   تھرا کے پچھلے پاؤں ہٹا وہ ستم شعار
مظلوم پر صفوں سے چلے تیر بے شمار (۱۲۸)   آواز کوسِ[۲] حرب ہوئی آسماں کے پار
نیزے اٹھا کے جنگ پہ اسوار تل گئے   کالے نشاں سپاہِ سیہ رو میں کھل گئے

وہ دھوم طبلِ جنگ کی وہ بوق کا خروش   کر ہو گئے تھے شور سے کرّوبیوں کے گوش
تھرائی یوں زمیں کہ اڑے آسماں کے ہوش (۱۲۹)   نیزے ہلا کے نکلے سواران درع پوش
ڈھالیں تھیں یوں سروں پہ سواران شوم کے   صحرا میں جیسے آئے گھٹا جھوم جھوم کے

تو پڑھ کے چند شعر رجز شاہ دیں بڑھے   گیتی کے تھام لینے کو روح الامیں بڑھے
مانندِ شیرِ نر کہیں ٹھہرے کہیں بڑھے (۱۳۰)   گویا علی الٹتے ہوئے آستیں بڑھے
جلوہ دیا جری نے عروسِ مصاف کو   مشکل کشا[۳] کی تیغ نے چھوڑا غلاف[۴] کو

کاٹھی سے اس طرح ہوئی وہ شعلہ خو جدا   جیسے کنارِ شوق سے ہو خوب رو جدا
مہتاب سے شعاع جدا گل سے بو جدا (۱۳۱)   سینے سے دم جدا رگِ جاں سے لہو جدا
گرجا جو رعد ابر سے بجلی نکل پڑی   محمل میں دم جو گھٹ گیا لیلیٰ نکل پڑی

آئے حسینؑ یوں کہ عقاب آئے جس طرح   آہو پہ شیرِ شرزہ[۵] غاب[۶] آئے جس طرح
تابندہ برق سوے سحاب آئے جس طرح (۱۳۲)   دوڑا فرس نشیب میں آب آئے جس طرح
یوں تیغِ تیز کوند گئی اس گروہ پر   بجلی تڑپ کے گرتی ہے جس طرح کوہ پر

(حاشیہ: جب میدان میں تیغ زنی کے لیے سلطانِ دیں بڑھے)

۱؎ ایران کا ایک قدیم عظیم الشان بادشاہ اس کے پاس ایک جام تھا جس میں ساری دنیا دکھائی دیتی تھی اور اسی بنا پر اس کو 'جامِ جہاں نما' کہتے ہیں۔ ۲؎ طبلِ جنگ۔ جنگ کا نقارہ۔ نقارہ بجا کر جنگ شروع کرنے کا اعلان کیا جاتا تھا ۳؎ مشکلوں کو حل کرنے والے یہ صفت حضرت علی کے لیے مخصوص ہے۔
۴؎ تلوار کا میان ۵؎ خوف ناک، غصہ ور۔ ۶؎ جنگل۔

گرمی میں برق تیغ جو چمکی شرر اڑے — بھونکا چلا ہوا کا جوشن سے تو سر اڑے

پرکالۂ سپر جو ادھر اور ادھر اڑے (۱۳۳) — روح الامیں نے صاف یہ جانا کہ پر اڑے

ظاہر نشان اسم[1] عزیمت اثر ہوئے — جن پر علی لکھا تھا وہی پر[2] سپر ہوئے

جس پر چلی وہ تیغ دو پارا کیا اسے — کھنچتے ہی چار ٹکڑے دو بارا کیا اسے

واں تھی جدھر اجل نے اشارا کیا اسے (۱۳۴) — سختی کبھی کچھ پڑی تو گوارا کیا اسے

نازیں تھا فرس پہ نہ اسوار زین پر — کڑیاں زرہ کی بکھری ہوئی تھیں زمین پر

آئی چمک[3] کے غول پہ جب سر گرا گئی — دم میں جمی صفوں کو برابر گرا گئی

ایک ایک قصر تن کو زمیں پر گرا گئی (۱۳۵) — سیل آئی زور شور سے جب گھر گرا گئی

آ پہنچا اسکے گھاٹ پہ جو مر کے رہ گیا — دریا لہو کا تیغ کے پانی سے بہہ گیا

اس آب پر یہ شعلہ فشانی خدا کی شان — پانی[4] میں آگ آگ میں پانی خدا کی شان

خاموش اور تیز زبانی خدا کی شان (۱۳۶) — استادہ[5] آب میں یہ روانی خدا کی شان

لہرائی جب اتر گیا دریا چڑھا ہوا — نیزوں تھا ذوالفقار کا پانی بڑھا ہوا

قلب[6] و جناح[7] و میمنہ[8] و میسرہ[9] تباہ — گردن کشان امت خیر الورا تباہ

جنباں زمیں صفیں تہ و بالا پرا تباہ (۱۳۷) — بے جان جسم روح مسافر سرا تباہ

بازار بند ہو گیا جھنڈے اکھڑ گئے — فوجیں ہوئیں تباہ محلے اجڑ گئے

---

۱ ایسا نام جس میں دعا تعویذ کا سا اثر ہو۔ ۲ 'پر' اور 'سپر' میں تجنیس زائد ہے۔

۳ چمک۔ باڑھ۔ تیزی۔ ۴ پہلے مصرع میں جو تعجب کی بات بیان کی گئی تھی وہ اس مصرع میں اس سے زیادہ حیرت انگیز پیرائے میں کہی گئی ہے۔ ۵ ٹھہرا ہوا پانی۔

۶ فوج کا درمیانی حصہ۔ ۷ سپاہیوں کا دستہ جو فوج کے آگے رہتا ہو۔ فوج کا بازو

۸ فوج کا داہنا بازو۔ ۹ فوج کا بایاں بازو۔

اللہ ری تیزی و برش اس شعلہ رنگ کی — چمکی سوار پر تو خبر لائی تنگ کی
پیاسی فقط لہو کی طلب گار جنگ کی (۱۳۸) حاجت نہ سان کی تھی اسے کچھ نہ سنگ کی
خوں سے فلک کی لاشوں سے مقتل کو بھرتی تھی — سو بار دم میں چرخ پہ چڑھتی اترتی تھی

تیغ خزاں تھی گلشن ہستی سے کیا اسے — گھر جس کا تو اجڑ گیا بستی سے کیا اسے
وہ حق نما تھی کفر پرستی سے کیا اسے (۱۳۹) جو آپ سر بلند ہو پستی سے کیا اسے
کہتے ہیں راستی جسے وہ خم کے ساتھ ہو — تیزی زباں کے ساتھ برش دم کے ساتھ ہو

سینے پہ چل گئی تو کلیجہ لہو ہوا — گویا جگر میں موت کا ناخن فرو ہوا
چمکی تو الاماں کا غل چار سو ہوا (۱۴۰) جو اس کے منہ پہ آگیا بے آبرو ہوا
رکتا تھا ایک وار نہ دس سے نہ پانچ سے — چہرے سیاہ ہو گئے تھے اسکی آنچ سے

پچھ پچھ گئیں صفوں پہ صفیں وہ جہاں چلی — چمکی تو اس طرف ادھر آئی وہاں چلی
دونوں طرف کی فوج پکاری کہاں چلی (۱۴۱) اس نے کہا یہاں وہ پکارا وہاں چلی
منہ کس طرف ہے تیغ زنوں کو خبر نہ تھی — سر گر رہے تھے اور تنوں کو خبر نہ تھی

دشمن جو گھاٹ پر تھے وہ دھوئے تھے جاں سے ہاتھ — گردن سے سر الگ تھا جدا تھے عناں سے ہاتھ
توڑا کبھی جگر کبھی چھیدا سناں سے ہاتھ (۱۴۲) جب کٹ کے گر پڑیں تو پھر آئیں کہاں سے ہاتھ
اب ہاتھ دستیاب نہیں منہ چھپانے کو — ہاں پاؤں رہ گئے ہیں فقط بھاگ جانے کو

اللہ رے خوف تیغ شہ کائنات کا — زہرہ تھا آب خوف کے مارے فرات کا
دریا پہ تھا یہ حال ہر اک بد صفات کا (۱۴۳) چارہ[1] فرار[2] کا تھا نہ یارا[3] ثبات[4] کا
غل تھا کہ برق گرتی ہے ہر درع پوش پر — بھاگو خدا کے قہر کا دریا ہے جوش پر

---

[1] تدبیر۔ [2] بھاگنا۔
[3] سکت۔ طاقت۔ [4] ٹھہرنا۔ اپنی جگہ پر قائم رہنا۔

ہر چند مچھلیاں تھیں زرہ پوش سر بسر — منھ کھولے چھپتی پھرتی تھیں لیکن ادھر ادھر
بھاگی تھی موج چھوڑ کے گرداب کی سپر — (۱۴۴) تھے تہ نشیں نہنگ مگر آب تھے جگر
دریا نہ تھا خوف سے اس برق تاب[1] کے — لیکن پڑے تھے پاؤں میں چھالے حباب کے

آیا خدا کا قہر جدھر سن سے آگئی — کانوں میں الاماں کی صدا رن سے آگئی
دو کر کے خود زین پہ جوشن سے آگئی — (۱۴۵) کھنچتی ہوئی زمین پہ توسن سے آگئی
بجلی گری جو خاک پہ تیغ جناب کی — آئی صدا زمین سے یا بو تراب کی

پس پس کے کشمکش میں کماں دار مر گئے — چلے تو سب چڑھے رہے بازو[2] اتر گئے
گوشے کٹے کمانوں کے تیروں کے پر گئے — (۱۴۶) مقتل میں ہو سکا نہ گزارا گزر گئے
دہشت سے ہوش اڑے ہوئے تھے مرغ وہم کے — سوفار[3] کھول دیتے تھے منھ سہم[4] سہم کے

تیر افگنی کا جن کی ہر اک شہر میں تھا شور — گوشہ کہیں نہ ملتا تھا ان کو سوائے گور
تاریک شب میں جن کا نشانہ تھی چشم مور[5] — (۱۴۷) لشکر میں خوف جاں نے انھیں کر دیا تھا کور[6]
ہوش اڑ گئے تھے فوج ضلالت نشان کے — پیکاں[7] میں زہ کو رکھتے تھے سوفار جان کے

صف پر صفیں پروں پہ پرے پیش و پس گرے — اسوار پر سوار فرس پر فرس گرے
اٹھ کر زمیں سے پانچ جو بھاگے تو دس گرے — (۱۴۸) مخبر[8] پہ پیک[9] پیک پہ مر کر عسس[10] گرے
ٹوٹے پرے شکست بنائے ستم ہوئی — دنیا میں اس طرح کی بھی افتاد کم ہوئی

---

۱ بجلی کی طرح چمکنے والی تلوار۔ ۲ بازوؤں کے جوڑ ڈھیلے ہو گئے یا جگہ سے ہٹ گئے ۳ سوفار کا کھلنا کھلے ہوئے منھ سے مشابہ ہوتا ہے۔ ۴ سہم کے معنی فارسی میں خوف عربی میں تیر۔ سوفار اور سہم میں ایہام تناسب ہے۔ ۵ چیونٹی۔ ۶ کر اور کور میں ایہام تناسب ہے۔ ۷ پیکان کو سوفار سمجھ کر اس میں کمان کا چلہ رکھتے تھے۔ اس سے سپاہیوں کی بدحواسی ظاہر ہوتی ہے۔ ۸ خبر پہنچانے والا جاسوس۔ ۹ قاصد۔ خط اور پیغام پہنچانے والا۔ پیادہ۔ ہرکارہ۔ ۱۰ کوتوال۔ رات کو گشت کرنے والا۔ لشکر میں پہرہ دینے والا۔

غصے تھا شیر شرزۂ صحرائے کربلا — چھوڑے تھے گرگ منزل و ماوائے کربلا
تیغ علی تھی معرکہ آرائے کربلا (۱۴۹) — خالی نہ تھی سروں سے کہیں جائے کربلا
بستی بسی تھی مردوں کی قریے اجاڑ تھے — لاشوں کی تھی زمیں سروں کے پہاڑ تھے

غازی نے رکھ لیا تھا جو شمشیر کے تلے — تھی طرفہ کشمکش فلک پیر کے تلے
چلے سمٹ کے جاتے تھے زہ گیر کے تلے (۱۵۰) — چھپتی تھی سر جھکا کے کماں تیر کے تلے
اس تیغ بے دریغ کا جلوہ کہاں نہ تھا — سہمے تھے سب پہ گوشۂ امن و اماں نہ تھا

چاروں طرف کمان کیانی کی وہ ترنگ — رہ رہ کے ابر شام سے وہ بارش خدنگ
وہ شور صیحۂ فرس ابلق و سرنگ (۱۵۱) — وہ لُو وہ آفتاب کی تابندگی وہ جنگ
پھنکتا تھا دشت کیں کوئی دل تھا نہ چین سے — اس دن کی تاب و تب کوئی پوچھے حسین سے

سقے پکارتے تھے یہ مشکیں لیے ادھر — بازار جنگ گرم ہے ڈھلتی ہے دوپہر
پیاسا جو ہو وہ پانی سے ٹھنڈا کرے جگر (۱۵۲) — مشکوں پہ دوڑ دوڑ کے گرتے تھے اہل شر
کیا آگ لگ گئی تھی جہان خراب کو — پیتے تھے سب حسین ترستے تھے آب کو

گرمی میں پیاس تھی کہ پھنکا جاتا تھا جگر — اف اف کبھی کہا کبھی چہرے پہ لی سپر
آنکھوں میں ٹیس اٹھی جو پڑی دھوپ پر نظر (۱۵۳) — جھپٹے کبھی ادھر کبھی حملہ کیا ادھر
کثرت عرق کے قطروں کی تھی روئے پاک پر — موتی برستے جاتے تھے مقتل کی خاک پر

۱؎ مکان۔ قیام کی جگہ۔ ۲؎ پناہ کی جگہ۔ ۳؎ اس طرح تلوار کی زد میں لے لیا تھا کہ بچ کر نکلنا مشکل تھا۔ ۴؎ بے رحم۔ بے خوف۔ کسی کو نہ چھوڑنے والی۔ ۵؎ کمان کھینچنے کی آواز۔ کمان کا کڑکنا۔ ۶؎ زور کی آواز۔ چیخ۔ خصوصاً گھوڑے کی آواز۔ ۷؎ دو رنگا۔ بالخصوص سیاہ و سفید۔ ۸؎ لال رنگ کا گھوڑا جس کی بال اور دم بھی لال ہوتی ہے۔

پھر اب چھپے پھرتے تھے پیاسے کی جنگ سے   چلتی تھی ایک تیغ علی لاکھ رنگ سے
چمکی جو فرق پر تو نکل آئی تنگ سے (۱۵۴)   رکتی نہ تھی سپر سے نہ آہن نہ سنگ سے
خالق نے منھ دیا تھا عجب آب و تاب کا[1]   خود اس کے سامنے تھا پھپھولا حباب کا

سہمے ہوئے تھے یوں کہ کسی کو نہ تھی خبر   پیکاں کدھر ہے تیر کا سوفار ہے کدھر
مردم کی کشمکش سے کمانوں کو تھا یہ ڈر (۱۵۵)   گوشوں کو ڈھونڈھتی تھیں زمیں پر جھکائے سر
ترکش سے کھینچے تیر کوئی یہ جگر نہ تھا   سٹیر[2] پہ جس نے ہاتھ رکھا تن پہ سر نہ تھا

گھوڑے کی وہ تڑپ وہ چمک تیغ تیز کی   سو سو صفیں کچل گئیں جب جست و خیز کی
لاکھوں میں تھی نہ ایک کو طاقت ستیز[3] کی (۱۵۶)   تھی چار سمت دھوم گریز[4] اگریز کی
آری جو ہو گئی تھیں وہ سب ذوالفقار سے   تیغوں نے منھ پھرا لیے تھے کارزار سے

گھوڑوں کی جست و خیز سے اٹھا غبار زرد   گردوں میں مثل شیشۂ ساعت[5] بھری تھی گرد
تو دا بنا تھا خاک کا مینائے لاجوردی[6] (۱۵۷)   کوسوں سیاہ و تار تھا سب وادی نبرد
پنہاں نظر سے نیر گیتی فروز تھا   ڈھلتی تھی دوپہر پہ نہ شب تھی نہ روز تھا

اللہ ری لڑائی میں شوکت جناب کی   سونلائے رنگ میں تھی ضیا آفتاب کی
سوکھے وہ لب کہ پنکھڑیاں تھیں گلاب کی (۱۵۸)   تصویر[7] ذوالجناح پہ تھی بوتراب کی
ہوتا تھا غل جو کرتے تھے نعرے لڑائی میں   بھاگو کہ شیر گونج رہا ہے ترائی میں

---

[1] تلوار کی دھار۔ [2] کمان کا چلّہ۔ [3] جنگ۔ لڑائی۔ [4] بھاگا بھاگ۔ بھاگڑ۔ [5] پرانے زمانے میں وقت کا اندازہ کرنے کے لیے شیشے کا ایک آلہ ڈگڈگی کی شکل کا بنتا تھا۔ جس کے دونوں حصوں کے درمیان میں ایک سوراخ ہوتا تھا اوپر کے حصے میں بالو بھری جاتی تھی جو آہستہ آہستہ درمیانی سوراخ سے گزر کر ایک گھڑی یا ایک گھنٹے میں نیچے کے حصے میں پہنچ جاتی تھی پھر اس کو الٹ کر رکھ دیتے تھے اور اس طرح گھڑیوں یا گھنٹوں کا شمار کرتے تھے یہ آلہ شیشۂ ساعت کہلاتا تھا۔ [6] لاجوردی یعنی گہرے نیلے رنگ کا شیشے کا گولا۔ مجازاً نیلا آسمان۔ [7] امام حسین اپنے گھوڑے پر جس کا نام ذوالجناح تھا اس شان سے سوار تھے کہ حضرت علی کی تصویر معلوم ہوتے تھے۔

پھر تو یہ غل ہوا کہ دہائی حسینؑ کی — اللہ کا غضب ہے لڑائی حسینؑ کی
دریا حسین کا ہے ترائی حسینؑ کی (۱۵۹) — دنیا حسین کی ہے خدائی حسینؑ کی
بیڑا[1] بچایا آپ نے طوفاں سے نوحؑ کا — اب ہم واسطہ علی اکبر کی رُوح کا

اکبر کا نام سن کے جگر پر لگی سناں — آنسو بھر آئے روک لی رہوار کی عناں
مڑ کر پکارے لاش پسر کو شہ زماں (۱۶۰) — تم نے نہ دیکھی جنگ پدر اے پدر کی جاں
قسمیں تمھاری روح کی یہ لوگ دیتے ہیں — لو اب تو ذوالفقار کو ہم روک لیتے ہیں

چلایا ہاتھ مار کے زانو پہ ابن سعد — اے وافضیحتا[2] یہ ہزیمت ظفر کے بعد
زیبا دلاوروں کو نہیں ہے خلاف وعد (۱۶۱) — اک پہلواں یہ سنتے ہی گرجا مثال رعد
نعرہ کیا کہ کرتا ہوں حملہ امام پر — اے ابن سعد لکھ لے ظفر میرے نام پر

بالا قد و کلفت[3] و تنومند و خیرہ سر — روئیں[4] تن و سیاہ دروں آہنی کمر
ناوک پیام مرگ کے ترکش اجل کا گھر (۱۶۲) — تیغیں ہزار ٹوٹ گئیں جس پہ وہ سپر
دل میں بدی طبیعت بد میں بگاڑ تھا — گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پر پہاڑ تھا

ساتھ اس کے اور اسی قد و قامت کا ایک یل — آنکھیں کبود رنگ سیہ ابرو دل پہ بل
بدکار و بد شعار و ستم گار و پر دغل[5] (۱۶۳) — جنگ آزما بھگائے ہوئے لشکروں کے دل
بھالے لیے کسے ہوئے کمریں ستیز پر — نازاں وہ ضرب گرز پہ یہ تیغ تیز پر

کھنچ جائے شکل حرب وہ تدبیر چاہیے — دشمن بھی سب مقر ہوں وہ تقریر چاہیے
تیزی زباں میں صورت شمشیر چاہیے (۱۶۴) — فولاد کا قلم دم تحریر چاہیے
نقشہ کھینچے گا صاف صف کارزار کا — پانی دوات چاہتی ہے ذوالفقار کا

---

[1] ایک روایت ہے کہ جب حضرت نوحؑ کی کشتی طوفان میں غرق ہونے لگی تو آپ نے امام حسینؑ کا واسطہ دے کر دعا کی۔ دعا مقبول ہوئی اور کشتی غرقابی سے محفوظ رہی۔ [2] ہائے فضیحت۔ وائے رسوائی سے موٹا۔ [3] بھدا۔ بے ڈول۔ [4] جس کا بدن پیتل یا کانسے کا ہو یعنی نہایت مضبوط۔ [5] مکّار

لشکر میں اضطراب تھا فوجوں میں کھلبلی   ساونت بے حواس ہراساں دھنی[1] بلی[2]
ڈر تھا کہ لو حسین بڑھے تیغ اب چلی (۱۶۵)   غل تھا ادھر ہیں مرحب و عنتر ادھر علی
کون آج سربلند ہو اور کون پست ہو   کس کی ظفر ہو دیکھیے کس کی شکست ہو

آواز دی یہ ہاتف غیبی نے تب کہ ہاں   بسم اللہ اے امیر عرب کے سرور جاں
بیٹھے درست ہو کے فرس پر شہ زماں (۱۶۶)   اٹھی علی کی تیغ دودم چاٹ کر زباں
واں سے وہ شور بخت بڑھا نعرہ مار کے   پانی بھر آیا منہ میں ادھر ذوالفقار کے

لشکر کے سب جواں تھے لڑائی میں جی لڑائے   وہ بد نظر تھا آنکھوں میں آنکھیں ادھر گڑائے
ڈھالیں لڑیں سپاہ کی یا ابر گڑگڑائے (۱۶۷)   غصے میں آ کے گھوڑے نے بھی دانت کڑکڑائے
ماری جو ٹاپ ڈر کے ہٹے ہر لعیں کے پاؤں   ماہی پہ ڈگمگا گئے گاو زمیں[3] کے پاؤں

نیزہ ہلا کے شاہ پہ آیا وہ خود پسند   مشکل کشا کے لال نے کھولے تمام بند
تیر و کماں سے بھی نہ ہوا کچھ وہ بہرہ مند (۱۶۸)   چلہ ادھر کھنچا کہ چلی تیغ سربلند
وہ تیر کٹ گئے جو در آتے تھے تنگ میں   گوشے نہ تھے کماں میں نہ پیکاں خدنگ میں

ظالم اٹھا کے گرز کو آیا جناب پر   طاری ہوا غضب خلف بوتراب پر
مارا جو ہاتھ پاؤں جما کر رکاب پر (۱۶۹)   بجلی گری شقی کے سر پر عتاب[4] پر
بد ہاتھ میں شکست ظفر نیک ہاتھ میں   ہاتھ اڑ کے جا پڑا کئی ہاتھ ایک ہاتھ میں

کچھ دست پاچہ[5] ہو کے چلا تھا وہ نابکار   پنجے سے پر اجل کے کہاں جا سکے شکار
واں اس نے بائیں ہاتھ میں لی تیغ آبدار (۱۷۰)   یاں سر سے آئی پشت کے فقروں[6] پہ ذوالفقار
قربان تیغ تیز شہ نامدار کے   دو ٹکڑے تھے سوار کے دو راہوار کے

---

[1] بات پر قائم رہنے والا بہادر [2] طاقت ور [3] وہ گائے جس کے سینگ پر زمین قائم ہے اور وہ خود ایک مچھلی کی پیٹھ پر کھڑی ہے۔ [4] غصے سے بھرا ہوا۔ [5] بدحواس۔ گھبرایا ہوا۔ سٹ پٹایا ہوا۔
[6] ریڑھ کی ہڈیاں ۔ کڑیاں۔

پھر دوسرے پہ گرز اٹھا کر پکارے شاہ ‏ کیوں ضرب ذوالفقار پہ تو نے بھی کی نگاہ
سرشار تھا شراب تکبّر سے روسیاہ [(۱۷۱)] جاتا کہاں کہ موت تو روکے ہوئے تھی راہ
غل تھا اُسے اجل نے بڑھایا جو گھیر کے
لو دوسرا شکار چلا منہ میں شیر کے

آتا تھا وہ کہ اسپ شہ دیں پلٹ پڑا ‏ ثابت ہوا کہ شیر گرسنہ جھپٹ پڑا
تیغ شفق نے ڈھال پہ مارا تو پٹ پڑا [(۱۷۲)] ضربت پڑی کہ گنبد دوّار پھٹ پڑا
پیوند صدر زیں جسد و فرق ہو گیا
گھوڑا زمیں میں سینے تلک غرق ہو گیا

پریوں سے قاف چھوٹ گیا اور جنوں سے گھر ‏ شیروں سے دشت گرگ سے بن اژدروں سے دل
شاہینؔ و کبک چھپ گئے اک جا ملا کے سر [(۱۷۳)] اڑ کر گرے جزیروں میں دریا کے جانور
سمٹے پہاڑ منہ کو جو دامن سے ڈھانپ کے
سیمرغ نے گرا دیے پر کانپ کانپ کے

آئی ندائے غیب کہ شبیّر مرحبا ‏ اس ہاتھ کے لیے تھی یہ شمشیر مرحبا
یہ آبرو یہ جنگ یہ توقیر مرحبا [(۱۷۴)] دکھلا دی ماں کے دودھ کی تاثیر مرحبا
غالب کیا خدا نے تجھے کائنات پر
بس خاتمہ جہاد کا ہے تیری ذات پر

بس اب نہ کر دغا کی ہوس اے حسین بس ‏ دم لے ہوا ہیں چند نفس اے حسین بس
گرمی سے ہانپتا ہو فرس اے حسین بس [(۱۷۵)] وقت نماز عصر ہے بس اے حسین بس
پیاسا لڑا نہیں کوئی یوں اژدہام میں
اب اہتمام چاہیے امّت کے کام میں

لبیکؔ کہہ کے تیغ رکھی شہ نے میان میں ‏ پلٹی سپاہ آئی قیامت جہان میں
پھر سرکشوں نے تیر ملائے کمان میں [(۱۷۶)] پھر کھل گئے لپٹ کے پھریرے نشان میں
بیکس حسین ظلم شعاروں میں گھر گئے
مولا تمھارے لاکھ سواروں میں گھر گئے

---

[۱] شاہین باز کی ایک بہت عمدہ قسم ہے۔ باز چکور کو پکڑ کر مار ڈالتا ہے لیکن خوف سے دونوں اس قدر بے حواس ہو گئے تھے کہ سر سے سر ملائے چھپے بیٹھے تھے۔ [۲] میں حاضر ہوں۔ پکارنے، بلانے، طلب کرنے کا جواب۔ [۳] بھاگنے کے ارادے سے فوجی جھنڈوں کے پھریرے لپیٹ لیے تھے۔ اب جم کر لڑنے کے خیال سے پھر کھول دیے۔

سینے پہ سامنے سے چلے دس ہزار تیر
چھاتی پہ لگ گئے کئی سو ایک بار تیر
(۱۷۷) پہلو کے پار برچھیاں سینے کے پار تیر
پڑتے تھے دس جو کھنچتے تھے تن سے چار تیر
یوں تھے خدنگ[2] ظلم الٰہی کے جسم پر
جس طرح خار ہوتے ہیں ساہی کے جسم پر

چلتے تھے چار سمت سے بھالے حسینؑ پر
ٹوٹے[1] ہوئے تھے برچھیوں والے حسینؑ پر
(۱۷۸) قاتل تھے خنجروں کو نکالے حسینؑ پر
یہ دکھ نبی کی گود کے پالے حسین پر
تیر ستم نکالنے والا کوئی نہ تھا
گرتے تھے اور سنبھالنے والا کوئی نہ تھا

لاکھوں میں ایک بیکس و دلگیر ہائے ہائے
فرزند فاطمہ کی یہ توقیر ہائے ہائے
(۱۷۹) بھالے وہ اور پہلوئے شبیر ہائے ہائے
وہ زہر میں بجھائے ہوئے تیر ہائے ہائے
غصے میں تھے جو فوج کے سرکش بھرے ہوئے
خالی کیے حسین پہ ترکش بھرے ہوئے

وہ گرد تھے جو بھاگتے پھرتے تھے وقت جنگ
اک سنگدل نے پاس سے مارا جبیں پہ سنگ
(۱۸۰) صدمے سے زرد ہو گیا سبط نبی کا رنگ
ماتھے پہ ہاتھ تھا کہ گلے پر لگا خدنگ
تھاما گلا جناب نے ماتھے کو چھوڑ کے
نکلا وہ تیر حلق مبارک کو توڑ کے

لکھا ہے تین بھال کا تھا ناوک ستم
منہ کھل گیا الٹ گئی گردن رکا جو دم
(۱۸۱) کھینچی سہ شعبہ[3] گلے کی طرف سے بہ چشم نم
بھالیں نکالیں پشت کی جانب سے ہو کے خم
ابلا جو خون نکلتا ہوا دم ٹھہر گیا
چلو رکھا جو زخم کے نیچے تو بھر گیا

دشمن تھا شہ کا اعور سلمی[4] عدوئے دیں
سر پر لگائی تیغ کہ شق ہو گئی جبیں
(۱۸۲) ماری جگر پہ ابن انس[5] نے سنان کیں
بھالا گڑا کے کوکھ میں برچھی کو اک لعیں
گھوڑے پہ ڈگمگا کے جو حضرت نے آہ کی
تھرا گئی ضریح[6] رسالت پناہ کی

---

۱ ٹوٹنا اور ٹوٹ پڑنا، بہت سے آدمیوں کا ایک ساتھ کسی پر حملہ کر دینا۔ ۲ تیر کا گز۔ وہ پتلی لکڑی جس کے سرے پر پیکاں لگا کر تیر بنا لیتے ہیں ۳ تیر کی نوکیں۔ تیروں کے پھل۔ ۴ یزیدی فوج کا ایک سپاہی۔ ۵ انس کا بیٹا۔ اس کا نام سنان تھا۔ ۶ قبر کے چاروں طرف کا کٹہرا۔ مجازاً قبر۔

گرتے ہیں اب حسین فرس پر سے ہو غضب — نکلی رکاب پائے مطہر سے ہو غضب
پہلو شگافتہ ہوا خنجر سے ہو غضب — (۱۸۳) غش میں جھکے عمامہ گرا سر سے ہو غضب
قرآن رحل زیں سے سر فرش گر پڑا — دیوار کعبہ بیٹھ گئی عرش گر پڑا

جنگل سے آئی فاطمہ زہرا کی یہ صدا — امت نے مجھ کو لوٹ لیا وا محمداؐ
اس وقت کون حق رفاقت کرے ادا (۱۸۴) — ہے ہے یہ ظلم اور دو عالم کا مقتدا
انیس سو ہیں زخم تن چاک چاک پر — زینب نکل حسین تڑپتا ہے خاک پر

پردہ الٹ کے بنت علی نکلی ننگے سر — لرزاں قدم خمیدہ کمر غرق خوں جگر
چاروں طرف پکارتی تھی سر کو پیٹ کر (۱۸۵) — اے کربلا بتا ترا مہمان ہے کدھر
اماں قدم اب اٹھتے نہیں تشنہ کام کے — پہنچا دو لاش پر مجھے بازو کو تھام کے

اس وقت سب جہاں مری آنکھوں میں ہے سیاہ — لوگو خدا کے واسطے مجھ کو بتاؤ راہ
سید کدھر تڑپتا ہے اماں کدھر ہیں آہ (۱۸۶) — کس سمت ہے نبی کے نواسے کی قتل گاہ
شعلے دل و جگر سے نکلتے ہیں آہ کے — یہ کون نام لیتا ہے میرا کراہ کے

کس نے صدا یہ دی کہ بہن اس طرف نہ آؤ — بس اب سفر قریب ہے للہ گھر میں جاؤ
اب ڈوبتی ہے آل رسول خدا کی ناؤ (۱۸۷) — یا مرتضیٰ عزیزوں کے بیڑے کو تم بچاؤ
اب چھوڑیو نہ دشت بلا میں حسین کو — یا فاطمہ چھپا لو ردا میں حسین کو

بنت علی تو پیٹتی پھرتی تھی ننگے سر — کٹتا تھا نور چشم علی کا گلا ادھر
زینب کو منع کرتے تھے ہر چند اہل شر (۱۸۸) — لیکن وہ دوڑی جاتی تھی کھائے ہوئے جگر
پہونچی جو قتل گاہ میں اس وکڈُک پر — دیکھا سر حسینؑ کو نیزے کی نوک پر

۱ے اس بیت میں امام حسین کا گھوڑے سے گرنا تین استعاروں میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ آپ کی عظمت وجلالت کا اظہار تدریجاً زیادہ سے زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ ۲ے محمد کی دہائی۔

نیزے کے نیچے جاکے پکاری وہ سوگوار — سید تری لہو بھری صورت کے میں نثار
ہے ہے گلے پہ چل گئی بھیا چھری کی دھار (۱۸۹) — بھولے بہن کو اے اسد حق کے کردگار
صدقے گئی لٹا گئے گھر وعدہ گاہ میں[1] — جنبش لبوں کو ہو ابھی ذکر آلہ میں

بھیا سلام کرتی ہے خواہر جواب دو — چلا رہی ہے دختر حیدر جواب دو
سوکھی زباں سے بہر پیمبر جواب دو (۱۹۰) — کیونکر جیے گی زینب مضطر جواب دو
جز مرگ درد ہجر کا چارا نہیں کوئی — میرا تو اب جہاں میں سہارا نہیں کوئی

بھیا میں اب کہاں سے تمھیں لاؤں کیا کروں[2] — کیا کہہ کے اپنے دل کو میں سمجھاؤں کیا کروں
کس کی دہائی دوں کسے چلاؤں کیا کروں (۱۹۱) — بستی پرائی ہے میں کدھر جاؤں کیا کروں
دنیا تمام اجڑ گئی ویرانہ ہو گیا — بیٹھوں کہاں کہ گھر تو عزاخانہ ہو گیا

ہی ہو تمھارے آگے نہ خواہر گزر گئی — بھیا بتاؤ کیا تہ خنجر گزر گئی
آئی صدا نہ پوچھو جو ہم پر گزر گئی (۱۹۲) — صد شکر جو گزر گئی بہتر گزر گئی
سر کٹ چکا ہمیں تو الم سے فراغ ہے — گر ہے تو بس تمھاری جدائی کا داغ ہے

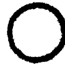
گھر لوٹنے کو آئے گی اب فوج نابکار — کہیو نہ کچھ زباں سے بجز شکر کردگار
خیمے میں جبکہ آگ لگا دیں ستم شعار (۱۹۳) — رہیو مری یتیم سکینہ سے ہوشیار
بیزار ہو وہ خستہ جگر اپنی جان سے — باندھے نہ کوئی اس کا گلا ریسمان سے

---

[1] وعدے کی جگہ۔ ایک روایت ہے کہ امام حسین نے بچپن میں اپنے نانا حضرت محمدؐ سے ان کی امت کی نجات کے لیے اپنا سر دینے اور ہر طرح کی مصیبتیں جھیلنے کا وعدہ کیا تھا جس کو میدان کربلا میں پورا کیا۔ اس لیے وعدہ گاہ سے کربلا مراد ہے۔

[2] اس ردیف سے انتہائی مجبوری و بےبسی ظاہر ہوتی ہے۔

بس اے انیسؔ ضعف سے لرزاں ہے بند بند — عالم میں یادگار رہیں گے یہ چند بند
نکلے قلم سے ضعف میں کیا کیا بلند بند(۱۹۴) — عالم پسند لفظ ہیں سلطاں پسند بند
یہ فصل اور یہ بزمِ عزا یادگار ہے
پیری کے ولولے ہیں خزاں کی بہار ہے



کس زیست پہ میل مال و اسباب کریں — کیوں زر کی ہوس میں دل کو بیتاب کریں
اک پارۂ ناں کے لیے لاحول ولا — اس گوہر آبرو کو بے آب کریں

دل نے غمِ بے حساب کیا کیا دیکھا — آنکھوں نے جہاں میں خواب کیا کیا دیکھا
طفلی و شباب و شیب و رنج و راحت — اس عمر میں انقلاب کیا کیا دیکھا

کہہ دے کوئی عیب جو سے سرگوشی میں — ڈھنپ جاتے ہیں سب عیب خطا پوشی میں
دامن ہے چراغ فکر کو جنبشِ لب — یہ شمع ضیا دیتی ہے خاموشی میں

سینے میں یہ دم شمعِ سحرگاہی ہے — جو ہے اس کارواں میں وہ راہی ہے
پیچھے کبھی قافلے میں رہتا نہ انیسؔ — اے عمرِ دراز تیری کوتاہی ہے

سلام

خود نوید زندگی لائی قضا میرے لیے (۱) شمع کشتہ[1] ہوں فنا میں ہے بقا میرے لیے

زندگی میں تو نہ اک دم خوش کیا ہنس بول کر — آج کیوں روتے ہیں میرے آشنا میرے لیے

کنج عزلت میں مثال آسیا ہوں گوشہ گیر — رزق پہنچاتا ہے گھر بیٹھے خدا میرے لیے

تو سراپا اجر اے زاہد میں سرتاپا گناہ — باغ جنت تیری خاطر کربلا میرے لیے

کہتے تھے شہ سخت ہے تیغ و گلو کا مرحلہ — یہ بھی مشکل سہل کر دے گا خدا میرے لیے

آبرو و مال و فرزندان صاحب عز و جاہ — کس کی خاطر یہ ہوا جو کچھ ہوا میرے لیے

بھر دیا دامن کو مولا نے در مقصود سے — زر دیا زر پر عطا پر کی عطا میرے لیے

نام روشن کر کے کیونکر بجھ نہ جاتا مثل شمع — ناموافق تھی زمانے کی ہوا میرے لیے

ہر نفس آئینہ دل سے یہ آتی ہے صدا — خاک تو ہو جا تو حاصل ہو جلا میرے لیے

بھیج دے جنت میں یا دوزخ میں یا محرم تو ہوں — تو ہے عادل جو مناسب ہو سزا میرے لیے

اے ہوس اپنی اپنی قسمت اسمیں رشک کیا — کیمیا تیرے لیے خاک شفا میرے لیے

خاک کو ہے خاک سے الفت تڑپتا ہوں انیسؔ
کربلا کے واسطے میں کربلا میرے لیے

رنج دنیا سے کبھی چشم اپنی نم رکھتے نہیں (۲) جز غم آل عبا[2] ہم اور غم رکھتے نہیں

---

[1] یہ مصرع اس فارسی شعر کے دوسرے مصرعے کا ترجمہ ہے

چو نفی نفی اثبات است از مردن نمی ترسم — بقائے من چو شمع کشتہ باشد در فنائے من

[2] عبا والے لوگ جب آیت تطہیر نازل ہوئی تو رسولؐ نے علیؑ فاطمہؑ حسنؑ حسینؑ کو اپنی عبا کے اندر لے لیا اور کہا کہ خداوندا یہی میرے اہلبیت ہیں تو ان کو پاک کر اور ان پر اپنی رحمت نازل کر۔ آل عبا سے یہی چاروں حضرات مراد ہیں۔

کربلا پہنچے زیارت کی نہیں پروا ہی کیا[1]
اب ارم بھی ہاتھ آئے تو قدم رکھتے نہیں

در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے
سر جہاں رکھتے ہیں سب ہم واں قدم رکھتے نہیں

دیکھنا کل ٹھوکریں کھاتے پھریں گے ان کے سر
آج نخوت سے زمیں پر جو قدم رکھتے نہیں

کہتے تھے اعدا کہ بچے بھی علی کے شیر ہیں
جب نکلتے ہیں تو پھر پیچھے قدم رکھتے نہیں

دھو دیے اشکوں نے دفتر سے تمام اعمال زشت
ہم ترا پروا کچھ اے ابر کرم رکھتے نہیں

جو سخی ہیں مال دنیا سے ہیں خالی ان کے ہاتھ
اہل دولت جو ہیں وہ دست کرم رکھتے نہیں

جو مقرر ہے وہ ملتا ہے تری سرکار سے
ہم ہیں صابر کچھ خیال بیش و کم رکھتے نہیں

زور سے اس کے لیا ہے ہم نے میدان سخن
اور نیزہ ہاتھ میں غیر از قلم رکھتے نہیں

یہ دوات و خامہ ہے ملک فصاحت کا نشاں
کون کہتا ہے کہ ہم طبل و علم[2] رکھتے نہیں

نقدیاں تک دے کے ہم جاتے ہیں اک وقت کوچ
عاریت جو شے ہو اس کو پاس ہم رکھتے نہیں

ایک کشکول توکل ایک نقد جاں ہے پاس
ہیں غنی دل کے کوئی دام و درم رکھتے نہیں

کہتے تھے سجاد کھنچ سکتی نہ تھیں جب بیڑیاں
کیا کروں اس بوجھ کی طاقت قدم رکھتے نہیں

مرثیہ اک دن میں کیا سب لکھ کے اٹھو گے انیس
ہاتھ سے کیوں آج قرطاس و قلم رکھتے نہیں

(۳)

نمود و بود کو عاقل حباب سمجھے ہیں
وہ جاگتے ہیں جو دنیا کو خواب سمجھے ہیں

کبھی برا نہیں جانا کسی کو اپنے سوا
ہر ایک ذرے کو ہم آفتاب سمجھے ہیں

کریم مجھ کو عطا کر وہ فقر دنیا میں
کہ جس کو فخر رسالت مآب سمجھے ہیں[3]

بھگو کے کھاتے ہیں پانی میں نان خشک کو وہ
اس آبرو کو جو موتی کی آب سمجھے ہیں

---

[1] اس شعر میں کربلا کی زیارت کا شرف اور ایک زائر کربلا کا استغنا دکھایا گیا ہے۔ میر انیس نے خود کربلا کی زیارت نہیں کی تھی۔ [2] نقارہ اور نشان جو شاہی کے لوازم ہیں۔ [3] اس شعر میں رسولؐ کے اس قول کی طرف اشارہ ہے اَلفَقرُ فَخرِی یعنی فقیری میرا فخر ہے۔

ابو تمراب کے در کا ہے ذرۂ بے قدر	ہم آسماں پہ جسے آفتاب سمجھے ہیں
ارے نہ آئیو دنیائے دوں کے دھوکے میں	سراب ہے یہ جسے موج آب سمجھے ہیں
یہ اشک تاک ہو کہتے ہیں جس کو آب طرب	یہ خون گل ہو جسے سب گلاب سمجھے ہیں
شباب کھو کے بھی غفلت وہی ہو پیروں کو	سحر کی نیند کو بھی شب کا خواب سمجھے ہیں
خدا کی راہ میں ایذا سے جن کو راحت ہے	زمین گرم کو وہ فرش خواب سمجھے ہیں

انیس مخمل و دیبا سے کیا فقیروں کو
اسی زمین کو ہم فرش خواب سمجھے ہیں

کوئی انیس کوئی آشنا نہیں رکھتے (۷۸) کسی کی آس بغیر از خدا نہیں رکھتے

نہ روئے بیٹوں کے غم میں حسین واہ رے صبر	یہ داغ ہوش بشر کے بجا نہیں رکھتے
کسی کو کیا ہو دلوں کی شکستگی کی خبر	کہ ٹوٹنے میں یہ شیشے صدا نہیں رکھتے
حسین کہتے تھے سونے کو پاؤں پھیلا کر	سوائے قبر کوئی اور جا نہیں رکھتے
سوائے کوثر و تسنیم خلد و باغ بہشت	یہ اشک ہیں وہ گہر جو بہا نہیں رکھتے
قناعت و گہر و آبرو و دولت دیں	ہم اپنے کیسۂ خالی میں کیا نہیں رکھتے
فشار[1] قبر کا ڈر ہو تو ان کو ہو جو لوگ	کفن میں صرۂ[2] خاک شفا نہیں رکھتے
ہمیں تو دیتا ہو رازق بغیر منت خلق	وہی سوال کریں جو خدا نہیں رکھتے
فقیر دوست جو ہو ہم کو سرفراز کرے	کچھ اور فرش بجز بوریا نہیں رکھتے
غم حسین کے داغوں سے دل کو روشن	خبر لحد کے اندھیرے کی کیا نہیں رکھتے
مسافرو شب اول بہت ہے تیرہ و تار	چراغ قبر ابھی سے جلا نہیں رکھتے

---

[1] گنہگار آدمی کی قبر تنگ ہو کر اس کو دباتی ہے۔ اس کو فشار قبر کہتے ہیں۔
[2] کربلا کی مٹی کی چھوٹی سی پوٹلی۔

خدا نے آیۂ تطہیر[1] جن کو بھیجا تھا — وہ پردہ دار سروں پر ردا نہیں رکھتے
سکینہ کہتی تھی کیونکر نہ دم گھٹے اماں — وہاں ہیں بند جو حجرے ہوا نہیں رکھتے
فلک پہ شور تھا کٹتا ہے حلق پاک رسول — حسین تیغ کے نیچے گلا نہیں رکھتے
بہا دے آل نبی کیا نہ بچے تباہی سے — تلاطم ایسا ہو اور ناخدا نہیں رکھتے
گلوئے اصغر معصوم و تیر و اف رے بلا — یہ ظلم وہ ہیں کہ جو انتہا نہیں رکھتے
فقط حسینؑ پہ یہ تفرقہ پڑا ورنہ — کسی کی لاش کو سر سے جدا نہیں رکھتے

انیس بیچ کے جاں اپنی ہند سے نکلو
جو توشۂ سفر کربلا نہیں رکھتے

اسی کا نور ہر اک شے میں جلوہ گر دیکھا (۵) اسی کی شان نظر آگئی جدھر دیکھا

علی کو حق نے اتارا تو عین کعبے میں — کھلی جو آنکھ تو پہلے خدا کا گھر دیکھا
بروز عید بھی آیا جو کوئی ملنے کو — غم حسینؑ میں عابدؑ[2] کو نوحہ گر دیکھا
قریب قبر ہم آئے کہاں کہاں پھر کر — تمام عمر ہوئی جب تو اپنا گھر دیکھا
سحر ہوئی شب معراج کی تو لوگوں نے — جمال پاک رخ سیّد البشر دیکھا
کہا یہ سب نے غلاموں سے کیجئے ارشاد — جو کچھ حضور نے یا شاہ بحر و بر دیکھا
گہر فشاں ہوئے لعل لب رسول کریم — کہ سب سے رتبۂ حیدر زیادہ تر دیکھا
ورائے کرسی و عرش عظیم و لوح و قلم — وصی کا نور ہر اک شے میں جلوہ گر دیکھا
دلی ولی کی صدا تھی جہاں جہاں پہنچے — علی علی نظر آئے جدھر جدھر دیکھا

---

[1] قرآن کی یہ آیت اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا یعنی خدا چاہتا ہے کہ تم اہل بیت سے نجاست کو دور کرے اور تم کو پاک و پاکیزہ کرے۔ اس آیت میں رسول کے اہل بیت سے خطاب ہے۔
[2] انتہائی افسوس کا کرنے والا۔ [3] عبادت کرنے والا۔ امام حسینؑ کے ایک صاحبزادے جو کربلا کی جنگ میں باقی رہ گئے تھے ان کا نام علی تھا لیکن عبادت کی کثرت کی وجہ سے عابد، سجاد اور زین العابدین کہلاتے ہیں۔

کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیس
عروج مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

عز شہ کا جس نے بیاں کر دیا (۶) ان آنکھوں نے دریا رواں کر دیا
گھٹا زور شق سخن بڑھ گئی ضعیفی نے ہم کو جواں کر دیا
سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر مگر ہم نے پلہ گراں کر دیا
مری قدر کر اے زمین سخن تجھے بات میں آسماں کر دیا
لکھی شہ کے خال معنبر کی مدح قلم نے ہمیں نکتہ داں کر دیا
زہے شفقت سبط خیر الورٰی عجب رتبۂ میہماں کر دیا
کوئی جانتا بھی نہ تھا حُر کا نام اسے دم میں جان جہاں کر دیا
کہاں ایک ذرّہ کہاں آفتاب خدا نے تجھے مہرباں کر دیا
گھٹا فکر میں جسم مثل قلم سراپا کو صرف زباں کر دیا
نہ کی آہ کچھ عمر رفتہ کی قدر عجب جنس کو رائیگاں کر دیا
نہ دیکھی گئی شہ سے اصغر کی لاش زمیں میں پسر کو نہاں کر دیا
ہوئے دفن اکبر تو چلائی ماں اجل نے زمیں میں نہاں کر دیا
چھپانے لگے ہم سے منھ قبر میں انھیں جب خدا نے جواں کر دیا
جو پوچھی علمدار نے جائے قبر ترائی میں شہ نے نشاں کر دیا

نواسنجیوں نے تری اے انیس
ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

سدا ہے فکر ترقی بلند ہمتوں[1] کو (۷) ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں[2] کو

---

[1] ذی حوصلہ، ہمت والا، بلند خیال

[2] شاعروں کی اصطلاح میں وزن، قافیہ اور ردیف کا مجموعہ۔

پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو | خیال صنعتِ صانع ہو پاک بینوں کو
لحد میں سوئے ہیں چھوڑا ہے شہ نشینوں کو | قضا کہاں سے کہاں لے گئی مکینوں کو
یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعف پیری نے | چُنا ہے جامۂ ہستی کی آستینوں کو
لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار | خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
بجا ہے اس لیے اکبر سے تھا حسین کو عشق | کہ دوست رکھتا ہے اللہ بھی حسینوں کو
غضب ہوا اہل ستم اس میں جائیں درانہ | جس آستاں پہ ملائک رکھیں جبینوں کو
نظر میں پھرتی ہے وہ تیرگی وہ تنہائی | لحد کی خاک ہو سرمہ مال بینوں کو
بشر کو چاہیے دنیا میں اسکے حسن سے عشق | کہ جس نے خلق میں پیدا کیا حسینوں کو
غلط یہ لفظ وہ بندش بری یہ مضموں سست | ہنر عجیب ملا ہے یہ نکتہ چینوں کو
لگا دغا میں ٹپکنے لہو جو قبضے سے | چڑھا لیا شہ والا نے آستینوں کو
دہان کیسۂ زر بند رکھ پرائے منعم | خدا کے واسطے واکر جبیں کی چینوں کو

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

علی سا بھی نہ کوئی عادل زمانہ ہوا | کہ ایک باز و کبوتر کا آشیانہ ہوا
سیاہ دیدۂ شبیر میں زمانہ ہوا | ہوائے ظلم سے جب گل چراغ خانہ ہوا
امیر جس در دولت پہ اک زمانہ ہوا | وہ گھر اجڑ گیا غارت وہ کارخانہ ہوا

کا ماحصل۔

لہ بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ۔ پرانے طرز کے مکانوں میں صدر دالان کے بعد ایک دوسرا دالان جسکی کرسی تین چار فٹ اونچی ہوتی ہو۔ ہ میر تقی میر نے اس مضمون کو یوں ادا کیا تھا ہے

ہاتھوں پہ یہ جھریاں نہیں ہیں | پیری جامے کو چن رہی ہے

ہ اس قول کی طرف اشارہ ہو۔ اللہ جمیلٌ ویحبُّ الجمال۔ یعنی خدا حسین ہو اور حسن کو دوست رکھتا ہو۔
ہ یعنی حضرت علی کے عدل کا نتیجہ یہ ہوا کہ ظالم نے ظلم کو ترک کر دیا اور مظلوم کو ظالم کا خوف باقی نہیں رہا یہاں تک کہ باز اور کبوتر ایک آشیانے میں ساتھ رہنے لگے۔ ہ گھر کا چراغ بجھ گیا یعنی جیتا مر گیا۔

کہیں بسے نہ مکاں طرفہ کارخانہ ہوا — زمیں الٹ گئی کیا منقلب زمانہ ہوا

حسین نے کبھی شکوہ کیا نہ امت کا — گلہ ہوا بھی کسی سے تو دوستانہ ہوا

بچھا ہو فاقے کے تا فاقہ جس کا خوان کرم — نصیب اسے نہ کئی دن تک آب و دانہ ہوا

حباب تھا کہ دم واپسیں کی آمد و شد — یہ مضطرب ادھر آیا ادھر روانہ ہوا

[illegible] زندے پھرتے ہیں قبروں پہ کہتے ہیں کٹے — کہ ہم بھی پھرتے تھے یونہی اسے زمانہ ہوا

اندھیری قبر تھی اور میں تھا یا علی ولی — حضور آئے تو روشن سیاہ خانہ ہوا

گرائی برق اسی پر فلک نے یا تقدیر — جو کھیت میں مری قسمت کا ایک دانہ ہوا

لحد یہ کہتی ہو میت سے اب ہیں تو اور میں — جو ساتھ آیا تھا وہ قافلہ روانہ ہوا

کیا قبول قناعت سے بحر عالم میں — صدف کی طرح میسر جو آب و دانہ ہوا

پڑا جو سایہ گیسوے پیچ دار حسین — تو ذوالجناح یہ سمجھا کہ تازیانہ ہوا

کشاں کشاں مجھے جانا پڑا وہاں آخر — جہاں جہاں مری قسمت کا آب و دانہ ہوا

سحاب[1] سایے میں رکھتا تھا جس کے نانا کو — لحد کو اس کی میسر نہ شامیانہ ہوا

ملا نہ اصغر ناداں کو جام پانی کا — صراحی دار گلا تیر کا نشانہ ہوا

وہ زلف چوب سناں میں بندھی ہزار افسوس — نبی کے پنجۂ مژگاں سے جس میں شانہ ہوا

رہا نہ کوئی بہتر[2] میں ظہر تک باقی — حسین رہ گئے سب قافلہ روانہ ہوا

فراق شہ کا نہ صدمہ اٹھا سکینہ سے — قلق سے جان گئی موت کا بہانہ ہوا

بھٹک کے راہ سے پیچھے کہیں نہ رہ جاؤ
اٹھو انیس اٹھو کارواں روانہ ہوا

---

[1] روایت ہے کہ بادل کا ایک ٹکڑا حضرت محمدؐ کے سر پہ سایہ کیے رہتا تھا۔ آپ کے ایک عمامے کا نام بھی 'سحاب' تھا۔ اس کا رنگ گلابی تھا اور وہ جنگ خندق کے موقع پر حضرت علیؓ کے سر پہ باندھا گیا تھا۔

گزر گئے تھے کئی دن کہ گھر میں آب نہ تھا (۹) مگر حسینؑ سے صابر کو اضطراب نہ تھا

نمود و بود بشر کیا محیط عالم میں — ہوا کا جب کوئی جھونکا چلا حباب نہ تھا

فشار سے جو بچا میں ہوا زمیں کو عجب — عطائے قبر نے دی حکم بوتراب نہ تھا

اگر بہشت میں ہوتے نہ کوثر و تسنیم[1] — تو رونے والوں کی آنکھوں کا کچھ جواب نہ تھا

نہ جانے برق کی چشمک تھی یا شرر کی لپک — ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا

حسینؑ اور طلب آب اے معاذ اللہ — تمام کرتے تھے حجت سوال آب نہ تھا

جسے[2] نبی نے بلایا ہوا وہ نخل نہال — ثمر اسے بھی دیے جو کہ باریاب[3] نہ تھا

حضور شاہ پھر آیا کہاں سے حُر شہید — خطا کی راہ میں گو جادۂ صواب نہ تھا

علی کے پائے مبارک نے جو ضیا پائی — وہ نور حضرت موسیٰ کو دستیاب[4] نہ تھا

ہر اک کے ساتھ ہو روشن دلو طلوع و غروب — سحر کو چاند نہ تھا شب کو آفتاب نہ تھا

فقط حسینؑ کے بچوں پہ بند تھا پانی — بہت قریب تھی وہ نہر قحط آب نہ تھا

انیسؔ عمر بسر کر دو خاکساری میں
کہیں نہ یہ کہ غلام ابو تراب نہ تھا

مرا راز دل آشکارا نہیں (۱۰) وہ دریا ہوں جس کا کنارا نہیں

وہ گل ہوں جدا سب سے ہے جس کا رنگ — وہ بو ہوں کہ جو آشکارا نہیں

وہ پانی ہوں شیریں نہیں جس میں شور — وہ آتش ہوں جس میں شرارا نہیں

---

[1] بہشت کا ایک چشمہ۔ [2] اس شعر میں رسول کے دو معجزوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک یہ کہ آپ جس درخت کو بلاتے تھے وہ آپ کے پاس چلا آتا تھا۔ دوسرا یہ کہ ایک مرتبہ آپ نے ایک سوکھے ہوئے درخت پر کلی کر دی تو وہ درخت سبز اور پھل دار ہو گیا۔ شیخ ناسخ نے ذیل کے شعر میں پہلے معجزے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

آدمی کیا کہ ترے فرماں سے — دوڑے آئیں ہیں لاکھ بار درخت

[3] اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ جو نبی کی خدمت میں حاضر نہ تھا دوسرے یہ کہ جو پھل دار نہ تھا اسکے پھل [illegible] [4] حضرت موسیٰ کے ہاتھ میں ایک نہایت چمک دار نشان تھا۔ یہاں دستیاب کا استعمال لفظ کے لغوی معنوں میں ہوا ہے۔

بہت زال دنیا نے دیں بازیاں　　میں وہ نوجواں ہوں کہ ہارا نہیں
فقیروں کی مجلس ہے سب سے جدا　　امیروں کا یاں تک گوارا نہیں
سکندر کی خاطر بھی ہے سد باب　　جو دارا بھی ہو تو مدارا نہیں
گے[۱] پہنے نعلین واں مصطفےٰ　　فرشتے کا جس جا گوارا نہیں
جہنم سے ہم بے قراروں کو کیا　　جو آتش پہ ٹھہرے وہ پارا نہیں
پھرے دوست جب ہوگئی قبر بند　　کھلا اب کہ کوئی ہمارا نہیں
گرے ڈگمگا کر زمیں پر حسینؑ　　فرس سے کسی نے اتارا نہیں

کسی نے تری طرح سے اے انیسؔ
عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

ضبط گو یہ ماتم سرور میں ہو سکتا نہیں　(۱۱)　سر جھکا کر بیٹھ مجلس میں جو رو سکتا نہیں
رات اندھیری پرسش اعمال ایذائے فشار　　قبر میں بھی چین سے انسان سو سکتا نہیں
کار[۲] ذاتی میں ہیں عاجز کارسازان جہاں　　اپنے منھ کی گرد پانی آپ دھو سکتا نہیں
کہتے تھے حضرت وہ مشرق میں کہ مغرب میں ہیں　　دوستوں کے ہم نکام اُنہیں یہ ہو سکتا نہیں
شاہ کہتے تھے کہ دنیا بھی ہے عبرت کی جگہ　　مر گیا بیٹا جواں اور باپ رو سکتا نہیں

نظم ہے یا گوہر شہوار کی لڑیاں انیسؔ
جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں

شبیہ امام زماں کھینچتے ہیں　(۱۲)　تصور میں تصویر جاں کھینچتے ہیں
جگہ مول لی ہے مزاروں کی خاطر　　زمیں پر[۳] شہ دیں نشاں کھینچتے ہیں

---

[۱] معراج کی شب میں رسول عرش تک جوتا پہنے ہوئے چلے گئے حالانکہ سب سے مقرب فرشتہ یعنی جبرئیل بھی چوتھے آسمان سے آگے نہیں جا سکتا [۲] یہ شعر اس فارسی شعر کا لفظ بہ لفظ ترجمہ ہے ؎
کارسازان جہاں در کار خود درماندہ اند　　آب نتوانند کہ شوید گرد از رخسار خویش
[۳] بادشاہوں کے قابل۔

بہت ہم کو پیسا ہو اک دن تجھے بھی — شکنجے میں اے آسماں کھینچتے ہیں
قریں سر کے ہو آفتاب قیامت — لحد پر عبث سائباں کھینچتے ہیں
محبت کا رشتہ نہایت ہو نازک — مجھے کس لیے قدرداں کھینچتے ہیں
دکھا دوں زمین نجف کی بلندی — بہت آپ کو آسماں کھینچتے ہیں
زمیں کے تلے جس کو جانا ہو اک دن — وہ کیوں سر کو تا آسماں کھینچتے ہیں
فقیروں نے یاں پاؤں پھیلا دیے ہیں — عبث ہاتھ اہل جہاں کھینچتے ہیں
جھکاتے ہیں سر آستانِ علی پر — سرِ فخر تا لامکاں کھینچتے ہیں
نکلیو نہ بدلی سے اے برق خاطف[1] — حسین آہ آتش فشاں کھینچتے ہیں
سخن ہے اگر باعث تلخ کامی — تو ہم آپ اپنی زباں کھینچتے ہیں
زمیں دار سیراب ہیں کربلا کے — اذیت امام زماں کھینچتے ہیں
اِدھر خشک ہو فاطمہ کی زراعت — وہ کھیتوں میں آب رواں کھینچتے ہیں
ہوا جن کو لگنے نہ دیتی تھی بلبل — وہی گل جفائے خزاں کھینچتے ہیں
کہاں بیڑیاں اور کہاں پائے عابد — یہ لنگر کہیں ناتواں کھینچتے ہیں
پسینہ نہیں پونچھتے رُخ سے حضرت — گلاب[2] گل ارغواں کھینچتے ہیں
کہا حُر سے شہ نے گناہوں پہ تیرے — خط عفو[3] آئے مہماں کھینچتے ہیں
انھیں کے لیے ہے زمانے کی تلخی — بڑے رنج شیریں زباں کھینچتے ہیں
عجب حال ہے دخترِ فاطمہؑ کا — ردا سر سے ایذا رساں کھینچتے ہیں
پکاری سکینہ دہائی ہے بابا — ستم گر مری بالیاں کھینچتے ہیں

---

[1] تیزی سے چمکنے والی۔ [2] اس شعر میں امام کے دھوپ سے تمتمائے ہوئے چہرے کو ارغواں کے سرخ پھول سے اور آپ کے پسینے کو خوشبو کے اعتبار سے گلاب سے تشبیہ دی ہے۔
[3] خط عفو کھینچنا۔ جرم کو قلم زد کر دینا۔ قصور معاف کر دینا

جسے دیکھ کر ہوئے مانی کو حیرت وہ تصویر رنگیں بیاں کھینچتے ہیں
کہا رو کے اکبر نے اے درد تھم جا کلیجے سے بابا سناں کھینچتے ہیں

انیسؔ اس زمیں میں بہت کم ہو وسعت
کمیتِ[1] قلم کی عناں کھینچتے ہیں

ابتدا سے ہم ضعیف و ناتواں پیدا ہوئے (۱۳) اڑ گیا جب رنگ رخ سے استخواں[2] پیدا ہوئے
خاکساری نے دکھائیں رفعتوں پر رفعتیں اس زمیں سے دلو کیا کیا آسماں پیدا ہوئے
علم خالق کا خزانہ ہو میان کاف و نون ایک کن کہنے سے یہ کون و مکاں پیدا ہوئے
ہاتھ خالی آئی لاشوں پر شہیدوں کے نسیم پھول بھی اس فصل میں ایسے گراں پیدا ہوئے
نوبت جمشید و دارا و سکندر اب کہاں خاک تک چھانی نہ قبروں کے نشاں پیدا ہوئے
جو عدم سے آگیا دنیا میں بولی ہنس کے موت اور اک دو چار دن کے میہماں پیدا ہوئے
ضبط دیکھو سب کی سن لی پر نہ اپنی کچھ کہی اس زباں دانی پہ گویا بے زباں پیدا ہوئے
جان دی حُر نے تو حضرت نے دیا باغ ارم[3] میہماں ایسے نہ ایسے میزباں پیدا ہوئے
بو دو نابود علی اصغر کو کیا کیجے بیاں بے زباں دنیا سے اٹھے بے زباں پیدا ہوئے
دیکھ کر لاشوں کو حضرت کہتے تھے وا غربتا موت لے آئی کہاں انکو کہاں پیدا ہوئے

احتیاط جسم کیا انجام کو سوچو انیسؔ
خاک ہونے کو یہ مشت استخواں پیدا ہوئے

شبیر کے غم میں رو رہے ہیں (۱۴) منھ آب گہر سے دھو رہے ہیں

---

[1] سرخ رنگ کا گھوڑا جس کی یال اور دم سیاہ ہو۔

[2] انتہا کی لاغری دکھائی ہے۔ مراد یہ ہے کہ چہرے پر گوشت بالکل تھا ہی نہیں صرف ہڈیوں پر رنگ پھرا ہوا تھا۔ اس لیے رنگ کے اڑ جانے سے ہڈیاں دکھائی دینے لگیں۔ [3] بہشت

گندم[۱] سے گندم ہے جو سے جو ہے — کاٹیں گے وہی جو بو رہے ہیں
بے رنج ہیں خفتگانِ مرقد — کیسے راحت سے سو رہے ہیں
بے آب ہے شہ کو تیسرا دن — اعدا سیراب ہو رہے ہیں
بیڑا امت کا تھامنے کو — کشتی اپنی ڈبو رہے ہیں
اکبر سے پسر کو دی ہے رخصت — اپنی دولت کو کھو رہے ہیں
محبوب خدا کے تن کے کپڑے — اعدا خوں میں ڈبو رہے ہیں
روتے نہیں بزم میں گنہ گار — فردیں عصیاں کی دھو رہے ہیں
ہے سلک گہر یہ رشتہ نظم — کیا کیا موتی پرو رہے ہیں

بہتا ہے انیسؔ خون انصاف
مضموں مرے قتل ہو رہے ہیں

پڑا جو عکس تو ذرّہ بھی آفتاب بنا (۵) خدا کے نور سے جسم ابوتراب بنا
بنائے روضۂ سرور جو کربلا میں ہوئی — ملک پکارے کہ اب خلد کا جواب بنا
عمارتیں تو بنائیں خراب ہونے کو — اب اپنی قبر بھی اے خانماں[۲] خراب بنا
یہ مشتعل ہوئی سینے میں آتشِ غمِ شاہ — کہ آہ سیخ بنی اور دل کباب بنا
مرے گناہوں کے دفتر نے ابتری کی ہے — نئے سیاق سے بگڑا ہوا حساب بنا
جو آبرو کی طلب ہے تو کر عرق ریزی — یہ کشمکش ہوئی تب پھول سے گلاب بنا
ہوا پہ[۳] کیوں ہیں تنک مایگانِ بحرِ جہاں — جو بڑھ گیا کوئی قطرہ تو کیا حباب بنا
ترے سلام میں ہو مرثیے کا سا لطف — انیسؔ نظمِ غمِ شہ میں اک کتاب بنا

---

۱ یہ اس فارسی مصرعے کا ترجمہ ہے: "گندم از گندم بروید جو ز جو"
۲ خان و مان کے معنی ہیں مکان اور اسباب۔ 'خانماں خراب' ایک طرح کی بددعا ہے۔
۳ ہوا پر ہونا۔ دون کی لینا۔ تعلّی کرنا۔ اترانا۔ بیجا فخر کرنا۔

رُباعیاں

پتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو — آنکھیں جسے ڈھونڈھتی ہیں وہ نور ہے تو
اقرب ہو رگ جاں سے اور اس پہ یہ بعد (۱) — اللہ اللہ کس قدر دور ہے تو

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے — بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا (۲) — جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں — یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے (۳) — حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے — وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی (۴) — جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

---

۱ قرآن کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے۔ "نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ" یعنی میں انسان کی رگ گردن سے زیادہ قریب ہوں۔ ۲ یہ رباعی میر جلال الدین سیادت کشمیری کی مندرجہ ذیل رباعی سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے۔

آنکس کہ دلش پر بود از گوہر راز — ہرگز نہ بود بشہرتش روے نیاز
بے مغز ہمیشہ میل شہرت دارد — در کاسۂ خالی نہ بود جز آواز

۳ جن کا دماغ خالی ہو۔ نا فہم۔ بے سمجھ۔

مال و زر و افسر[1] و حشم ملتا ہے ممکن ہے نگیں[2] طبل و علم ملتا ہے
عنقا گوگرد[3] سرخ پارس[4] اکسیر[5] (۵) یہ سب ملتے ہیں دوست کم ملتا ہے

آدم کو عجب خدا نے رتبہ بخشا ادنیٰ کے لیے مقام اعلا بخشا
عقل و ہنر و تمیز و جان و ایماں (۶) اس ایک کف خاک کو کیا کیا بخشا

توقیر ترے ہی آستانے سے ملی عزت ترے در پہ سر جھکانے سے ملی
مال و زر و آبرو و دین و ایماں (۷) کیا کیا دولت ترے خزانے سے ملی

یہ اوج یہ مرتبہ ہما کو نہ ملے یہ دلق[6] مرقع[7] امرا کو نہ ملے
بخشی ہے خدا نے ہم کو وہ دولت فقر (۸) برسوں ڈھونڈھے تو بادشا کو نہ ملے

دولت کا ہمیں خیال آتا ہی نہیں یہ نشۂ فقر ہے کہ جاتا ہی نہیں
لبریز ہیں یہ دولت استغنا سے (۹) آنکھوں میں کوئی غنی سماتا ہی نہیں

عزت رہے یار و آشنا کے آگے محجوب نہ ہوں شاہ و گدا کے آگے
یہ پاؤں چلیں تو راہ مولا میں چلیں (۱۰) یہ ہاتھ جب اٹھیں تو خدا کے آگے

---

[1] تاج۔ [2] نگ، نگینہ۔ انگوٹھی۔ یہاں بادشاہ کی مہر کی انگوٹھی مراد ہے۔
[3، 4 و 5] 'گوگرد سرخ' کے معنی ہیں لال رنگ کی گندھک۔ 'پارس' ایک قسم کا پتھر ہے۔ 'اکسیر' کیمیاوی عمل سے تیار کی ہوئی خاکستر کو کہتے ہیں۔ ان تینوں چیزوں سے مختلف دھاتوں کو سونا بنا سکتے ہیں اور یہ تینوں چیزیں نہایت کمیاب ہیں۔ اس لیے ان کا ذکر عنقا کے ساتھ کیا گیا ہے۔ [6] گدڑی۔ [7] پیوندہ

کٹ[۱] جاتے ہیں خود رنگ[۲] بدلنے والے　　کب تھمتے ہیں جو اشک ہیں ڈھلنے والے
اللہ رے ترے سخن کی تاثیر انیس (۱۱) رو دیتے ہیں مثل شمع جلنے والے[۳]

بلبل یاں آکے خوش بیانی سیکھے　　انداز فغاں مجھ سے فغانی[۴] سیکھے
رونا مری آنکھوں سے کرے حاصل ابر (۱۲) دریا مرے اشکوں سے روانی سیکھے

نافہم سے کب داد سخن لیتا ہوں　　دشمن ہو کہ دوست سب کی سُن لیتا ہوں
چھپتی نہیں بوے دوستان یک رنگ (۱۳) کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لیتا ہوں

جس شخص کو عقبیٰ کی طلب گاری ہے　　دنیا سے ہمیشہ اسے بیزاری ہے
اک چشم میں کس طرح سمائیں دونوں (۱۴) غافل یہ خواب ہے وہ بیداری ہے

راحت کا مزہ عدوے جانی نکلا　　دل سے نہ کبھی غم نہانی نکلا
پیاسے رہے آکے چاہ دنیا پہ انیس (۱۵) نکلا بھی کبھی تو شور پانی نکلا

کیوں زر کی ہوس میں دربدر پھرتا ہے　　جانا ہے تجھے کہاں کدھر پھرتا ہے
اللہ ری پیری میں ہوس دنیا کی (۱۶) تھک جاتے ہیں جب پاؤں تو سر[۵] پھرتا ہے

---

۱ شرمندہ ہو جاتے ہیں۔ ۲ موافق ہو کر مخالف ہو جانے والے۔ تھالی کے بینگن جو کبھی ادھر ہیں کبھی اُدھر۔ ۳ حسد کرنے والے۔ حاسد شمع کی مثال نہایت مناسب ہو کر وہ جلتی بھی ہے اور روتی بھی ہے۔ ۴ ایران کا ایک مشہور شاعر۔ نالہ و فریاد کرنے والا۔ یہاں یہ دونوں معنی لیے جا سکتے ہیں۔ ۵ سر چکرانا۔ دماغ پریشان ہونا۔

دولت کی نہ خواہش ہے نہ زر چاہتے ہیں — نہ مال نہ اسباب نہ گھر چاہتے ہیں
جو مزرع آخرت ہے وہ خشک نہ ہو (۱۷) — ہاں اک تری رحمت کی نظر چاہتے ہیں

نیساں[1] کو خجل دیدۂ تر سے پایا — دامن کو بھرا ہوا گہر سے پایا
یہ لطف اٹھایا نہ کسی شادی میں (۱۸) — جو حظ غم شاہ بحر و بر سے پایا

ہر دم غم سبط شہ لولاک[2] کیا — جب نام لیا چشم کو نمناک کیا
تر ہو گیا رومال تو پھاڑا دامن (۱۹) — پایا نہ گریباں تو جگر چاک کیا

مجلس میں عجب بہار چشم تر سے ہے — ہر لخت جگر رشک گل احمر سے ہے
اشکوں سے ہو کیوں نہ آبرو آنکھوں کی (۲۰) — بے قدر ہے وہ صدف جو بے گوہر ہے

ہوتی ہے ہر ایک شے کی عالم میں بہار — شادی کی خوشی میں غم کی ہے غم میں بہار
چھایا ہے دلوں پہ ابر اندوہ و ملال (۲۱) — رونے کی ہے عشرۂ محرم میں بہار

کس دن فرس خامہ تگ و دو میں نہیں — مجھ سا بھی سیہ بخت کوئی سو میں نہیں
ہر چند کہ ہوں خسرو اقلیم سخن (۲۲) — پر غیر دوات کچھ قلمرو میں نہیں

---

[1] موسم بہار کا ایک مہینہ یہاں آب نیساں مراد ہے یعنی وہ پانی جو ماہ نیساں میں برسے کہتے ہیں کہ آب نیساں کا جو قطرہ سیپ کے منھ میں چلا جاتا ہے وہ موتی بن جاتا ہے۔

[2] اشارہ ہے اس آیت کی طرف لولاک لما خلقت الافلاک یعنی اے محمدؐ اگر تم نہ ہوتے تو میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا۔ شہ لولاک سے مراد ہیں پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ۔

کیا حال کہیں دل کی پریشانی کا   کھانے کی نہ لذّت نہ مزہ پانی کا
مر رہیے کسی دشت کے دامن میں انیسؔ (۲۳)   پردہ ہے یہی جامۂ عریانی کا

چل جلد اگر قصدِ سفر رکھتا ہے   تو کچھ بھی مآل کی خبر رکھتا ہے
راحت دنیا میں کس نے پائی ہے انیسؔ (۲۴)   جو سر رکھتا ہے دردِ سر رکھتا ہے

کیا کیا دنیا سے صاحبِ مال گئے   دولت نہ گئی ساتھ نہ اطفال گئے
پہنچا کے لحد تلک پھر آئے سب لوگ (۲۵)   ہمراہ اگر گئے تو اعمال گئے

افسوس جہاں سے دوست کیا کیا نہ گئے   اس باغ سے کیا کیا گلِ رعنا نہ گئے
تھا کون سا نخل جس نے دیکھی نہ خزاں (۲۶)   وہ کون سے گل کھلے جو مرجھا نہ گئے

ادبار کا کھٹکا حشم و جاہ میں ہے   جاگو جاگو کہ خوف اس راہ میں ہے
اٹھو اٹھو یہ خوابِ غفلت کب تک (۲۷)   دیکھو دیکھو اجل کمیں[۱] گاہ میں ہے

پیری آئی عذار بے نور ہوئے   یارانِ[۲] شباب پاس سے دور ہوئے
لازم ہے کفن کی یاد ہر وقت انیسؔ (۲۸)   جو مشک سے بال تھے وہ کافور[۳] ہوئے

۱۔ چھپ کر گھات لگانے کی جگہ۔ ۲۔ جوانی کے زمانے کے دوست، ایک معمر بزرگ جو مرثیہ خوانی کے فن سے بخوبی واقف تھے اور شاید میر انیسؔ کا پڑھنا سن چکے تھے وہ جب یہ رباعی پڑھتے تھے تو "یارانِ شباب" کہتے وقت اپنے دانتوں کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ اس طرح یہ رباعی پیری کا ایک صحیح مرقع بن جاتی ہے۔ رخساروں کی بے رونقی، دانتوں کا ٹوٹنا، بالوں کا سفید ہو جانا یہی تینوں چیزیں بڑھاپے کی نمایاں علامتیں ہیں۔ ۳۔ سفید ہو گئے۔

دردو الم ممات کیونکر گزرے یہ چند نفس حیات کیونکر گزرے
پیری کی ڈھلی دو پہر ڈھلی شکر انیسؔ (۲۹) اب دیکھیں لحد کی رات کیونکر گزرے

آغوش لحد میں جب کہ سونا ہوگا جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا
تنہائی میں آہ کون ہووے گا انیسؔ (۳۰) ہم ہوویں گے اور قبر کا کونا ہوگا

مر مر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے رخ سب سے پھرا کے منہ دکھایا ہے تجھے
کیونکر نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر (۳۱) میں نے بھی تو جان دے کے پایا ہے تجھے

طفلی دیکھی شباب دیکھا ہم نے ہستی کو حباب آب دیکھا ہم نے
جب آنکھ ہوئی بند تو عقدہ یہ کھلا (۳۲) جو کچھ دیکھا سو خواب دیکھا ہم نے

کچھ عقل کی میزان میں تولا نہ گیا چپ ہو گئے اس طرح کہ بولا نہ گیا
عقدے سب حل ہوئے مگر آہ انیسؔ (۳۳) یہ بند اجل کسی سے کھولا نہ گیا

وہ موج حوادث کا تھپیڑا نہ رہا کشتی وہ ہوئی غرق وہ بیڑا نہ رہا
سارے جھگڑے تھے زندگانی تک انیسؔ (۳۴) جب ہم نہ رہے تو کچھ بکھیڑا نہ رہا

خاموشی میں یاں لذت گویائی ہے آنکھیں جو ہیں بند عین بینائی ہے
نہ دوست کا جھگڑا ہو نہ دشمن کا فساد (۳۵) مرقد بھی عجب گوشۂ تنہائی ہے

تمام شد